کنن پوش پورہ
دختران کشمیر کے مصائب
ہمت، استقامت و مزاحمت
بشیر سدوزئی

کنن پوش پورہ

(دختران کشمیر کے مصائب

ہمت، استقامت و مزاحمت)

بشیر سدوزئی

کنن پوش پورہ،

مصنف۔ بشیر سدوزئی

جملہ حقوق عوام کے لئے

نام کتاب	---	کنن پوش پورہ (دختران کشمیر کے مصائب ہمت، استقامت و مزاحمت)
کاوش	---	بشیر سدوزئی
موضوع	---	مقبوضہ کشمیر میں خواتین پر ہونے والے مظالم کی داستان
پہلی اشاعت	---	23فروری2025 واقعہ کی 34ویں سالگرہ، یوم مزاحمت خواتین جموں وکشمیر کے موقع پر شائع کی گئی
قیمت	---	800روپے
ناشر	---	فرید پبلیکیشنز، اردو بازار، کراچی

انتساب

مقبوضہ جموں و کشمیر کی

☆24 ہزار بیواؤں

☆18 ہزار، زبردستی اجتماعی جنسی زیادتی کا شکار

☆6 ہزار آدھی بیواؤں

☆ایک لاکھ 24 ہزار یتیم بچوں

اور

☆جیل میں قید آسیہ اندرابی اور

ان کی 33 ساتھیوں کے نام

جو جموں و کشمیر کی تحریک آزادی میں

ہمت، استقامت اور مزاحمت کا

استعارہ ہیں

''کنن پوش پورہ''

ن ش	فہرست مضامین	صفحہ
1	ابتدائیہ (اعتراف تعاون)	8
2	حصہ اول۔ مقبوضہ کشمیر میں عصمت دری جنگی ہتھیار	11
3	جنوبی ایشیا میں جنسی تشدد اور مجرم سزا سے مستثنیٰ	15
4	کشمیر میں انصاف ملنا مشکل ہے	28
5	'کنن پوش پورہ' اور کشمیر میں خواتین	36
6	کشمیر میں خواتین اور مزاحمت	39
7	دوسرا حصہ۔ کشمیر کی سچی کہانیاں، لاعلمی نعمت ہے	52
8	آرمی انکل	56
9	یتیم بیٹی	62
10	بڑی فوجی چھاؤنی	68
11	عام سی لڑکی اور خوف کا احساس	72
12	تیسرا حصہ۔ 'کنن پوش پورہ' کیس میں واقعات کی تاریخ وار ترتیب	76
13	چوتھا حصہ۔ 'کنن پوش پورہ' اجتماعی عصمت دری، کشمیر میں جنسی تشدد اور جرم سے استثنیٰ	86
14	'کنن پوش پورہ کہاں ہے؟	89

15	عصمت دری بطور انتقام	100
16	مردوں پر جنسی تشدد	108
17	استثنیٰ کا ماحول	111
18	پانچواں حصہ۔ 'کنن پوش پورہ' میں وہ رات	127
19	پولیس کی تحقیقات	132
20	محاصرے اور تلاشی	134
21	جڑواں دیہات پر فوج کا دھاوا	138
22	جسمانی اذیت اور جنسی تشدد کا نشانہ بننے والے مرد	140
23	متاثرہ/ زندہ بچ جانے والی خواتین	144
24	دُرّی کے دروازے پر دستک	150
25	کانسٹیبل عبدالغنی کی کہانی	153
26	اگلے دن	158
27	مزید تحقیقات	161
28	متاثرین/ زندہ بچ جانے والوں کا طبی معائنہ	166
29	پولیس ریکارڈ/ ثبوت	168
30	ملزمان کے ساتھ کیا ہوا؟	170
31	چھٹا حصہ۔ 'کنن پوش پورہ' میں بعد کی زندگی	175

32	کشمیر کے زندہ شہید	177
33	ذہنی اور جسمانی صحت	186
34	مزاحمت اور غیر متزلزل جذبہ	190
35	ساتواں حصہ۔ پوچھ گچھ اور استثنیٰ	192
36	ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین کی انکوائری	194
37	فوجی بریگیڈیئر کی رپورٹ	196
38	وجاہت حبیب اللہ کی رپورٹ	198
39	پریس کونسل آف انڈیا/ بی جی ورگیس کی رپورٹ	202
40	ریاست اور عدلیہ کا کردار	210
41	معاوضہ/ تلافی کی سیاست	213
42	آٹھواں حصہ۔ 'کنن پوش پورہ' یاد ہے	216
43	پراسرار ڈائری	219
44	کس قدر یاد رکھنے کی توقع رکھتے ہیں؟	226
45	سچ میں مبالغہ نہ کریں	235
46	یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا	239
47	نڈر عورت	244
48	ہم کچھ نہیں بھولے اور نہ بھولیں گے	249
49	مجھے انکاؤنٹر میں ہلاک کر دیں گے	254

50	نواں حصہ۔ ہندوستانی کشمیریوں کو بھول گئے	256
51	کپواڑہ کی طرف منتقلی	261
52	اس دوران...	263
53	بھارتی فوج کی جوابی کارروائی	265
54	پولیس کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ	271
55	دوسری پٹیشن اور کچھ معمولی فتوحات	274
56	انصاف کو سبوتاژ کرنا	277
57	ایک اور آغاز کی طرف شروعات	278
58	دسواں حصہ۔ کچھ خاص خاص	283
59	کشمیر بنے گا پاکستان	288
60	گیارہواں حصہ۔ ضمیمہ جات (Annexures)، رپورٹس	291
292	بارہواں حصہ۔ کشمیر کی داستان الم	310
293	منیزا کا گھر کیسے اجڑا؟	311
294	گڑیا کھیلتی آصفہ بانو سے درندگی	322
295	زجاجہ شیخ کو شناخت کی تلاش	328
296	کشمیریوں کی ناقص حکمت عملی	333

کنن پوش پورہ، مصنف۔ بشیر سدروزوی

ابتدائیہ
اعتراف تعاون
(Acknowledgment)

یہ کتاب ''کنن پوش پورہ'' کی دختران کشمیر کے مصائب، ہمت، استقامت و مزاحمت'' اور مجموعی طور پر مقبوضہ جموں و کشمیر میں خواتین پر ریاستی جبر اور انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزیوں کا منہ بولتا ثبوت ہے۔ 'کنن پوش پورہ' مقبوضہ جموں و کشمیر کے سرحدی ضلع کپواڑہ کے دو گاؤں ہیں جہاں کے لوگوں خصوصاً خواتین کی 24 سالہ انتھک اور متاثر کن جدوجہد کی وجہ سے ان کے نام کی گئی ہے۔ ان خواتین کی ہمت، استقامت، مزاحمت و حوصلے اور عزم کی کہانی سنانا میرے لئے اعزاز کی بات ہے کہ ان سے ہزاروں کلومیٹر دور رہ کر بھی ہم ان کے دکھ درد میں شریک اور باخبر ہیں۔ ایسا مقبوضہ جموں و کشمیر کے عوام کے ساتھ لامتناہی تعلق اور دلی محبت کے بغیر ممکن نہیں ہو سکتا جو خوش قسمتی سے ہمیں حاصل ہے۔ وہاں کی عوام کے ساتھ یہ تعلق اور مقبوضہ جموں و کشمیر کی آزادی سے لگن مرحوم کے ایچ خورشید کی دی ہوئی ہے جن کی سرپرستی میں ہم نے یہ کام ایام جوانی بلکہ نوجوانی میں شروع کیا تھا اور ابھی تک اسی مقام پر کھڑے ہیں، اگر دو قدم آگے نہیں گئے تو پیچھے بھی نہیں ہٹے۔ مجھے اس بات کا ادراک ہے کہ وطن کی آزادی کے لئے میں عملی میدان میں لڑ نہیں سکا لیکن ظلم و ستم پر کبھی خاموش بھی نہیں رہا، چیختا چلاتا رہا، لکھتا بولتا رہا، شاید ایک کمزور اور بزدل انسان اپنے مقصد کو پانے کے لئے اس سے زیادہ کچھ کر بھی نہیں سکتا۔ خیر! اب تو عمر کے اس حصے میں داخل ہو چکا کہ بڑے انقلاب کی کیا توقع کرنی۔ میں ان لوگوں کا شکریہ ادا کرتا

ہوں جن کے توسط سے ملنے والی معلومات، مشکل اور بھولی ہوئی یادوں کو تازہ رکھنے کے لئے یہاں پیش کی گئیں۔ میں ان لوگوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں جنہوں نے ہمیں دستاویزات فراہم کیں، نقشوں، تصویروں اور ترجموں تک رسائی میں مدد کی۔ سری نگر کے ایڈوکیٹ پرویز امروز، انسانی حقوق کے عالمی تسلیم شدہ کارکن (جواب جیل میں ہیں) خرم پرویز، ایڈوکیٹ، کارتک مروکٹلاا اور پوری جموں وکشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی کی ٹیم کا خصوصی شکریہ جن کی کوششوں اور کاوشوں پر مبنی معلومات بین الاقوامی، ہندوستانی اور جموں وکشمیر کے میڈیا اور سوشل میڈیا کے توسط سے ہمارے پاس پہنچی جو اس کتاب کی قدر و قیمت میں اضافہ کرنے کا سبب بنی۔

اس کتاب کو حقیقت کا روپ دینے میں مسلسل ہمارے ساتھ رہنے اور ہماری مدد کرنے کے لئے اقبال عزیز کا شکریہ، ہماری مدد کرنے کے لئے اضافی کوشش اور وقت لگانے اور ہر وقت ہمارے حوصلے کو بڑھانے کے لئے، کراچی کے احباب کا بھی شکریہ جنہوں نے اس کتاب کو ممکن بنانے میں مدد کی۔ یہ کتاب 'کنن پوش پورہ' کے لوگوں کے ساتھ اظہار یکجہتی ہے، ان کی کہانیوں کو بیان کرنے میں ان کی رضامندی اور سری نگر کی پانچ خواتین کی بہادری کا نتیجہ ہے، انہوں نے ہی یہ حوصلہ کیا کہ 'کنن پوش پورہ' کے مقدمہ کو 21 سال بعد دوبارہ زندہ کیا تاکہ دنیا کو 23 اور 24 فروری 1991ء کی درمیانی رات کی سچائی کا پتہ چل سکے۔

" کنن پوش پورہ" کی عورتوں اور مردوں کی ہمت، اس رات کا اذیت ناک کرب دوبارہ برداشت کرنے پر ان کی آمادگی نے ہی اس کربناک حقیقت کو ساری دنیا اور خاص طور پر پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام تک پہنچایا۔ یہ کتاب مکمل نہ ہوتی اگر اس کے لئے سری نگر کی پانچ نوجوان خواتین کی کاوش "Do You Remember Kanan Poshpora" سے تعاون نہ ملا ہوتا جس کو پڑھنے کے بعد ہمیں نہ صرف بہت معلومات

ملیں بلکہ پہلے کی جمع معلومات کی سچائی کی تصدیق بھی ہوئی اور اس کتاب کو شائع کرنے کا حوصلہ ملا۔

احمر بشیر خان کا بھی شکریہ جنہوں نے "Do you Remember Kunan Poshpora" امریکہ سے کینیڈا منگوائی اور پھر اسے وہاں سے کراچی تک پہنچانے کا انتظام کیا۔ نہ معلوم کیوں اس کتاب پر پاکستان میں غیر اعلانیہ پابندی ہے حالانکہ کشمیر لبریشن سیل کو اس کتاب کو عام کرنا چاہیئے تاکہ بھارت کا مکروہ چہرہ دنیا کے سامنے بے نقاب ہو۔ جموں وکشمیر کے عوام سے محبت رکھنے والوں سے درخواست ہے کہ اس کتاب کو عام کرنے میں تعاون کریں۔ میں یہ نہیں کہتا کہ اس کتاب کو لوگ زیادہ سے زیادہ خریدیں بلکہ اس کو زیادہ سے زیادہ پڑھنے کی ترغیب دیں اور خود پڑھنے کے بعد دوسروں تک پہنچائیں، اس میں سے منتخب تحریریں اور اقتباس عوام تک پہنچائیں تاکہ 'کنن پوش پورہ' کے عوام اور مقبوضہ کشمیر کی خواتین کے ساتھ یکجہتی کا اظہار ہو سکے۔

☆☆☆

پہلا حصہ

مقبوضہ کشمیر میں عصمت دری جنگی ہتھیار

عصمت دری کو دنیا بھر میں نسل کشی اور انسانیت کے خلاف ایک بڑے جرم کے طور پر تسلیم کیا جا چکا جو قابل سزا جرم ہے مگر جنوبی ایشیا کے پانچ ممالک، بنگلہ دیش، بھارت، نیپال، پاکستان اور سری لنکا میں ابھی تک ان جرائم پر پردہ ڈالا جا رہا ہے اور خاص طور پر معاشرتی امتیاز اور بعض اوقات ریاستی پالیسیوں کے تحت جنسی استحصال کے مجرموں کو قابل سزا نہیں سمجھا جاتا بلکہ ان ملکوں میں اس سے بھی آگے، جنسی تشدد، زنا بالجبر، اجتماعی عصمت دری اور دیگر جرائم میں ملوث عسکری اداروں کے اہلکاروں کو ریاستی تحفظ میں سزاؤں سے استثنیٰ مل جاتا ہے۔ خاص طور پر اگر کسی شورش کو کچلنے کا بہانہ ہو تو عسکری اداروں کو ایسے خصوصی اختیارات دیے جاتے ہیں کہ ان کے اہلکار عصمت دری، جنسی تشدد یا اجتماعی عصمت دری کو جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال کرتے ہیں جن کو ریاست اپنے تئیں جائز قرار دیتی ہے اور ایسے مجرموں کے خلاف مقدمہ بھی درج نہیں ہوتا۔

تیسری دنیا کے ان پسماندہ ممالک میں انسانی حقوق کی ان بدترین خلاف ورزیوں پر جن کو یہاں کی حکومتوں کی غیر اعلانیہ حمایت حاصل ہوتی ہے، دنیا میں انسانی حقوق کے ادارے بھی کوئی احتجاج یا کارروائی نہیں کرتے جس طرح یورپ امریکہ، کینیڈا یا دیگر جمہوری معاشروں میں ہوتا ہے، حتیٰ کہ اقوام متحدہ بھی خاموش تماشائی بنی رہتی ہے۔ خاص طور پر ایسے علاقوں میں جہاں کے عوام بنیادی انسانی حقوق، آزادی اور جمہوریت کا مطالبہ کرتے ہیں وہاں کے عوام پر دنیا میں تسلیم شدہ انسانی حقوق کی سرعام خلاف ورزی کی

کنن پوش پورہ،
مصنف۔ بشیر سدوزئی

جاتی ہے اور شورش کو کچلنے کے نام پر انتہائی ظالمانہ اقدامات کیے جاتے ہیں جو جدید دنیا میں ممنوع قرار پائے اور جن کے لیے دنیا نے پابندی کے چارٹر پر دستخط کئے ہوئے ہیں، اس دستاویز پر ان ممالک کے بھی دستخط ہیں لیکن ان ممالک کی حکومتیں اپنے ہی کیے ہوئے دستخط سے روگردانی کر کے بچوں اور عورتوں پر بھی ناگفتہ بہ مظالم ڈھاتی ہیں جن کی جدید دنیا میں دوسری جگہ کوئی مثال نہیں ملتی۔

کشمیر میں یہ صورتحال زیادہ گھمبیر ہے جہاں کے عوام بین الاقوامی طور پر اپنا تسلیم شدہ حق مانگ رہے ہیں مگر اپنے حق کیلئے آواز اٹھانے کے جرم کی پاداش میں ان کو لاشیں تو ملتی ہیں لیکن اس کے ساتھ ساتھ گھروں میں گھس کر خواتین کی اجتماعی آبروریزی کرنا، بچوں کی آنکھیں ضائع کرنا اور بزرگوں، ضعیفوں اور بیماروں تک کو اذیت دینا روز کا معمول بن چکا ہے۔

ریاستی چھتری کے سائے میں عصمت دری اور سزا سے استثنیٰ، بھارت کے زیر قبضہ مقبوضہ کشمیر میں یہ جرم عام ہے جبکہ متاثرین کی کوئی شنوائی نہیں ہوتی کیونکہ ریاست نے فوجیوں کو یہ اختیار دے رکھا ہے کہ جو اقدام فوج کا وہی قانون ریاست کا۔ لہٰذا ان اختیارات کے ساتھ پولیس اور دیگر سرکاری اہلکاروں کے علاوہ 12 لاکھ سے زائد مسلح فوجی مقبوضہ کشمیر کے شہروں اور قصبوں میں دندناتے پھرتے ہیں اور گھروں میں گھس کر لوٹ مار کے علاوہ اجتماعی عصمت دری جیسے گھناؤنے جرائم کے مرتکب ہوتے ہیں جن کو ریاستی تحفظ حاصل ہے۔ ایسے درجنوں نہیں بلکہ سینکڑوں واقعات رپورٹ ہوئے ہیں جہاں فوجی گھروں میں داخل ہوئے، مردوں کو پکڑ کر لے گئے جن کا ابھی تک پتہ نہیں چلا کہ زندہ ہیں یا مردہ، 8 ہزار سے زائد خواتین آج بھی مقبوضہ کشمیر کے مختلف علاقوں میں اپنے ان شوہروں کی واپسی کے انتظار میں بیٹھی ہیں جن کو بھارتی فوجی ان کے سامنے اٹھا کر لے گئے اور وہ پھر کبھی واپس نہیں آئے۔ ایک لاکھ 23 ہزار بچے یتیم ہو گئے جبکہ 24 ہزار خواتین بیوہ ہو

چکیں۔13 ہزار خواتین کی اجتماعی عصمت دری ہوئی۔33 خواتین تہاڑ جیل سمیت ملک کے دور دراز علاقوں کی جیلوں میں قید ہیں جب کہ چھ ہزار سے زائد سیاسی قائدین اور کارکنان اذیت خانوں میں بند ہیں۔اس سارے ظلم وستم پر بین الاقوامی سطح پر کوئی ایسی مضبوط آواز نہیں اٹھائی گئی جس سے بھارت پر اخلاقی وقانونی اور سفارتی وسیاسی دباؤ پڑتا حتیٰ کہ پاکستان نے بھی اپنی ذمہ داری پوری نہیں کی کہ بین الاقوامی سطح پر مضبوط سفارت کاری سے ان مظالم کو دنیا کے سامنے اٹھایا ہو۔یہ انسانی حقوق کی بدترین خلاف ورزیاں ہیں لیکن بھارت کے خلاف دنیا میں توانا آواز نہیں بلند ہوئی۔پرویز مشرف دور سے لے کر شہباز شریف کی حکومت تک ریاست پاکستان تو در پردہ مسئلہ کشمیر سے دستبردار ہی ہو چکی ۔کشمیر کی تحریک آزادی کا نمائندہ سیاسی ادارہ، آل پارٹیز حریت کانفرنس بھی مفلوج ہو چکا اور بین الاقوامی سطح پر کشمیریوں کی نمائندہ آواز نہیں بن سکا اور نہ ہی بیرونی ممالک میں مقیم کشمیری کوئی کردار ادا کر سکے ہیں سوائے ذاتی نمود ونمائش کے۔فاروق صدیقی (فاروق پاپا) گلوبل کشمیر کونسل کے پلیٹ فارم پر آل پارٹیز کانفرنس منعقد کرنا چاہتے ہیں جب کہ دیگر لوگ بھی اپنے طور پر کوشش کر رہے ہیں لیکن یہ سب انفرادی کوشش کے زمرے میں آتی ہیں ۔جب تک بین الاقوامی سطح پر ایک قیادت ایک تنظیم نہیں ہوگی دنیا کو قائل کرنا مشکل ہے۔

''کنن پوش پورہ'' کا واقعہ ایسا تھا کہ حریت کانفرنس یا کشمیریوں کے کسی گروپ کو لابنگ کر کے اسے بین الاقوامی عدالت انصاف میں لے جانا چاہیے تھا مگر اس پر بھی خاموشی رہی تو بالآخر وہاں کے متاثرین طاقت وریاست کے سامنے کھڑے نہ ہو سکے اور انہیں تھک کر خاموش ہونا پڑا۔جن لوگوں نے سچ بولنے کی کوشش کی ان کو خاموش کرا دیا گیا اور فوجی طاقت غالب آئی۔یہ واقعہ 22 اور 23 فروری 1991ء کی درمیانی رات کو پیش آیا تھا۔یہ افسوس ناک واقعہ فائل میں بند ہو چکا اور اس پر دھول جم چکی تھی تو لگ بھگ 21 برس بعد اس وقت دوبارہ زندہ ہوا جب انٹرنیشنل ڈیویلپمنٹ ریسرچ سینٹر (IDRC) کینیڈا

نے جنوبی ایشیا میں جنسی تشدد اور سزا سے استثنیٰ کے نام سے تین سالہ تحقیقی منصوبہ شروع کیا۔

ماہرین کے ایک گروپ نے جنوبی ایشیا کے ان پانچ ممالک سے ذیلی گروپ یا مشیروں کو اپنے ساتھ ملایا اور ورکشاپس، مباحثوں، کانفرنسز، انٹرویوز اور تحقیقی مقالوں کے ذریعے یہ معلوم کرنے کی کوشش کی گئی کہ جنسی تشدد کے پھیلاؤ اور ان پانچوں ممالک میں اس جرم کے مجرموں کو استثنیٰ کیوں دیا جاتا ہے۔2013ء میں جموں وکشمیر کی پانچ نوجوان خواتین ایثار بتول، افراح بٹ، ثمرینہ مشتاق، منزہ راشد اور نتاشہ راٹھر IDRC کے گروپ کے ساتھ جڑیں اور مقبوضہ کشمیر میں جنسی تشدد اور سزا سے استثنیٰ کے حوالے سے کی جانے والی تحقیق میں شامل ہوئیں۔گو کہ یہ نوجوان خواتین اس وقت پیدا بھی نہیں ہوئی ہوں گی جب کنن پوش پورہ کا واقعہ پیش آیا کیونکہ ان سب کی عمر 20، 21 سال سے کم ہی تھی مگر انہوں نے کتنا اہم کام کیا، اسے آپ آگے اس کتاب میں ملاحظہ کر سکیں گے۔قوم ایسی بیٹیوں پر فخر کرتی ہے کہ ایک مردہ مسئلے کو کم از کم تاریخ اور ادب میں زندہ کر دیا۔ان کی مرتب کردہ کتاب Do you Remember Kunan Poshpora نے اس خوف ناک جرم کو رہتی دنیا تک زندہ کر دیا۔

جنوبی ایشیا میں جنسی تشدد اور مجرم سزا سے مستثنیٰ

IDRC نے مندرجہ بالا تین سالہ تحقیق کا آغاز کچھ اہم سوالات اور خدشات کے ساتھ 2013 میں کیا تاہم اس کے دوران مشاہدہ کیا گیا کہ جنوبی ایشیا کی حالیہ تاریخ اور عسکری سیاسی پیشرفت کے دوران جنسی تشدد بالخصوص اجتماعی تشدد اور عصمت دری میں غیر معمولی اضافہ دیکھا گیا اور اس کے باوجود پورے خطے میں اس طرح کے تشدد میں نمایاں اضافہ ہونے کے ساتھ ساتھ اردگرد گہری خاموشی چھائی رہی۔ مقبوضہ کشمیر کو اس کی خاص مثال کے طور پر پیش کیا جا سکتا ہے جہاں عصمت دری کو ریاست نے بطور جنگی ہتھیار پالیسی اپنایا ہوا ہے۔

مثال کے طور پر، مئی 2009 میں سری لنکا میں 25 سال سے جاری پرتشدد تنازعہ کے خاتمے کے نتیجے میں جنسی تشدد کے جنگی ہتھیار کے طور پر استعمال ہونے پر کھلے عام بحث کیوں نہیں کی گئی؟ یہ خاموشی جرائم پر پردہ پوشی ظاہر کرتی ہے، کیا وجہ ہے کہ ذات پات کی بنیاد پر تشدد، سیکس ورکرز اور مردوں اور خواجہ سراؤں پر تشدد کے بارے میں بمشکل ہی بات کی جاتی ہے؟

یہاں صرف خاموشی ہی مسئلہ نہیں تھی بلکہ اس خاموشی کو برقرار رکھنے کی وجہ زیادہ اہم تھی اور آج بھی ہے اور وہ ہے مجرموں کو معافی فراہم کرنے میں ریاستوں کی فعال ملی بھگت جس کے لئے بعض اوقات حفاظتی قوانین اور مسلح افواج کو خصوصی اختیارات کی آڑ جیسا کہ مقبوضہ کشمیر میں ہے اور کہیں اور قوم پرستی کا پردہ کارفرما نظر آیا۔ عورتوں کی مشکلات اتنی زیادہ بڑھیں کہ اب بھی نہایت کم خواتین زبان کھولنے کی جرات کر سکی ہیں،

ثقافتی مجبوری اور ریاست کی طرف سے تہذیبی روایت کو تقویت دینے کے ساتھ ساتھ غیر ریاستی عناصر کی فعال ملی بھگت نے ایسے گھناؤنے جرائم پر سزا سے معافی کو بدستور بڑی حد تک چیلنج سے بچائے رکھا۔ ''کنن پوش پورہ'' میں بھی مظلوموں کو ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا۔

یہ صورتحال صرف جنوبی ایشیائی خطے اور خاص طور پر مقبوضہ جموں وکشمیر ہی کے لئے مخصوص ہے کیوں کہ دنیا کے مختلف حصوں میں باقی جگہوں پر، عصمت دری کے معاملے پر گفت وشنید میں تیزی آ رہی ہے اور اسے نہ صرف ایک جنگی ہتھیار بلکہ انسانیت کے خلاف ایک جرم اور نسل کشی کے آلے کے طور پر تسلیم کیا جا رہا ہے جسے استعمال کرنے پر سختی سے پابندی ہے، روانڈا کیلئے انٹرنیشنل کریمنل ٹریبونل (ICTR) کا 1998 کا ایک فیصلہ عصمت دری کی واضح تعریف کرتا ہے اور اسے انسانیت کے خلاف جرم اور نسل کشی کے آلے کے طور پر پیش کرتا ہے۔ سابقہ یوگوسلاویہ کے لیے بین الاقوامی فوجداری ٹریبونل (ICTY) میں پیش کئے گئے اصول قانون نے اس نقطہ نظر کو آگے بڑھایا جس کے تحت دیگر بین الاقوامی جرائم جیسے کہ تشدد، غلامی، اور ایذا رسانی کے عناصر کو عصمت دری اور جنسی تشدد کی دوسری شکلوں کے طور پر شامل کیا گیا ہے اور جن پر صنفی تشدد کے تناظر میں پہلے قانونی چارہ جوئی نہیں کی گئی تھی۔

خصوصی عدالت برائے سیرالیون (SCSL) نے بین الاقوامی انسانی قانون کی خلاف ورزیوں کو دائرہ قانون میں لاتے ہوئے جنسی تشدد کی ایک خاص شکل، جبری شادیوں کی نشاندہی کی جو سیرالیون میں جاری تنازعات کا نتیجہ ہے چناں چہ عدالت نے جبری شادی کو جنسی غلامی یا جنسی جرائم سے الگ کرتے ہوئے انسانیت کے خلاف جرم قرار دیا۔ آئی سی ٹی آر، آئی سی ٹی وائی اور ایس سی ایس ایل کے تحت جنسی اور صنفی بنیاد پر تشدد کے کیس کے حوالے سے ہونے والی پیش رفت کی بنیاد پر، بین الاقوامی فوجداری عدالت

(آئی سی سی) روم عصمت دری اور جنسی تشدد کی مختلف شکلوں کو نسل کشی، انسانیت کے خلاف جرائم اور جنگی جرائم کے حصے کے طور پر شامل کرتی ہے اور خاص طور پر عصمت دری، جبری جسم فروشی، جنسی غلامی، جبری حمل، جبری نس بندی اور جنس کی بنیاد پر قانونی چارہ جوئی کو قانون کے تحت قابل سزا جرائم شمار کرتی ہے۔

لیکن کشمیر میں اس کا اطلاق نہ ہونے اور جنسی تشدد کے باوجود دنیا کے یہ ادارے اور عدالتیں خاموش ہیں، ممکن ہے ان کے پاس یہ مقدمات رپورٹ ہی نہ ہوئے ہوں جن کو رپورٹ کرنے کی ذمہ داری پاکستان اور کشمیریوں کی تھی۔ کشمیر کی ان پانچ نوجوان بیٹیوں نے ہمت کی تو یہ رپورٹ مرتب ہوگئی ورنہ کشمیر کی مظلوم خواتین پر ہونے والے مظالم کی تو داستان بھی نہ رہی تھی داستانوں میں۔ البتہ ان آزمائشوں کے دوران پیدا ہونے والی ترقی پسند سوچ جنسی تشدد کو بین الاقوامی قانون سازی کے مرکزی دھارے میں لے آئی جو 1990 کے عشرے تک بڑی حد تک نظروں سے اوجھل تھا اور یہ اس طرح ہوا کہ گویا اجتماعی علم کا حصہ بن گیا جسے عام کرنے میں دنیا بھر میں خواتین تحریکوں نے بہت بڑا حصہ لیا۔

جنوبی ایشیا میں، جنسی تشدد سے متعلق رائج قانونی علم کا ایک جامع اور تنقیدی تجزیہ اسکالرشپ کا ایک نیا ابھرتا ہوا شعبہ ہے مگر اس میدان میں عملی طور پر ایک ٹھوس کمیونٹی کا ابھرنا ابھی باقی ہے۔ جیسا کہ جموں وکشمیر کے وہ عوام جو ریاست سے باہر ہیں بطور کمیونٹی ایک پلیٹ فارم پر کام نہیں کر رہے۔ جنسی تشدد کی بہت سی جہتیں ہیں جن کا دائرہ کار جنسی تشدد کی تعریفوں کے بارے میں تصوراتی وضاحت سے لے کر قانونی، طبی ثبوت اکٹھا کرنے اور ناکافی تلاش کئے گئے ثبوت کے متعلق فرانزک تفہیم اور اس سلسلے میں مزید بہت کچھ کرنے تک پھیلا ہوا ہے۔

اس حوالے سے جنوبی ایشیا کے لئے دوسری جگہوں پر ہونے والی پیشرفت سے سیکھنے کے وسیع مواقع موجود ہیں لیکن جموں وکشمیر میں تو یہ جرائم مردوں کی طرف سے حق

خودارادیت مانگنے کی پاداش میں عورتوں کے خلاف بطور سزا کئے جا رہے ہیں جن کو بھارتی ریاست کی ممکنہ حمایت حاصل ہے اور ریاست کا طاقت ور اور اعلیٰ سطح کا ادارہ جس کی ذمہ داری عوام کا تحفظ ہے یعنی آرمی کے اہلکار کر رہے ہیں جو اس کو بطور جنگی ہتھیار استعمال کرتے ہیں۔ وہاں خواتین پر فوجیوں کے بڑے پیمانے پر، سوچے سمجھے حملے اور ان کے جسمانی تحفظ کے حق کی منظّم خلاف ورزی کے سوال کو حل کیے بغیر امن کی طرف 'واپسی' کی توقع کیسے کر سکتے ہیں؟ اور ہمیں ایسے امن کی تشکیل پر سوال اٹھانے کی ضرورت ہے، اسی طرح عصمت دری اور جنسی تشدد کو انسانیت کے خلاف جرائم کی تعریف میں شامل کیے بغیر اس سوال کو کیسے حل کیا جا سکتا ہے؟ اس کے متعلق بھارت کے ملکی قوانین اور پالیسیوں کی مجرمانہ خاموشی کیا ہے؟ ذات پات، نسل اور مذہب کی وجہ سے ہونے والے مقامی جنسی تشدد اور عصمت دری کے بارے میں ان کا کیا کہنا ہے؟ ہم کس طرح تخلیقی طور پر تلافی کے سوالات کے بارے میں سوچ سکتے ہیں کہ بھارت نے بحالی کیمپوں میں کشمیری خواتین کو لا کر ڈال دیا جہاں وہ بدنامی کا شکار اور عصمت دری کا نشانہ بن کر دوسروں سے الگ رہنے والی عورتوں کی حیثیت سے رہتی ہیں، جیسا کہ ہم کنن پوش پورہ کی مثال دے سکتے ہیں۔

انسانی حقوق کے کارکن اور طالب علم کے طور پر ہم بڑھتے ہوئے تشدد اور ریاستوں اور حکومتوں کی جانب سے جوابدہی کی سنگین اور مسلسل کمی، مجرموں کو حاصل ہونے والی استثنیٰ کو دور کرنے میں ناکامی، اس سلسلے میں ایک موثر میکانزم کی عدم موجودگی اور متاثرین، زندہ بچ جانے والوں، اور ان کے خاندانوں اور برادریوں کو پہنچنے والے زبردست ذہنی وجسمانی کرب کے ازالے کے حوالے سے پائی جانے والی بے حسی کے بارے میں فکرمند ہیں اور رہیں گے۔ ہم محسوس کرتے ہیں کہ اس طرح کے تشدد کے گہرے اثرات سے نمٹنے کے لیے ہماری اجتماعی نااہلی اور عدم دلچسپی ہمارے خطے میں امن اور انصاف کی راہ میں ایک سنگین رکاوٹ ہے۔ خاص طور پر پاکستان کے عوام کی اس حوالے

سے ناقص معلومات اور پاکستان کے حکمرانوں اور سیاست دانوں کی عدم دلچسپی کشمیر کے نوجوانوں کو پاکستان کی ریاست سے متنفر کررہی ہے جو کشمیر کی سیاسی قیادت کو پہلے ہی مسترد کر چکے چاہے وہ آزاد کشمیر کی ہو یا مقبوضہ کشمیر کی۔

مذکورہ ضمن میں انٹرنیشنل ڈویلپمنٹ ریسرچ سینٹر (IDRC) کینیڈا اور مقامی مشیران کے گروپ کے درمیان باہمی گفت وشنید کا آغاز جنوری 2012 میں ہوا جب جنوبی ایشیا سے تعلق رکھنے والی خواتین کا ایک گروپ ایک مختصر IDRC گرانٹ کے طفیل ان مسائل کے متعلق غور وفکر کا عمل شروع کرنے کی نیت سے ایک میٹنگ میں اکٹھا ہوا۔ گروپ نہ صرف جنسی تشدد اور استثنیٰ کے سوال کے اردگرد قانونی خاموشی پر فکر مند تھا، بلکہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ جنسی تشدد کو ایک معمول کے طور پر دیکھنے اور اس کے مرتکب لوگوں کو معافی دینے کی سوچ نے ہمارے معاشروں میں کتنی گہری جڑیں پکڑ لی ہیں اور کشمیر میں جو عورتوں پر مظالم ہورہے ہیں دنیا اس پر چپ سادھی ہوئی ہے۔

یہ بات واضح ہوگئی کہ پورے جنوبی ایشیا میں خواتین تحریکوں نے جنسی تشدد اور استثنیٰ کے مسئلے پر عوام کی توجہ مبذول کرانے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اور اس کے باوجود، جیسا کہ ہم نے پہلے اشارہ کیا، اس حوالے سے معلومات کا فقدان ہے تاہم اس موضوع پر مناسب لٹریچر کی عدم موجودگی کا مطلب یہ نہیں کہ کچھ بھی دستیاب نہیں تھا۔ جنوبی ایشیا ایک بھرپور ادبی اور علمی روایت کا حامل خطہ ہے اور واقعی یہاں جنسی تشدد پر کافی مقدار میں تحریریں موجود ہیں، گو کہ ان تحریروں میں جنسی جرائم سے معافی پر براہ راست بات نہیں کی گئی تاہم بیشتر جگہوں پر اس بارے میں تشویش پائی جاتی ہے۔ تحقیق کے دوران محسوس کیا گیا کہ استثنیٰ یعنی جرم سے معافی کی نوعیت کو منظم طریقے سے سمجھنا ضروری ہے۔ ساتھ ہی اس کا ادراک بھی کرنا ہوگا کہ ریاستیں کون سے ان قانونی، سماجی اور ثقافتی اصولوں پر عمل کرتی ہیں جن سے مجرموں کیلئے استثنیٰ کی اجازت دی جاسکے اور جوابدہی کیلئے اٹھنے والی آوازوں کو بند

کردیا جائے۔ ان غیر معروف طریقوں کو دستاویزی طور پر اکھٹا کرنا ضروری ہے جن میں خواتین، اور بعض اوقات کمیونٹیز، جنسی تشدد کی وجہ سے ہونے والے صدمے اور نقل مکانی سے نمٹنے کے لیے انتظامات کرتی ہیں۔ یہ کہانیاں بڑی حد تک نامعلوم تھیں۔ مثال کے طور پر ہندوستان میں ذات پات اور پاکستان میں جاگیردارانہ سوچ کے زیادہ تر تشدد میں، یا جاگیردارانہ یا قبائلی واقعات میں بدلہ اور سزا کے قانون کے تحت خواتین کے ساتھ جبر و زبردستی مردانہ برتری قائم کرنے کا ایک قبول شدہ طریقہ ہے۔ اور چوں کہ ذات پات اور قبیلے کی یہ درجہ بندی ہماری سیکولر، جدید ریاستوں کے ذہنوں میں بھی اس قدر سرایت کرچکی ہے لہٰذا متاثرین/ بچنے والے اکثر اپنے طور پر حل تلاش کرتے ہوئے انصاف کے کسی حد تک احساس کو یقینی بناتے ہیں۔

دسمبر 2012ء میں دہلی میں ایک نوجوان طالبہ کی اجتماعی عصمت دری اور اس واقعے میں اس کی موت نے بڑے پیمانے پر عوامی غصے کو جنم دیا اور عوامی بحث اور حقوق نسواں کی مداخلت کے لئے راہ ہموار کی۔ 16 دسمبر 2012 کو جنوبی دلی میں میڈیکل کی 23 سالہ طالبہ کے ساتھ اجتماعی زیادتی کا پرتشدد واقعہ اس وقت پیش آیا جب وہ رات کو اپنے مرد ساتھی کے ہمراہ فلم دیکھنے کے بعد گھر جانے کے لیے بس میں سوار ہوئی جہاں پہلے سے موجود ڈرائیور کے چھ ساتھیوں نے لڑکی کو دبوچ لیا۔ چلتی بس میں اجتماعی عصمت دری کی گئی۔ ان دونوں لڑکی اور اس کے ساتھی مرد کو لوہے کی سلاخ سے شدید مارا اور چلتی بس سے برہنہ حالت میں سڑک پر پھینک کر فرار ہوگئے۔ رپورٹ میں کہا گیا تھا کہ اس سال دلی میں خواتین کے ساتھ جبری زیادتی کے 600 واقعات رپورٹ ہوئے تھے۔ لڑکی تو تشدد کے باعث ہلاک ہوگئی تاہم اس واقعے نے دنیا بھر میں ان مظاہروں کے دوران بھارت کے سیکولر اور جمہوری چہرے سے نقاب اتار دیا خود بھارت میں شدید مظاہرے ہوئے۔ سو سے زیادہ زخمی اور ایک ہلاک ہوا، حکومتی سطح پر نئے قوانین بنانے کی ضرورت پر زور دیا گیا

اور انسانی حقوق کے ادارے متحرک ہوئے۔ خواتین کے خلاف جنسی زیادتی کے فوجداری قانون میں ترمیم کی سفارش کرنے کے لیے قائم کی گئی جسٹس ورما کمیٹی کے سامنے حقوق نسواں کی کارکنوں کی گواہیاں ہندوستان میں خواتین تحریک کی کئی عشروں پر محیط شدید جدوجہد کا نتیجہ تھیں۔

اس موقع نے ان سوالات پر گہرے غور وفکر کا ایک لمحہ فراہم کیا جن سے کارکن پہلے ہی سے دوچار تھے۔ اس سے تحریک کے اندر ایک سنگین سوال بھی پیدا ہوا: مثال کے طور پر، ذات پات کی بنیاد پر عصمت دری، یا فوج کی طرف سے ''کنن پوش پورہ'' میں اجتماعی عصمت دری، 16 دسمبر 2012ء کے واقعے جیسا غصہ یا غضب کا وہی دھماکہ کیوں برپا نہ کرسکی؟ ورما کمیٹی کے ساتھ کھلی بحث میں، حقوق نسواں کے کارکنوں کی شہادتیں قانون میں ترامیم تک ہی محدود نہیں رہیں بلکہ انہوں نے خواتین کے خلاف تشدد کے تسلسل کو گھر سے لے کر برادریوں اور سرحدوں تک پیش کرتے ہوئے ایک قابل ذکر سمجھ بوجھ کا مظاہرہ کیا، جہاں سرحدوں کے تحفظ کے نام پر خواتین کی حفاظت اور جسمانی تحفظ کو خطرات لاحق تھے۔ تاہم جموں وکشمیر کی خواتین اس کے باوجود اس حق سے محرم ہی رہیں اور اب تک محروم ہیں اور اس کو مقدر سمجھ کر خاموش ہیں لیکن ان میں سے کچھ نے جدوجہد کو جاری رکھا۔

استثنیٰ کو چیلنج کرنے کی سمت اٹھائے گئے ایک چھوٹے لیکن اہم قدم کے طور پر، 6 ستمبر 2015ء کو، ایک آرمی کورٹ مارشل نے اپنے چھ اہلکاروں کو عمر قید کی سزا سنائی جو اپریل 2010ء کے ''جعلی مقابلہ کیس'' میں قصوروار پائے گئے جس میں فوج نے ضلع کپواڑہ کے ماچھل سیکٹر میں تین نوجوانوں کو اس بنیاد پر ہلاک کردیا تھا کہ وہ غیر ملکی عسکریت پسند تھے۔ گوکہ ملزمان پر سول عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا گیا تھا، اور اپیل کا عمل جاری ہے پھر بھی یہ سزا اہمیت رکھتی ہے کیونکہ یہ پہلا موقع ہے جب کشمیر میں فوجی اہلکاروں کو ان الزامات پر عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے۔

بلاشبہ جنوبی ایشیا میں احتساب ایک پیچیدہ مسئلہ ہے خاص طور پر جب بات جنگی جرائم کی ہو اور ان جرائم میں فوج بطور ادارہ ملوث ہو، ان سارے جرائم پر پردہ ڈالنے کے لئے فوج کے پاس ایک ہی ہتھیار ہے کہ وہ متاثرین کو ملک دشمن، غدار جیسے القاب سے نوازیں۔ اس کے بعد بڑے سے بڑے جرائم میں استثنیٰ مل جاتا ہے لیکن اس کے باوجود کچھ نہ کچھ ایسے اقدامات ہوتے رہتے ہیں جن سے وہاں کے عوام کو کچھ تسلی اور تشفی ہوتی ہے۔ اس کی وجہ عوامی سطح پر سماجی ادارے اور اور عوام احتجاج کرتے ہیں اور حکومتیں کسی حد تک ان مظاہرین کی بات سننے کے لیے مجبور یا تیار ہو جاتی ہیں۔ لیکن مقبوضہ جموں وکشمیر میں تو حکومت نے بنیادی انسانی حقوق ہی ضبط کر لیے وہاں کسی زیادتی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزی پر جو سرکاری اہلکار اور خاص طور پر فوجی کر رہے ہوں، کوئی بات بھی نہیں کرسکتا۔ جو ایسی بات کرے اس پر بھی انسداد دہشت گردی کا ایکٹ لگتا ہے۔ فوج گرفتار کر کے بغیر تحقیقات کے دو سال تک نظر بند رکھ سکتی ہے، ایسی صورت میں کیا انسانی حقوق اور کیا خواتین کے حقوق؟ مقبوضہ وادی سے کوئی آواز ہی نہیں اٹھا سکتا تو اس کا ازالہ کیسے ہوگا؟ خرم پرویز ایک بین الاقوامی تسلیم شدہ انسانی حقوق کا کارکن تھا جو مقبوضہ جموں وکشمیر میں اس نوعیت کی انسانی حقوق کی کارروائیوں کی رپورٹیں تیار کر کے نشر کرتا تھا، اسی جرم کی پاداش میں گرفتار ہے جب کہ میڈیا کی آواز مکمل طور پر بند کردی گئی ہے جب کہ بیرون ممالک کشمیری بھی ان زیادتیوں اور مظالم پر خاموش ہیں جن کو بین الاقوامی اداروں میں اس طرح کے مقدمات اٹھانے چاہیے تھے مگر کشمیر کا اجتماعی طور پر ایسا کوئی ادارہ نہیں اور نہ بین الاقوامی سطح کی تسلیم شدہ قیادت موجود ہے جن کی کوئی بات سنے۔

سری لنکا میں، ایک اہم فیصلے میں جافنا ہائی کورٹ نے 7 اکتوبر 2015ء کو چار فوجیوں کو 25 سال کی قید بامشقت، جرمانہ اور 2010ء میں وشوامادھو، کلینوچی میں ایک ری سیٹلمنٹ کیمپ میں ایک خاتون کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کے جرم میں قانونی

فیس کی متاثرہ خاتون کو واپس ادائیگی کی سزا سنائی تھی۔ جرائم میں ملوث سیکیورٹی اہلکاروں کو قصوروار قرار دینا اور اس پر سخت سزا کو یقینی بنانا، اس مقصد کیلئے سرگرم کارکنوں کی مسلسل دخل اندازی سے ہی ممکن ہوا۔

سری لنکا میں جہاں نسلی تصادم اور 2009ء میں ختم ہونے والی ایلم جنگ کی تاریخ بدستور حیران کن ہے، ستمبر 2015ء میں انسانی حقوق کے ہائی کمشنر (OHCHR) کے دفتر سے جاری ہونے والی رپورٹ نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اسے ماننے کے لیے معقول بنیادیں موجود ہیں کہ جنگی جرائم، انسانیت کے خلاف جرائم میں زیادتی کی مختلف شکلیں پائی گئیں جن میں جنسی تشدد اور تشدد کی دیگر اقسام سمیت؛ ہر طرف سے غیر قانونی قتل؛ LTTE کی طرف سے بڑوں کی جبری بھرتی اور بچوں کو بطور جنگجو بھرتی کرنا اور جبری گمشدگیاں شامل تھیں۔ رپورٹ میں قانون، انصاف اور سیکورٹی کے شعبے میں اصلاحات اور بین الاقوامی ججوں، پراسیکیوٹرز، وکلاء اور تفتیش کاروں کے کام کو باہم مربوط کرنے کے لیے ایک ایڈہاک ہائبرڈ جسٹس میکانزم کے قیام کی سفارش کی گئی۔ نئی حکومت کی سیاسی خواہش کے اظہار کے طور پر دوران جنگ ہونے والی انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ازالے کے لیے، سری لنکا کے تعاون سے ایک متفقہ قرارداد یکم اکتوبر 2015ء کو اقوام متحدہ کی انسانی حقوق کونسل نے منظور کی جس میں سری لنکا کی حکومت کو اپنی سفارشات پر عمل درآمد کی ترغیب دی گئی۔

2006ء میں نیپال کی 10 سالہ شورش کے خاتمے کے بعد جب کہ سچائی اور مصالحتی کمیشن (TRC) نے عصمت دری کو جرم قرار دیا جس کے لیے عام معافی نہیں دی جاسکتی، عصمت دری کی رپورٹنگ کے لیے 35 دن کی حد کا قانون دوران جنگ عصمت دری کے واقعات کو عدالت میں لے جانا عملی طور پر ناممکن بنا دیتا ہے۔ مزید برآں، TRC نے انسانی حقوق کی سنگین خلاف ورزیوں کے ذمہ داروں کو مؤثر معافی دی اور TRC کو

کنن پوش پورہ

مصنف۔ بشیر سدوزوی

مفاہمت کے وسیع اختیارات دیے، جس کے نتیجے میں متاثرین مصالحتی عمل کے حصے کے طور پر ایسی صورتحال میں اپنے انصاف کے حق کو ترک کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جس میں کمیشن کو متاثرین اور مجرموں کے درمیان ثالثی کرنے کا اختیار حاصل ہے یہاں تک کہ عصمت دری کے معاملے میں بھی اسی کو ثالثی کرنی ہے۔

بین الاقوامی دباؤ کے باعث ہندوستان میں فوجداری قانون میں ترامیم اور جنسی زیادتی کی تعریف میں توسیع ہوئی ہے، ہم نے جنسی تشدد کے لیے استثنیٰ کے متعلق کافی بنیادی سمجھ بوجھ حاصل کی ہے اور نتیجتاً ہم اس پر بات کرنے اور انصاف کے لئے لڑنے کے قابل ہوئے ہیں۔ اس کے بارے میں اور انصاف کے لیے لڑنے کے لیے یہ بات قابل ذکر ہے کہ 2013ء میں مظفر نگر، بھارت میں حالیہ ٹارگٹڈ تشدد کے دوران، سات مسلم خواتین نے جنہیں دوسری برادریوں سے تعلق رکھنے والے مردوں نے وحشیانہ گینگ ریپ اور جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا، آرٹیکل 21 کے تحت اپنے جینے کے حق کے تحفظ کے لیے رٹ پٹیشن دائر کی تھی۔ مارچ 2014ء کے تاریخی فیصلے میں ٹارگٹڈ اجتماعی عصمت دری میں بچ جانے والوں کی بحالی کی ضروریات کو تسلیم کرتے ہوئے، ہندوستان کی سپریم کورٹ نے حکم دیا کہ ریاستی حکومت کی طرف سے خواتین کو بحالی کے لیے ہر ایک کو 500,000 روپے معاوضہ ادا کیا جائے، اس کے باوجود مجرموں کو سزاؤں سے استثنیٰ ہی دیا گیا۔ جب تک مجرموں کو سخت سزائیں نہیں دی جاتیں، جرائم میں کمی نہیں آسکتی۔

دسمبر 2012ء کی آ کیو پائی بالو وتر تحریک کا محور بھی جنسی تشدد اور اس جرم سے معافی کا خاتمہ تھا، جسے کچھ لوگ جنسی تشدد کی مخالفت میں اور انصاف کے مطالبے میں دہلی کے احتجاج مظاہروں کے اثرات کے طور پر دیکھتے ہیں۔ اس تحریک کے بڑے نتائج میں سے ایک 27 نومبر 2015ء کی ترمیم تھی جس میں عصمت دری کی تعریف کو وسیع کر کے ہم جنس ریپ اور ازدواجی عصمت دری کو قانون کے دائرے میں لایا گیا لیکن اس کا اطلاق

مقبوضہ جموں وکشمیر میں نہیں ہوتا۔

جموں وکشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور خاص طور پر عورتوں پر جنسی تشدد کے حوالے سے ہم کچھ بھی ثبوت کے ساتھ پیش کریں بھارت اس کو اپنے خلاف پروپیگنڈا قرار دے گا مگر اس حقیقت کو کہاں چھپایا جائے کہ IDRC کے تین سالہ تحقیقی پروجیکٹ کے نتائج میں سے ایک، اس سلسلے پر مشتمل آٹھ جلدیں ہیں جن میں سے ایک ایک بنگلہ دیش، نیپال، پاکستان اور سری لنکا پر، دو بھارت پر اور دو الگ کتابیں ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر میں کنن پوش پورہ میں اجتماعی عصمت دری کے واقعے اور اس جرم کیلئے استثنیٰ پر مبنی ہیں۔ گویا جنوبی ایشیا کے پانچ ممالک میں بھارت ہی ایک ایسا ملک ہے جہاں جنسی تشدد اور سزا سے استثنیٰ کے اتنے زیادہ واقعات رونما ہو رہے ہیں جن پر چار کتابیں مرتب ہوئیں اور پورے بھارت کی 36 ریاستوں اور یونین علاقوں میں سے صرف کشمیر میں ہونے والے جنسی تشدد پر دو کتابیں ہیں۔ ان میں 90 فیصد واقعات وادی کشمیر اور کچھ جموں ریجن کے مسلم اضلاع میں ہوئے۔

مقبوضہ جموں وکشمیر میں گزشتہ 33 برسوں کے دوران جس بے دردی سے عورتوں اور بچوں کو ریاستی مظالم اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اس کی مثال دوسرے کسی خطے میں نہیں ملتی جب کہ مجرموں کو ریاستی تحفظ حاصل رہا جس کی وجہ سے ان کو ان گھناؤنے جرائم سے استثنیٰ ملتا رہا۔ مقبوضہ کشمیر کو جیل بنا دیا گیا، اگر انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ریسرچ سینٹر IDRC کینیڈا نے جنسی تشدد اور سزا سے استثنیٰ پروجیکٹ کے تحت یہ تحقیقی کام نہ کیا ہوتا تو جموں وکشمیر کی مظلوم عورتوں پر ڈھائے گئے یہ مظالم بھی اجاگر نہ ہوئے ہوتے اور بھارت طاقت کے زور پر پارسا کا پارسا بنا رہتا۔ اس منصوبے کے دوران ملنے والے بہت سے نتائج، ورکشاپس، مباحثے، شہادتوں اور انٹرویوز کے ذریعے اس موضوع پر جمع کی گئی معلومات ہمارے لئے ذخیرہ ہے جو انسانی حقوق کے لئے سرگرم کارکنوں، طلباء، اسکالرز

کے استعمال کے لیے بہت کام آئیں گے۔

ہمیں امید ہے کہ آئی ڈی آر سی اور دیگر ذرائع سے جمع کیا جانے والا یہ مواد جموں وکشمیر میں جنسی تشدد اور استثنیٰ کے سوال کو پاکستانی عوام تک پہنچائے گا کہ کشمیریوں نے کس قدر قربانیاں دیں اور آپ نے ان کا کتنا ساتھ دیا، اور حریت کانفرنس نے کہاں تک ان کی نمائندگی کی۔ آزاد کشمیر کے حکمران لوٹ مار سے علاوہ بھی کچھ کر رہے ہیں یا بیس کیمپ کا مقصد خاندان در خاندان سرکاری وسائل سے ہاتھ صاف کرنا ہے۔ یہ مواد بہت سے مسائل کو حل کرتا ہے جنہیں ہم نے اوپر اٹھایا ہے، اور پھر بھی، اہم خلا باقی ہے۔ ہم جموں وکشمیر میں جنسی تشدد اور زیادتی کے واقعات پر مبنی سوالات کو مناسب طریقے سے اٹھانے میں کامیاب نہیں ہو سکے۔ اس کی کئی وجوہات ہو سکتی ہیں لیکن سب سے بڑی وجہ مقبوضہ جموں و کشمیر سے بروقت معلومات کا فقدان ہے جو بھارتی حکومت کی پابندی کے باعث وادی سے باہر نکالنا مشکل ہی نہیں دشوار ہے۔ اس کے باوجود ہم چوں کہ ہمہ وقت اس جدوجہد میں ہیں کہ مقبوضہ جموں وکشمیر کے بہن بھائیوں کی اشک سوئی کی جائے۔ اس لئے ان حالات میں بھی ہم اپنے ذرائع سے کچھ مواد جمع کرتے ہیں جو حقیقت کے قریب ہوتا ہے۔ ہمیں ادراک ہے کہ 15 سال ان واقعات کی معلومات جمع کرنے کے باوجود مقبوضہ کشمیر میں ہونے والے جنسی تشدد کے بارے میں مزید شواہد اکٹھے کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم اطمینان کے ساتھ صرف اتنا کہہ سکتے ہیں کہ اس کاوش کیلئے سر جوڑ کے بیٹھنے اور غور وفکر کرنے سے کافی ٹھوس شروعات ہو سکتی ہیں، انفرادی طور پر کوشش کرنے سے بھی خلاء باقی رہے گا تاہم شروعات تو ہونا چاہئیں، اگر ادارہ نہیں تو انفرادی ہی سہی مگر کچھ معلومات تو سامنے آئیں۔ کتابوں اور دیگر وسائل کا سلسلہ اس امید کے ساتھ شروع کیا ہے کہ وہ اسکالرز اور کارکنوں کی اگلی نسل کو اس علم پر استوار کرنے اور جنسی تشدد کے لیے استثنیٰ کو ختم کرنے کے لیے اسے مزید وسیع اور گہرا کرنے کی ترغیب دیں گے۔ ہمیں اس وقت شدید غصہ بھی آتا

ہے اور افسوس بھی جب ہمارے کچھ کشمیری دوست قہقہہ لگاتے ہیں کہ بشیر سدوزئی ریپ ریپ کرتا رہتا ہے۔ حالاں کہ ان کو اس پر قہقہہ لگانے کی نہیں غور و فکر کی ضرورت ہے تاہم آزاد کشمیر اور مقبوضہ کشمیر سے آئے ہوئے مہاجرین کی اکثریت کی یہی حالت ہے تو کس کس کو رویا جائے۔

☆……☆

کشمیر میں انصاف ملنا مشکل ہے

ہم اس دعویٰ میں حق بجانب ہیں کہ اردو زبان میں ہماری یہ کوشش غیر معمولی، خاص اور انتہائی حیرت انگیز ہے اور مقبوضہ جموں و کشمیر میں گزشتہ 35 سال کی طویل مدت کے دوران جنسی تشدد اور سزا سے استثنیٰ کے حالات و واقعات کا احاطہ کرتی ہے جس کے دوران ''کنن اور پوش پورہ'' کے جڑواں دیہاتوں میں انتہائی افسوس ناک واقعہ بھی رونما ہوا جہاں ہندوستانی مسلح افواج کے سپاہیوں کی طرف سے 100 سے زائد خواتین کی اجتماعی عصمت دری اور مردوں پر وحشیانہ جنسی تشدد پر مبنی حقائق کو ہندوستانی ریاست اور اس کی بہت سی ایجنسیوں کی طرف سے مسخ کیا گیا، جھٹلایا گیا یا سرے سے دفن ہی کر دیا گیا تھا۔ جب اس نوعیت اور وسعت کی سچائی کو ریاستی پالیسی کے تحت اس طرح برتا جاتا ہے یا دبا دیا جاتا ہے، تو نہ صرف متاثرین/لواحقین بلکہ آبادی کے بڑے حصوں میں بھی انصاف کی تلاش کو فروغ ملتا ہے اور لوگ اپنے طور پر کوشش کرتے ہیں کہ ان ریاستی مظالم کو عوام تک پہنچایا جائے۔ یہ وہ خواتین اور مرد ہیں جن میں سے کوئی بھی اپنے اردگرد ہونے والے بڑے پیمانے پر تشدد سے محفوظ یا بچا ہوا نہیں بلکہ درحقیقت اس کے گواہ ہیں، اگر اس کا اثر نہیں ہوتا تو آزاد کشمیر کے عوام اور خاص طور پر حکمرانوں اور ممبران اسمبلی پر نہیں ہوتا ان کے دل پتھر ہو گئے یا ضمیر مردہ کہ ان کو مقبوضہ کشمیر کے عوام کے بارے میں کبھی افسردہ اور پریشان نہیں دیکھا۔

مقبوضہ جموں و کشمیر میں آج لوگ اس تشدد کے درمیان پل بڑھ کر جوان ہوئے ہیں بلکہ یوں کہنا چاہیئے کہ صوفیاء کرام کی سرزمین پر پیدا ہونے والے بچے گولیوں کی آواز سن کر جوان ہوئے۔ اس کی بے شمار شکلیں، روزانہ کی بنیاد پر پھیلنے والا خوف اور دہشت،

ریاست کا جھوٹ اور لاقانونیت ہے چاہے وہ سڑک پر ہو یا کسی کے گھر، یہ کشمیریوں کا زندہ تجربہ ہے، اسی طرح کا معاملہ سری نگر کی پانچ نوجوان خواتین کے ساتھ ہے۔ وہ یا تو اس وقت پیدا نہیں ہوئی تھیں یا پھر 1991ء کے اوائل میں یہ ''واقعہ'' پیش آنے کے وقت پیدا ہوئیں۔

جب میں ان نوجوان خواتین کی تحقیق کو دیکھتا ہوں جو انہوں نے جموں وکشمیر میں جنسی تشدد اور استثنیٰ پر جموں وکشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی سی ایس) کے تعاون اور (IDRC) کی نگرانی میں جمع کی ہیں تو دل سے شاباش نکلتی ہے۔ یہ وہ دستاویزات ہیں جنھوں نے ''کنن اور پوش پورہ'' میں اجتماعی عصمت دری کی کہانی کو زندہ کیا اور اس کی تائید کی جس تک جے کے سی سی ایس نے مختلف سرکاری محکموں میں دائر کی گئی متعدد آر ٹی آئی (معلومات کا حق) درخواستوں کے ذریعے رسائی حاصل کی تھی یہاں متاثرین/لواحقین کی شہادتوں کے ریکارڈ بھی موجود ہیں جوان نوجوان خواتین نے کچھ عرصے کے دوران حاصل کیے تھے۔

میں دستاویزات کی تعداد اور وہاں موجود معلومات کی مقدار سے حیران رہ گیا، یہ 21 سال پہلے کے مقابلے میں بہت مختلف ہے جب ''کنن پوش پورہ'' کا واقعہ ہوا تو اس واقعہ میں ہونے والے جنسی جرائم/عصمت دری کے حوالے سے سرکاری یا غیر سرکاری سطح پر شاید ہی کوئی معلومات دستیاب تھیں۔ اس وقت فوج کے دباؤ کے باعث خاموشی اور خوف کا راج تھا لیکن یہاں یہ نوجوان خواتین بے خوفی سے مسئلے کو بیان کر رہی ہیں اور انصاف اور احتساب کے لیے ریاستی حکام سے لڑنے کا عزم رکھتی ہیں اور انہوں نے یہ دلیرانہ اقدام کر کے اس کو ریکارڈ کا حصہ بنا دیا، آج کوئی کشمیری یا انسانی حقوق کا کارکن اس واقعہ پر بین الاقوامی عدالت انصاف میں مقدمہ دائر کرے تو اس کے پاس اس سلسلے میں وافر مقدار میں مواد موجود ہے۔

یہ بھی حیران کن امر ہے کہ اتنے سال پہلے پیش آنے والے 'واقعہ' کو اجاگر

کرنے کے لئے وہ کیوں تیار ہوئیں۔ کس چیز نے انہیں اس مشکل سفر پر جانے اور کپواڑہ کا بار بار سفر کرنے پر آمادہ کیا جہاں یہ دونوں گاؤں واقع ہیں؟ انہوں نے متاثرین اور ان کے لواحقین کا اعتماد اور بھروسہ حاصل کرنے کا انتظام کیسے کیا کہ وہ اپنی کہانیاں ایک بار پھر، نوجوان اور فکرمند خواتین کے ایک گروپ کے ساتھ شیئر کرنے کو تیار ہوئیں۔ انہی میں سے ایک نے انتہائی صدمے کی کیفیت میں مختصر الفاظ میں اپنا مافی الضمیر یوں بیان کیا:

''جب دسمبر 2012ء میں دہلی کی سڑکوں پر ایک چلتی بس میں فزیوتھراپی کی ایک نوجوان خاتون طالبہ کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کی گئی تو لوگوں میں غم وغصہ اس قدر پھیل گیا کہ پورا ملک پرتشدد مظاہروں کی لپیٹ میں آ گیا جس کے دوران متاثرہ لڑکی کو انصاف اور ملزم کو سزا دینے کا مطالبہ ہوا۔ یہ کیا بات ہوئی کہ جموں وکشمیر میں بار بار مسلح فوج کے ہاتھوں عصمت دری کے واقعات نے انہی ہندوستانیوں کو اس جرم کے خلاف احتجاج کرنے پر مجبور نہیں کیا، اس وقت بھی نہیں جب ''کنن اور پوش پورہ'' میں اجتماعی عصمت دری کا واقعہ ہوا؟ 'ہم نے فیصلہ کیا کہ ہمیں اپنی آواز بلند کرنی ہے اور ایسے جرائم کے خلاف اپنی جدوجہد کا بیڑا خود اٹھانا ہے کیوں کہ اگر ہم نہیں کریں گے تو کوئی اور یہ نہیں کرے گا''۔

نوجوان خواتین کا یہ جذبہ ان کی تحریروں اور تحقیق میں جھلکتا ہے جب وہ سوال کرتی ہیں:

''کیا ہندوستان میں عصمت دری قابل سزا جرم ہے لیکن کشمیر میں عصمت دری اس صورت میں جائز ہے جب اس کے مرتکب کشمیر میں ہندوستان کی عزت کے محافظ وردی میں ملبوس مرد ہوں؟ کیا یہی ہندوستانی حکام کا مخصوص چہرہ یا رویہ ہے، سچ کو دفن کرنے اور انصاف سے انکار کرنے کا؟''

ان خواتین کی رائے یہ ہے کہ ''کشمیر میں انصاف ملنا مشکل ہے''۔

کوئی اس تاریک گوشے کو کیسے روشن کرتا ہے، کوئی مایوسی کو امید سے کیسے بدلتا

ہے، کیسے کوئی اس یقین کو مستحکم کرتا رہتا ہے کہ جموں وکشمیر میں انصاف ہوگا۔ یہ نچوڑ ہے جوان خواتین کی تحقیق ہے، اس سے پہلے کہ ''کنن اور پوش پورہ'' کی کہانی کی تفصیلات بتائی جائیں، ان پانچوں خواتین کے بارے میں مختصر معلومات اور ان کا سماجی اور معاشی پس منظر یہاں دیا جارہا ہے کہ کس طرح ان کے خاندان نے اس وقت کی تباہ کاریوں اور وسیع پیمانے پر تشدد سے متاثرہ حالات سے خود کو بچانے کی پوری کوشش کی، کس طرح کچھ الفاظ یا سوالات ممنوع تھے اور ان کو کبھی بیان نہیں کیا جاسکتا تھا، جیسے عصمت دری اور مسلح افواج کے ہاتھوں خواتین اور مردوں پر تشدد لیکن اس کے باوجود انہوں نے ہمت کی اور ان سوالات کو نہ صرف لکھا بلکہ اٹھایا بھی، اس کے باوجود انہوں نے اپنے خوف اور عدم تحفظ کا کیسے مقابلہ کیا۔

ان میں سے ایک نے کیسے ڈراؤنے خواب دیکھے کہ اس کی بھی عصمت دری ہو سکتی ہے۔ کس طرح ایک اور یہ سمجھتے ہوئے بڑی ہوئی کہ مسلح افواج یہاں ان کی حفاظت کے لیے ہیں اور حقیقت میں اس بات کا اعتراف کرتی ہے کہ بچپن میں اسے ان 'وردی والے مردوں' سے ہمدردی محسوس ہوئی جو اپنے بچوں اور گھر والوں سے دور اپنی ڈیوٹی انجام دے رہے ہیں جب کہ ایک تیسری اس خوفناک وحشت کو یاد کرتی ہے جس کا سامنا اسے تب ہوا جب اسے بڑی ہو کر پتہ چلا کہ اس کے اپنے والد کو کئی سال پہلے وردی میں ملبوس ان افراد نے اٹھا کر وحشیانہ تشدد کا نشانہ بنایا تھا، جس کے نتیجے میں اس وقت ان کی موت واقع ہوئی تھی جب وہ بمشکل تین سال کی تھی۔

ان میں سے ہر ایک اپنی تحقیق میں 'بیداری' کے لمحے کو بیان کرتی ہے اور یہ کہ کس طرح اس احساس نے اسے اور ان سب کو اجتماعی طور پر، مشکل اور اکثر بدصورت سچائی کو دریافت کرنے کی راہ پر گامزن کیا، چاہے اسے دفن کر دیا گیا ہو اور بھلا بھی دیا گیا ہو۔ اس طرح ان خواتین نے جھوٹی اور کھوکھلی تحقیقات کے جال کو چھان کر ''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین/ زندہ بچ جانے والوں اور مختلف عدالتوں، جن کے متعلق سمجھا جاتا ہے کہ ان کا مقصد

انصاف دینا ہے، کے درمیان بڑی محنت سے اعتماد اور امید کا ایک پل بنا کر سچائی کی کھوج شروع کی اور بعد ازاں اس ساری سچائی کو منظر عام پر لا کر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے محفوظ کر لیا جو آئندہ نسلوں کو ''کنن پوش پورہ'' کو یاد رکھنے کے لیے بہترین دستاویزات ثابت ہوں گی۔

ان خواتین نے ''کنن پوش پورہ'' کیس کو دوبارہ کھولنے اور اس کی دوبارہ تحقیقات کا مطالبہ کرنے میں اہم کردار ادا کیا تھا۔ انہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں سے تعلق رکھنے والی تقریباً سو خواتین کو متحرک کیا جن میں ان کے اپنے خاندان کی چند خواتین بھی شامل تھیں۔ ان میں سے پچاس نے 2013ء میں کپواڑہ کی نچلی عدالت میں ایک PIL (عوامی مفاد کی عرضی) دائر کرنے کے لیے ان نوجوان خواتین کا ساتھ دیا حالاں کہ 1991 میں جموں وکشمیر پولیس نے اس کیس کو شواہد نہ ملنے کی بناء پر بند کر دیا تھا۔ پی آئی ایل دائر کرنے کا عمل خود اس حقیقت کا مظہر ہے کہ خواتین انتہائی بہادر اور حریت پسند ہیں۔ یہ معمولی کوشش نہیں بلکہ محاذ جنگ پر لڑائی سے بھی بڑی جنگ ان خواتین نے لڑی کیوں کہ یہ تحریر ہمیں اس خوف اور پریشانی کے بارے میں بتاتی ہے جس کا سامنا ان خواتین کے خاندانوں کے ساتھ ساتھ کچھ اور خواتین کو بھی کرنا پڑا، جنہوں نے بعد میں اس وقت اس سے الگ رہنے کا فیصلہ کیا جب انہیں معلوم ہوا کہ پی آئی ایل دائر کرتے وقت ان کے شناختی کارڈ بھی جمع کرانے کی ضرورت ہے۔

شناختی کارڈ کسی بھی کشمیری کے لیے ایک قیمتی اثاثہ ہے جس کے بغیر ان کی زندگیاں خطرے میں پڑ جاتی ہیں۔ قاری حیران ہو سکتا ہے کہ کیا ان 25 سالوں میں اس PIL کے دائر ہونے تک کچھ نہیں ہوا؟ یہ مواد اس سفر کی جانب لے جاتا ہے جس کا آغاز ''کنن پوش پورہ'' میں اس رات' سے ہوتا ہے اور کئی قانونی، سرکاری موڑ اور گھماؤ جن سے یہ 'مقدمہ' گزرا لیکن سب سے اہم بات یہ ہے کہ یہ ہمیں ان گنت بار اس واقعہ کا شکار خواتین اور مردوں اور زندہ بچ جانے والوں کے اپنی زبان کھولنے اور اس کی گواہی دینے

کے متعلق بتاتی ہے چاہے وہ ریاست کے اندر یا باہر سے حقائق تلاش کرنے والی ٹیم کے سامنے ہو یا بہت سی تحقیقات کے دوران جن کا انتظام حکام نے ریاست کی جانب سے کیا ،ان میں سے پانچ اس دوران چل بسے۔

ان میں سے بہت سے لوگ ''اس رات کی ہولنا کی'' کے بار بار بیان کرنے سے تھک چکے ہیں۔تاہم طویل عرصہ گزرنے کے باوجود ان متاثرین نے ہمت نہیں ہاری۔درحقیقت، بہت سے لوگ اس ظالمانہ ناانصافی کے خلاف لڑتے ہوئے مرگئے جوان کے ساتھ کی گئی تھی۔جیسا کہ سری نگر کی یہ پانچ نوجوان خواتین اپنی تحریر وتحقیق میں بتاتی ہیں، ''کنن پوش پورہ'' کی کہانی ایک طرف انصاف سے انکار اور دوسری طرف زندہ بچ جانے والوں کی ہمت اور استقامت کے بارے میں ہے۔جب کہ آزاد کشمیر اور کشمیری ڈائس پورہ اور پاکستان میں مقیم مہاجرین کے ساتھ بھی ایک سوال ہے کہ جب مقبوضہ جموں وکشمیر میں خواتین کے ساتھ ایسا سلوک ہورہا ہوتو آپ کی طرح مطمئن اور پاکستانی سیاسی فرنچائز میں شامل ہوکر ان لوگوں کو بھول سکتے ہیں؟

قارئین کی توجہ اور دلچسپی کے لیے کہانی کو مختلف ابواب میں تقسیم کیا گیا ہے جیسا کہ ان خواتین نے اپنی تحقیق کو ترتیب دیا تاکہ سمجھنے میں سہولت اور آسانی ہو۔ان خواتین میں سے ہرایک نے ایک یا دو ابواب لکھنے کی ذمہ داری قبول کی جس کے نتیجے میں ہر باب میں اس کی انفرادی آواز ہے۔اس کتاب میں مقبوضہ کشمیر سے متعلق مختلف دستاویزات اور رپورٹوں کے ذریعے ''کنن پوش پورہ'' کے واقعات اور تاریخ کی تشکیل نو کی گئی ہے میڈیا سوشل میڈیا اور مختلف ذرائع سے حاصل ہونے والی معلومات کے توسط سے جیسے جموں وکشمیر پولیس کی طرف سے جوڈیشل مجسٹریٹ کو کپواڑہ میں جمع کرائی گئی کیس ڈائری، ریاستی ہیومن رائٹس کمیشن کے کیس کے متعلق بیانات اور سفارشات ،اعلیٰ افسران کی جانب سے جمع کرائی گئیں آفیشل رپورٹس ، پولیس کی دستاویز جو تقریباً 200 صفحات پر مشتمل عصمت دری کا

شکار عورتوں کے بیانات اور اسی طرح جے کے سی ایس ریسرچ ٹیم کو دے گئے متاثرین/ بچ جانے والوں کے بیانات جو مختلف اوقات میں سوشل میڈیا کے ذریعے ہم تک پہنچتے رہے اور ان نوجوان خواتین کی تحقیق میں بھی کافی حد تک موجود ہیں اس میں شامل کیا ہے۔

بعض قارئین کو اس مقدمے کی بہت سی تفصیلات اور مختلف موڑ اور گھماؤ قدرے بوجھل محسوس ہوسکتے ہیں جو عدالتوں کے اندر اور باہر سے گزرے ہیں لیکن یہاں انہی میں یہ حقیقت مضمر ہے کہ کس طرح منظّم طریقے سے متاثرین کو انصاف دینے سے انکار کیا جاتا ہے اور مجرموں کو کیسے ان کے خلاف کافی شواہد کے باوجود تحفظ فراہم کیا جاتا ہے جس کی جھلک اس کتاب میں دکھائی دیتی ہے۔اس کتاب سے پتہ چلتا ہے کہ عصمت دری، ٹارچر اور دیگر مظالم کے بارے میں خاموشی جو کہ استثنٰی کو جنم دیتی ہے، مزاحمت کی ایک وسیع ثقافت کی راہ ہموار کرتی ہے جو ان تمام لوگوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتی ہے جو ریاست کی دانستہ طور پر تشدد، محکومیت ،حقوق کی خلاف ورزی اور انصاف سے انکار کی پالیسی سے براہ راست یا بالواسطہ متاثر ہوئے ہیں۔''کنن پوش پورہ'' کی کہانی ان سب حقائق کی منہ بولتی تصویر اور بہت کچھ ہے۔اس کے علاوہ بھی مقبوضہ جموں وکشمیر میں جنسی تشدد اور سزا سے استثنٰی کے حوالے سے بہت سارے حقائق موجود ہیں جو اس کتاب میں شامل نہیں اور شامل کر بھی نہیں سکتے۔''کنن پوش پورہ'' کا واقعہ تو محض ایک مثال ہے جو جموں وکشمیر کی خواتین پر ظلم ہورہا ہے یا جنوبی ایشیا کا ٹائیگر اور دنیا کی سب سے بڑی جمہوریہ ہونے کا دعویدار بھارت میں ہورہا ہے۔یہ اس کی ایک جھلک ہے جنسی تشدد کے حوالے سے پورے جنوبی ایشیا میں جو کچھ ہورہا ہے اس سب کے نصف سے بھی زیادہ بھارت میں ہورہا ہے اور بھارت کی 36 ریاستوں میں انسانی حقوق کی جو خلاف ورزیاں ہورہی ہیں یا جنسی تشدد اور سزا سے استثنٰی ہو رہا ہے اس کے نصف سے بھی زیادہ صرف ریاست جموں وکشمیر میں ہورہا ہے اور ریاست جموں وکشمیر میں جس قدر جنسی تشدد ہورہا ہے اس کے 80 فیصد سے زیادہ صرف وادی کشمیر

میں ہو رہا ہے جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور بھارتی فورسز کی توجہ کا مرکز یہی وادی کشمیر ہے بدقسمتی سے پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام ان مظالم کا عشر عشیر بھی نہیں جانتے لہٰذا یہ کتاب پڑھنے اور سننے والوں کو نئی معلومات مہیا کرے گی جن میں ضمیر ہے جو خود کو کشمیری یا کشمیریوں کا خیر خواہ سمجھتے ہیں ان کے لیے اس کتاب میں سوچنے سمجھنے کے لیے بہت کچھ ہے اگر وہ سمجھنا چاہیں خاص طور پر آزاد کشمیر کے حکمرانوں کے لیے جو روز نعرے بازی کرتے ہیں کہ ہم آزادی کی جنگ میں ہیں۔ (صہبا حسین)

☆......☆

''کنن پوش پورہ'' اور کشمیر میں خواتین

یہ داستان کشمیر کے دو گاؤں میں گزری ایک رات کے متعلق ہے۔ یہ ایک ایسی رات کی کتھا ہے جو 32 سال سے ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی اور ممکن ہے کبھی ختم نہ ہو، ایک ایسی رات جس میں ریاستی طاقت سے جنسی تشدد، زنا بالجبر، ناانصافی، جبر اور جھوٹ کے ساتھ ساتھ ہمت، بہادری اور سچائی کی سچی کہانیاں بھی ہیں۔ یہ کہانیاں ''کنن پوش پورہ'' کے بارے میں ہیں جہاں انتہائی سرد ترین رات کو پہرے داروں نے خود گھروں کے ساتھ ساتھ لوگوں کے جسموں کو بھی لوٹا اور شراب پی کر قہقہے لگاتے رہے، وہ یہ سب کچھ بے خوف کر رہے تھے کیوں کہ وہ حاکم تھے ان کے پاس ریاستی طاقت کے ساتھ بندوق کی بھی طاقت تھی، اس طاقت کے زور پر وہ جو اقدام کرتے وہی قانون ہوتا لہٰذا اس رات فوج کی جانب سے جنسی تشدد بھارت کا قانون بن گیا۔

''کنن اور پوش پورہ''، کشمیر کی سرحد سے متصل ضلع کپواڑہ کے جڑواں گاؤں ہیں۔ 23 فروری 1991ء کو ہندوستانی فوج کی 4 راجپوتانہ رائفلز رجمنٹ کے ذریعہ کم از کم 100 خواتین کی اجتماعی عصمت دری کی وجہ سے ان دونوں گاؤں کو تاریخ میں جگہ ملی ہے یہ تاریخ کیسی ہے اس کا فیصلہ تو زمانے نے کرنا ہے مورخ نے یا تحقیق کاروں نے کہ کیا ریاستیں جو دعوی کریں کہ یہ علاقہ اس کا اٹوٹ رنگ ہے وہاں کے عوام کے ساتھ ایسا سلوک کیا جا سکتا ہے؟ اس کے بعد سے اب تک 32 سال گزر چکے ہیں، بے عملی، ناکام تحقیقات، بے شرم پردہ پوشی اور سفاکانہ ذلت کی ایک طویل تاریخ کے باوجود، متاثرین نے انصاف کے لئے اپنی جدوجہد جاری رکھی ہے اور آج بھی یہ آواز دبی نہیں کہ اس مقدمے کو بین

الاقوامی عدالت میں اٹھایا جانا چاہیے تھا تاہم دنیا کم وبیش ''کنن پوش پورہ'' کو بھول چکی ہے خاص طور پر آزاد کشمیر میں تو کچھ خاص خاص کے سوا کسی کو معلوم ہی نہیں کہ مقبوضہ کشمیر میں ''کنن پوش پورہ'' دو گاؤں ہیں جہاں اس طرح کی کوئی کہانی تخلیق ہوئی تھی حتیٰ کہ اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگوں کو بھی خبر نہیں۔ اس طرح کی ایک محفل جہاں ریٹائرڈ پروفیسر، ریٹائرڈ ہیڈ ماسٹر، ریٹائرڈ بیوروکریٹ، سابق قوم پرست طالب علم رہنما اور اعلیٰ تعلیم یافتہ لوگ موجود تھے تو میں نے ان سے پوچھا کہ کیا آپ کو ''کنن پوش پورہ'' یاد ہے (Do you remember Kunan Posphpora?) تو ان میں سے کوئی ایک بھی ان گاؤں کے نام جانتا تھا اور نہ اس واقعے کے بارے میں کچھ معلومات تھی تو عام مزدور اور ڈرائیور سطح کے شہری کو کہاں معلوم ہوگا اور اگر کوئی اس بارے میں معلومات ہی نہیں رکھتا تو اس کے بارے میں ردعمل کیا دے گا؟ یعنی کچھ عرصہ پہلے تک یہی صورتحال مقبوضہ کشمیر میں بھی ہوگی مگر 2013 ء میں خواتین کے ایک گروپ نے جموں وکشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی سی ایس) سری نگر کی مشاورت سے اس کیس کے سلسلے میں مفاد عامہ کی عرضی (پی آئی ایل) دائر کرنے کا فیصلہ کیا، جبکہ اس وقت یہ واقعہ 22 سال پرانا ہو چکا تھا۔ اس پر یہ خواتین قابل مبارکباد ہیں کہ انہوں نے گرد آلود فائلوں سے اس مقدمے کو دوبارہ نکالا اور عوام کی عدالت میں لے آئیں۔

بھارتی مسلح افواج کی جانب سے ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری کے بارے میں یہ نئی بحث جزوی طور پر ہماری زندگی کی تاریخ سے ابھری اور جزوی طور پر دسمبر 2012ء کے نئی دہلی ریپ کیس سے شروع ہوئی جیسا کہ پچھلے صفحات میں اس کا تذکرہ ہوا۔ نوجوان لڑکی کی عصمت دری کی کہانی کشمیریوں میں شدت سے گونج رہی تھی اور اس کے لئے یکجہتی کا ایک وسیع احساس موجود تھا۔ بہت سے لوگوں نے کہا کہ وہ بہت اچھی طرح جانتے ہیں کہ عصمت دری کا مطلب کیا ہے۔ جموں وکشمیر میں، خاص طور پر وادی میں،

عصمت دری ایک عام واقعہ ہے، ایک ایسا ہتھیار جس کا استعمال اکثر وردی میں ملبوس مرد کرتے ہیں اور ہم یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکے کہ دہلی میں ہونے والے ریپ کے اس واقعے نے جہاں پورے ہندوستان میں (برحق) ہنگامہ برپا کر دیا تھا، وہیں اتنے سال پہلے کشمیر کے دو گاؤں میں ہونے والی اجتماعی عصمت دری پر شاید ہی کسی جانب سے توجہ دی گئی ہو۔ ایک دلیل جو ہم اکثر سنتے ہیں وہ یہ تھی کہ کس طرح وردی میں ملبوس مردوں کے ذریعہ عصمت دری کا ارتکاب قابل معافی ہوتا ہے، اور اس کا اظہاری ایک ایسے ملک سے کیا جاتا ہے جو دنیا کو متاثر کرنے کے لئے 'سب سے بڑی جمہوریت' ہونے کے کارڈ کا استعمال کرتے نہیں تھکتا۔ تاہم، یہ واضح تھا کہ ریاست کے جبر کے بہت سے اوزاروں میں سے ایک اہم انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی یادوں کو مٹانا تھا، یا اس سے بھی بدتر، اتنے ہی ہولناک جرم کی یادوں کو مٹا ڈالنا ہے۔ خواتین کا یہ گروپ 1991ء کی اجتماعی عصمت دری کے متاثرین کے ساتھ اب تک کی سب سے بڑی ناانصافی یعنی اس حوالے سے عوامی یادداشت کو جبری طور پر ختم کرنے کی سرکاری کوشش کے خاتمے کیلئے متحد ہوا، ان کی جدوجہد کو دیکھ کر اس کتاب میں ہم نے اس عمل کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے جو ہمیں اپنے طور پر معاملے کی تحقیق کو سوچنے سمجھنے کی طرف لے گیا، اور اس قانونی جنگ کو جو ابھی تک ''کنن پوش پورہ'' کے واقعے کے متاثرین اور زندہ بچ جانے والے لڑ رہے ہیں ان کے ساتھ شامل ہونے کی کوشش کر کے اس مقدمہ کو پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام کی عدالت میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے اگر یہ عدالت اس کو قبول کرے۔

☆......☆

کشمیر میں خواتین اور مزاحمت

آج کشمیری عورت عدم تحفظ کا شکار ہے کہ نہ جانے کب کوئی فوجی گھر میں داخل ہو جائے اس کے بعد کیا ہوگا یہ سوچ کر دل کانپ جاتا ہے، اصل خوف مجرم کے احتساب کا نہ ہونا ہے کہ کوئی ایسا ادارہ بھی نہیں جہاں شکایت درج کی جا سکے۔ کسی بھی عورت کے لیے مردوں کے غلبے سے لڑنا کافی مشکل ہے۔ مرد اگر فوجی اور بندوق بردار ہو اور وہ آپ پر جو الزام لگائے اس کو سچ مانا جائے گا تو یہ صورت حال اور زیادہ خوفناک ہے اور یہی صورتحال جموں و کشمیر میں جنسی تشدد کو فروغ دیتی ہے لیکن کشمیر میں لوگ دو مظلوم شناختوں کو زندہ رکھنے کا بوجھ اٹھاتے ہیں۔ زندگی کی دو حقیقتوں کو سیکھتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں، جتنی بھی کوشش کریں، یہ دونوں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہو سکتے، سب سے پہلے، خاموشی، جو بد قسمتی سے پورے معاشرے میں خواتین کو زندہ رہنے کی تکنیک کے طور پر سکھائی جاتی ہے، پدر شاہی فطری اور ابدی ہے، یہ عورتوں کی زندگی کا انتظامی اصول ہے، جسے معاشرے، مذہب، روایت اور ثقافت کے ذریعے اپنایا جاتا ہے۔ لیکن جموں و کشمیر کی عورت ایک اور بوجھ اٹھاتی ہے؛ کسی قبضے پر خاموشی اس سے بھی زیادہ گونج دار ہوتی ہے۔

مقبوضہ جموں و کشمیر کی عورت کو نہ صرف سڑکوں پر ہراساں کیے جانے اور جنسی تفریق جیسے روزمرہ کے خطرات کے خلاف لڑنا ہے بلکہ ایک قابض قوت بھارتی فورسز اور وادی میں پنجے گاڑے اس قوت کے وردی پوش نمائندوں کی بھیڑ کے خلاف بھی لڑنا ہے جو اپنے خلاف بولنے کی ہر کوشش پر کڑی نظر رکھتی ہے۔ آج کی نسل کے تمام کشمیریوں کے ذہنوں میں بندوقوں، گولیوں کی آوازوں، ہندی بولنے والے فوجی جوانوں کے اپنے گھروں

میں داخل ہونے کی یادیں تازہ ہیں، اور وہ سبز، دہشت پھیلانے والی، بکتر بند گاڑیاں ہیں جو اکثر سفید جلی حروف میں 'راکشک' ہونے کا اعلان کرتی ہیں۔ نوجوانی کی ابتدائی یادیں جو کسی بھی نوجوان کشمیری عورت کے پاس ہیں وہ گلیوں کے کونوں پر غصے میں نظر آنے والے مسلح افراد، سیاہ گلوبند میں ڈھکے ہوئے سر، کسی بھی گزرتی ہوئی لڑکی کو گھورتے، مضحکہ خیز اور نازیبا تبصرے کرنے کی یادیں ہیں۔ جب وہ کم سن تھی تو یہ سب کچھ اس نے اپنی آنکھوں سے دیکھا اور اس کے ذہن پر نقش ہو گیا جو کبھی نہ بھولے گا۔ جب کوئی یہ پوچھے کہ بھارتی مسلح افواج پر الزام کیوں لگا رہے ہیں جب کہ ان کے عہدے پر موجود کشمیری مرد بھی ایسا ہی کر سکتے ہیں تو بے اختیار یہ کہنا پڑتا ہے کہ جاؤ اور کسی ایسے سے جا کر یہ پوچھنے کی کوشش کرو جس کی بندوق کی نال آپ کی آنکھوں کے درمیان کی چھوٹی سی جگہ کو گھور رہی ہو۔ ہاں وہ کشمیری مرد بھی شاید ایسا ہی کریں جو ہندو ہوں اور فورسز یا پولیس اور ممکن ہے مخبر، یا ویلیج گارڈ ایسا کریں جس کو فوجی کی طرح جرائم کرنے کی چھوٹ اور ریاستی تحفظ حاصل ہے۔

مؤرخ اوما چکرورتی نے منی پور کی ایک خاتون کا حوالہ دیا ہے، جسے مسلح افواج نے ریپ کا نشانہ بنایا تھا: 'وہ کہتی ہے ان کے پاس طاقت ہے اور ان کے پاس بندوقیں ہیں! مجھے لگتا ہے بہتر ہے کہ ہم خاموش رہیں، بندوق، جوان کے لئے طاقت اور لوگوں کے لئے خوف کی علامت ہے، اختلاف رائے کی آوازوں کو خاموش کرنے کے لئے کافی ہے، چاہے اختلاف کتنا ہی جائز کیوں نہ ہو۔ ایک کشمیری عورت کو سب سے پہلے جو چیز سکھائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ وہ اپنی کمزوری سے آگاہ ہو، خود کو شکار بننے سے روکنے کے لیے اسے کتنی جدوجہد سے گزرنا پڑے گا۔ خواتین کے خلاف تشدد کے بارے میں اقوام متحدہ کے سابق خصوصی نمائندے ڈاکٹر یاکن ارترک نے نشاندہی کی ہے کہ 'فوجی ماحول سرکاری اور نجی پدرشاہی دونوں کو بااختیار بناتا ہے۔

مقبوضہ کشمیر کی خواتین کو اس جدوجہد کے دوران بہت نقصان اٹھانا پڑا ہے،

آزادی کی اس تحریک نے تو عورت کو کچل کر رکھ دیا۔ان میں سے کچھ اپنی جانوں سے ہاتھ دھو بیٹھی ہیں اور مسئلے کا بڑا نقصان بن چکی ہیں۔بعض دوسری عورتوں نے اپنے پیاروں کو کھو دیا ہے، انہیں گمنامی میں غائب ہوتے دیکھا ہے، کبھی کبھی انہیں زخموں سے چور اور تباہ حالت واپس لوٹتے دیکھا ہے، ان میں سے بیشتر خواتین کو ہر وقت فوری نقصان اور اس خوفناک لفظ، ''عصمت دری'' کا خطرہ لاحق رہتا ہے، خواہ اس کی عمر 8 سال کی ہو یا 80 سال۔جیسا کہ جموں میں کٹھوء کی آصفہ بانو کے ساتھ ہوا یا ''کنن پوش پورہ'' میں 80 سال کی خواتین کے ساتھ ہوا، یہ خوف ان کی زندگی کو ویران کر رہا ہے۔

کشمیر میں عصمت دری کو جنگ اور دہشت گردی کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا ہے۔''کنن پوش پورہ'' کشمیر میں خواتین کے خلاف کسی سزا کے خوف کے بغیر جنسی تشدد کی ایک واضح اور کھلی مثال ہے۔کشمیر میں ہر روز جنسی تشدد کی نت نئی شکلیں ظہور پذیر ہوتے دیکھی جاسکتی ہیں۔کشمیر کی عورت گیٹ پر کھڑے اپنے پیاروں کی واپسی کا انتظار کر رہی ہیں، خوف زدہ اور پریشان ہیں۔مائیں بیٹیاں، بیویاں اور بہنیں ہر وقت اپنے گھر والوں کی حفاظت کے لیے پریشان ہیں، اپنے مردوں سے بار بار پوچھتی ہیں کہ آیا انہوں نے باہر نکلتے وقت اپنا شناختی کارڈ رکھ لیا ہے، انہیں کسی بھی سبز/ خاکی انسانی شکل سے گریز کرنے کی یاد دلاتی ہیں، اور ان پر زور دیتی ہیں کہ وہ کسی بھی پریشانی میں نہ پڑیں اور گھر سے نکلتے وقت دعائیں پڑھیں تاکہ خیریت سے گھر آنے میں اللہ تعالیٰ کی مدد شامل ہو۔

کشمیری اپنی نوجوان خواتین سے کہتے ہیں کہ وہ ہمیشہ بہت محتاط رہیں، صرف ضرورت پڑنے پر ہی باہر نکلیں، اور اکیلے نہیں، اور اندھیرے سے پہلے گھر آئیں۔ان بنکروں سے بچیں جہاں وردی میں ملبوس مرد رہتے ہیں۔متبادل راستہ اختیار کریں، اس سڑک کا استعمال نہ کریں جب تک کہ آپ کو ضرورت نہ ہو۔کشمیری اپنی عورتوں کے حوالے سے روز ہی اندیشوں میں مبتلا رہتے ہیں، یہی ان کی زندگی ہے، ان کے لئے گولیاں لوریاں بنی رہی ہیں

جو، ان کو سلاتی ہیں، خون کی بو انہیں جگاتی ہے، خوف انہیں مصروف رکھے ہوئے ہے اور امید ان کو زندہ رکھے ہوئے ہے۔کشمیری خواتین گو کہ اس تنازعہ کے عین درمیان میں رہ رہی ہیں مگر انہیں مسلح بغاوت کے موقع پر تقریباً ہمیشہ متاثرین کے طور پر پیش کیا گیا ہے۔اس مزاحمت میں آسیہ اندرابی سمیت بے شمار خواتین شامل ہیں جنہوں نے ایسے طریقے سے مزاحمت کرنے کا انتخاب کیا ہے جن میں ان کے ساتھ بدسلوکی کرنے کی کوشش کرنے والے مسلح افسر پر کانگڑی پھینکنے سے لے کر پتھراؤ، سڑکوں پر احتجاج اور اجتماعی جنازوں میں شرکت، مسلح جدوجہد کی حمایت کرنے اور اپنی سیاسی رائے اور وابستگیوں کے اظہار کے لئے سول سوسائٹی کے ساتھ کام کرنے تک مختلف چیزیں شامل ہیں۔اسی لیے ہم کہتے ہیں کہ کشمیر کی عورت بہت بہادر ہے جو گزشتہ 35 برسوں سے ایک بداخلاق اور ظالم فوج سے نبرد آزما ہے جو تمام تر فحش حربے استعمال کرنے کے باوجود کشمیر کی عورت کو توڑ نہیں سکی ہے۔

معروف سیاسی وسماجی کارکن اور جیل کی یادداشت ''قیدی نمبر 100'' کی مصنفہ انجم زمرودہ حبیب نے دہلی کی بدنام زمانہ تہاڑ جیل میں من گھڑت الزامات میں پانچ سال گزارے۔ ایک انٹرویو میں انہوں نے خواتین کی قربانیوں کو تسلیم نہ کرنے پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا: ''جب مزاحمت کو سیاست کے ساتھ ضم کر دیا جاتا ہے تو صرف طاقت ہی تشویش کا باعث بنتی ہے، اس کے علاوہ جنگ زدہ علاقوں میں یادیں قلیل مدتی ہوتی ہیں، اس میں یہ حقیقت بھی شامل رہے کہ پوری دنیا میں مردوں کا غلبہ ہے اور مرد خواتین کی قربانیوں کو تسلیم نہیں کرنا چاہتے۔یہ تمام عوامل اس بے حسی کو بڑھاوا دیتے ہیں۔یادداشت کی کمزوری اور معاشرے کی عمومی پدرشاہی فطرت ہمیں بھول جانے پر مجبور یا کم از کم مزاحمتی تحاریک میں خواتین کی شرکت سے لاعلم بنا دیتی ہے۔''

آسیہ جیلانی ایک ایسا نام ہے جسے بہت سے کشمیری جانتے ہیں: ایک نوجوان صحافی اور انسانی حقوق کی کارکن جنہوں نے 2004ء میں انتخابات کی نگرانی کے مشن کے

دوران انصاف کے لئے لڑتے ہوئے اپنی جان گنوا دی۔ وہ ''Voices unheard'' نامی میگزین کی مدیرہ اور لکھاری تھیں جو کشمیر میں خواتین کے مسائل اور جدوجہد کے لیے وقف تھا۔ جیسا کہ سمیرا شاہ آسیہ کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے کہتی ہیں،'' آسیہ ان بہت سی "پس پردہ" خواتین میں سے ایک تھیں جو بیرونی دراندازوں کی طرف سے مسلط کردہ کئی سالوں کے ظلم و جبر کے باوجود کشمیری مزاحمت کی طاقت کی زندہ مثال تھیں۔'' اس طرح کی دیگر مثالیں بھی موجود ہیں جن میں انفرادی اور اجتماعی طور پر مقبوضہ جموں وکشمیر کی خواتین مضبوط سیاسی آواز میں عوامی طور پر مزاحمت کرتی نظر آ ئیں۔

مسرت زہرہ جبیں بین الاقوامی شہرت یافتہ فوٹو جرنلسٹ ہیں۔ انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے حوالے سے ان کی ریلیز کردہ تصویروں نے بھارتی فوج کے سامنے ٹینک کھڑے کرنے کا کام کیا، تاہم بالآخر اس کے ساتھ بھی یہی ہوا جو کشمیر کی دیگر خواتین کے ساتھ ہوتا ہے، گرفتاری، رہائی، گرفتاری رہائی، بالآخر اس کو کشمیر چھوڑنا پڑا۔ آسیہ اندرابی حریت کا ایک معتبر اور بڑا نام ہے، وہ اپنی 33 ساتھی خواتین کے ہمراہ تہاڑ جیل میں قید ہے ۔ان کا خاوند قاسم فکتو مجموعی طور پر 33 سال سے جیل میں ہے جب کہ آسیہ خود 18 سال جیل کاٹ چکی مگر حق خودارادیت کے مطالبے سے پیچھے نہیں ہٹی اور نہ ان کی ساتھیوں کو بھارتی فوج کے مظالم توڑ سکے ہیں۔

اس کے علاوہ ہزاروں دیگر بے نام اور گمنام کشمیری خواتین بھی ہیں جو مل کر مزاحمت کی واحد اور مضبوط آواز بن چکی ہیں۔ مصنفہ گیتا ہری ہرن کشمیری خواتین کی زندگیوں کے بارے میں لکھتی ہیں:''تمام خواتین نے ایک محفوظ، صحت مند، نارمل زندگی گزارنے کے خلاف ناقابل برداشت رکاوٹوں کے بارے میں بات کی لیکن ان سبھی نے، بغیر کسی استثنا کے، کسی نہ کسی طرح، ان مشکلات کے خلاف اپنی لڑائیوں کے بارے میں بھی بات کی۔ اپنے غصے اور مایوسی کے بارے میں؛ اپنے احتجاج کے متعلق۔ اس حوالے سے اقدامات اور

منصوبے کے بارے میں؛ مدد کی تلاش میں اپنے سفر کو بیان کرنے میں، غرض ان خواتین کو مزاحمت کی زبان کو اپنی مادری زبان بنانا پڑا ہے''۔

کشمیر میں خواتین کی نوجوان نسل اختلاف رائے اور مزاحمت کی بحث میں تیزی سے حصہ لینے لگی ہے۔ ہم سب کو 2008ء اور 2010ء کے وہ لمحات اچھی طرح یاد ہونا چاہئیں جب کشمیری نوجوانوں کو قتل کرنا ہندوستانی فوج کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔ جن خواتین نے کالجوں میں تعلیم حاصل کی، انہوں نے خوب احتجاج کیا۔ کسی نے نہیں روکا، صرف غیر متشدد رہنے اور کسی بھی قسم کے نعرے بازی میں ملوث نہ ہونے کے لئے کہا جاتا تھا۔ غصہ مختلف طریقوں سے ظاہر ہوتا ہے: کالج میں احتجاج میں شامل ہونا ان میں سے ایک تھا۔ ظالمانہ اور سفاکانہ قتل کے خلاف ہم نے سفید لباس میں مارچ کرتی لڑکیوں کو سوشل میڈیا پر دیکھا اور ابھی بھی ذہن میں محفوظ ہے۔ 'آزادی' کے نعرے لگاتے ہوئے سری نگر کی لڑکیوں کو اکثر دیکھا جاتا تھا، حالانکہ انہیں متنبہ کیا جاتا تھا کہ ایسا نہ کریں، اور جب پڑوسی لڑکوں کے کالج سے بھی اسی طرح کے نعروں کی گونج سنائی دی تو لڑکیوں کے جذبات اور زیادہ ہوئے۔

لیکن یہ ضروری نہیں کہ قابض فوج کے بارے میں سیاسی رائے کا اظہار کرنے کیلئے کالج میں احتجاجی مارچ میں شرکت کرنے والی، متوسط طبقے کی سرینگر کی ہی لڑکیاں ہوں بلکہ کشمیری خواتین نے اس سے زیادہ روایتی ثقافتی چینلوں کے ذریعے مزاحمت کی ہے اور اپنے جذبات کو واضح طور پر بیان کیا ہے۔ کشمیر میں جشن کے لمحات میں گائے جانے والے گانوں کے ذریعے بھارتی فوج کے ہاتھوں شہید ہونے والوں کو شہید قرار دینے والی خواتین کے بارے میں کئی مثالیں موجود ہیں۔ سیما قاضی نے اپنی کتاب جینڈر اینڈ ملیٹرائزیشن میں ریتا منچندا کا حوالہ دیتے ہوئے لکھا ہے کہ مزاحمت کے ثقافتی اظہار کے طور پر کشمیری خواتین جشن منانے کا روایتی کشمیری گیت ''منوون'' گنگناتی تھیں، جس میں مقامی مجاہدین (مجاہدین آزادی) کی تعریف میں اشعار شامل ہوتے تھے۔ یہ مجاہدین آزادی کی حوصلہ افزائی کا ایک

ثقافتی طریقہ ہے جوخواتین نے اپنایا۔

کشمیری عورتوں نے ان مردوں کے لئے ماتم کیا ہے جنہیں انہوں نے کھودیا یعنی لگ بھگ ایک لاکھ شہید جو آزادی کی تحریک میں شہید ہوئے، ان بیٹوں کے لئے جو کبھی واپس نہیں آئے یعنی آٹھ ہزار لاپتہ نوجوان، جن بیٹیوں کی عصمت دری کی گئی، یعنی 13 ہزار سے زائد ایسی خواتین جن کی بھارتی فورسز نے اجتماعی عصمت دری کی اور ظالموں کے محاصرے میں جکڑی اپنی پیاری اور خوبصورت سرزمین کے لئے یعنی کشمیر کی آزادی کے لئے۔ ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین جب عوامی سطح پر یا نجی طور پر، بات کرتی ہیں تو یہ واضح ہوتا ہے کہ وہ سمجھتی ہیں کہ ان پر حملہ اس لیے کیا گیا کیوں کہ وہ کشمیری ہیں اور کشمیری حق خودارادیت مانگتے ہیں۔ اسی طرح جیسے نوجوان کشمیری مرد شہید ہوتے ہیں، کشمیری خواتین کی قربانیاں بھی اتنی ہی عظیم ہیں جتنی کسی بھی مرد شہید کی بلکہ اس سے بھی زیادہ کیونکہ جنسی تشدد موت سے زیادہ اذیت ناک اور خوفناک ہے۔

اس کے باوجود برسوں سے کشمیر اور ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین کو بدترین جنسی تشدد کے باوجود زندہ بچ جانے والی خواتین کے بجائے متاثرین کے طور پر پیش کیا جاتا رہا ہے۔ بھارتی میڈیا نے انہیں کمزور برقع پوش خواتین کے طور پر دکھایا ہے جو غیر فعال اور بے آواز ہیں لیکن پھر بھارت کے مرکزی کنٹرولڈ ذرائع ابلاغ نے کشمیری خواتین کو ایک نئے روپ میں دکھایا ہے، جو اپنے ہاتھ میں پتھر تھامے سڑکوں پر بھارتی مسلح افواج کو چیلنج کر رہی ہیں۔ سنجے کاک نے 'The last option, A stone in her hand' میں تبصرہ کیا ہے: ''اس دن تک، کشمیری خواتین کو کچھ خاص اہمیت حاصل نہیں تھی جنہیں اپنے گھروں میں بند مستقل تماشائی کے طور پر دکھایا گیا تھا جو گھر بیٹھے سڑکوں پر احتجاج کا نظارہ کرتی ہیں اور جب انہیں اپنی محفوظ پناہ گاہ سے باہر دیکھا گیا تو انہیں متاثرین کے طور پر پیش کیا گیا، روتی ہوئی سوگوار، نہ ختم ہونے والے جنازے کے جلوسوں میں بین کرتی عورتیں، لیکن اب کشمیری

خاتون کی ایک نئی تصویر اخبار کے پہلے صفحے پر جگہ لینا شروع ہوگئی ہے۔ انہوں نے عام شلوار قمیص، گلابی، بلیو، جامنی اور پیلے رنگ کے کپڑے پہن رکھے ہیں۔ اس کا سر دوپٹے سے ڈھکا ہوا ہے اور ایسا لگتا ہے کہ اسے پہچانے جانے کی کوئی پرواہ نہیں ہے۔ وہ اکثر درمیانی عمر ورمتوسط طبقے کی ہوتی ہیں، اور وہ ایک پتھر اٹھائے ہوئے ہیں''۔

کشمیری خواتین سڑکوں پر احتجاج کر رہی ہیں، پتھر پھینک رہی ہیں، روایتی دقیانوسی تصورات اور رکاوٹوں کو توڑ رہی ہیں، اور مزاحمت کا ایک نیا اظہار پیدا کر رہی ہیں۔ کشمیری خواتین ہمیشہ قتل وغارت کے خلاف عوامی ریلیوں اور سیاسی جلوسوں کا حصہ رہی ہیں۔ سوتیک بسواس لکھتے ہیں، 'مسلم اکثریتی وادی کشمیر میں خواتین کے باہر آنے میں اس حقیقت سے مدد ملی ہے کہ وہ روایتی طور پر دنیا کے بہت سے حصوں میں اپنے ہم منصبوں کے مقابلے میں زیادہ آزاد رہی ہیں۔ اس طرح جہاں کشمیری سیاسی زندگی میں مردوں کا غلبہ ہے وہیں کشمیری خواتین اختلاف رائے، مزاحمت اور اظہار آزادی میں سب سے آگے ہیں۔

ایسی ہی ایک خاتون پروینہ اہنگر ہیں۔ پروینہ نے اپنے 14 سالہ بیٹے کو 1990ء میں 'جبری گمشدگی' کے ایک گمنام واقعہ میں کھو دیا تھا۔ سری نگر ہائی کورٹ میں اپنا مقدمہ لڑتے ہوئے انہوں نے، انسانی حقوق کے وکیل پرویز امروز اور لاپتہ افراد کے کچھ رشتہ داروں نے لاپتہ افراد کے والدین کی ایسوسی ایشن (اے پی ڈی پی) تشکیل دی، جو ایک ایسی تنظیم ہے جوان کے بیٹے جیسے لوگوں کے مسائل کو اٹھاتی ہے۔ پروینہ مزاحمت اور انصاف کی مسلسل تلاش کی آواز ہیں۔ اس نے اپنے غم کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ سینکڑوں دوسرے والدین کے لئے لڑنے کے عزم میں تبدیل کر دیا۔ ''کنن پوش پورہ'' کی عورتیں مزاحمت کی ایک ہی زبان بولتی ہیں۔ وہ 25 سال سے یہ بات کہہ رہی ہیں، اس کے خلاف لڑ رہی ہیں۔ ہر لمحہ جدوجہد میں مصروف ہیں۔

کشمیر کی نوجوان خواتین جو اپنے اپنے طریقوں سے مزاحمت کر رہی ہیں، ان میں

سے ہر ایک کے پاس بتانے کے لیے ایک کہانی ہے: شوپیاں کی متیرہ بانو کی کہانی ہو یا کٹھوعہ کی آصفہ بانو کی کہانی ''کنن پوش پورہ'' کی کہانی جو وادی کا ایک حصہ ہے، ایک ایسی کہانی جو ندیوں کے ساتھ بہہ رہی ہے، بارش کے ساتھ برستی ہے، اور برف کی طرح بے چین زمین پر سوتی ہے۔

اسی طرح کی اور بہت ساری کہانیاں ہیں، 10 اور 11 مئی 1995ء کی درمیانی رات چرار شریف کی کہانی جہاں آگ کے شعلے بلند ہوئے، جہاں ایک ہزار گھر اور 200 دکانیں جل کر بھسم ہو گئیں۔ 8 مئی 1991ء کو سری نگر کے علاقے خانیار میں پیر دستگیر کی کہانی جہاں نماز پڑھتے ہوئے 18 نوجوانوں کی لاشیں گریں اور ماؤں بہنوں نے احتجاج کرتے ہوئے وصول کیں۔

جموں وکشمیر جو 'زمین پر جنت' کہلاتی ہے وہ جگہ جسے وہ بھارتی ٹیلی ویژن پر دکھاتے ہیں جہاں لڑکیوں کو کڑھائی دار کپڑوں میں ملبوس اور بھاری چاندی کے زیورات میں سجے، خوشی سے کشمیر کا مقبول گیت ''بمبر وبمبرو'' گاتے ہوئے دکھایا جاتا ہے، برف سے ڈھکے پہاڑوں کے پس منظر میں وہ ڈل جھیل کے کنارے اس کی دھن پر رقص کرتی ہیں۔ مگر یہ مکمل حقیقت نہیں ہے، ماضی میں ایسا ہوا ہوگا لیکن اب کشمیری ایسی ہوا میں سانس لیتے ہیں جو کیچڑ کے ساتھ ملے خون اور بارود کی بو سے بھری ہوتی ہے، وہ ہوا جو فوج کے جوتوں اور اسلحہ کی گھن گرج کے شور سے گونجتی ہے۔

کشمیری اب ایک ایسی جگہ پر رہتے ہیں جہاں ہندوستانی فوج نے 1991ء میں ''کنن پوش پورہ'' میں کئی خواتین کی عصمت دری کی تھی، اور وہ اس جرم کے خلاف کسی بھی احتجاج کو انہیں بدنام کرنے کی سازش قرار دیتے ہیں۔ یہ وادی آنسوؤں سے بھری ہوئی ہے، ماؤں کے اپنے مرنے والے بیٹوں کے بارے میں گانوں سے بھری ہوئی ہے، وہ عورتیں جن کی دنیا بھارتی مسلح افواج کے ہاتھوں عصمت دری کے بعد راتوں رات تباہ ہوگئی، یہ گھناؤنے

سبز وردیوں میں ملبوس مرد، جوان کو کشمیری عورت ہونے پر پریشان اور ہراساں کر دیتے ہیں۔ ''کنن پوش پورہ'' کی عورتوں اور مردوں کی یہ کہانی سنانا ہم کشمیریوں کے لیے آسان نہیں ہے مگر یہ کتاب ایسا کرنے کی ہماری کوشش ہے تاکہ ہم ان متاثرین کی اس جدوجہد کو آگے بڑھائیں جو انہوں نے شروع کی ہے۔ ہم ان کے راوی ہیں، ''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین کے حامی گروپ کے ارکان ہیں، اور دیگر کے علاوہ، اس تنازعے کے فریق ہیں۔

اس تنازعہ نے سفاکانہ فوجی قبضہ، بے شمار وحشیانہ قتل و غارت گری، اجتماعی عصمت دری، نہ ختم ہونے والی جبری گمشدگیاں اور اجتماعی گمنام قبروں کی تخلیق کے دوران کشمیریوں کی تیسری نسل کو پروان چڑھایا ہے جن کی پرورش ایک ایسے ماحول میں ہوئی ہے جہاں ریپ، چھیڑ چھاڑ جیسے الفاظ اور 'جنس' جیسے الفاظ کا ذکر کبھی نہیں کیا جاتا تھا۔ وہاں لوگ دفاتر اور یونیورسٹیوں میں 'محفوظ' اور 'سیاسی طور پر درست' زبان سیکھتے ہوئے بڑے ہوئے ہیں۔ 'تنازعہ' جیسے الفاظ کو 'ترقی' سے بدلنا اور حقائق سے اندھا رہنا سکھایا گیا ہے۔ کشمیری ایک سخت دور سے گزرے ہیں جہاں انہیں سکھایا گیا ہے کہ 'انسانی حقوق کی خلاف ورزی' جیسی کوئی چیز نہیں ہے اور آپ کو زندہ رہنے کے لئے غیر سیاسی ہونا ہوگا۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جو اظہار رائے کی آزادی سے پاک ہے۔ کشمیر میں ریاست کے خلاف کسی بھی اظہار پر سخت کارروائی کی جاتی ہے اور اس وجہ سے بڑے پیمانے پر خاموشی پیدا کرنے میں کامیابی حاصل ہوتی ہے۔ یہاں ایسا ہی ہے۔ ایک پنجرے میں زندگی جہاں آپ صرف اس وقت بات کرتے ہیں جب اسے 'ریاستی زبان' کے طور پر سرٹیفائیڈ کیا جاتا ہے۔ اب تو خاندان کھانے کی ٹیبل یا دسترخوان پر بھی خاموش رہتا ہے کہ دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں یا پھر دیواروں میں کیمرے نصب ہیں۔

کشمیری ایسی یونیورسٹیوں میں تعلیم حاصل کر رہے ہیں جو تحقیق کے لئے سیاسی طور پر بھرے ہوئے 'دھماکہ خیز' موضوعات کا انتخاب کرنے کی اجازت نہیں دیتیں۔ جہاں

کانگڑی اور فیرن کے بارے میں تحقیق کو کشمیریت، کشمیری ہونے کا انوکھا احساس کے طور پر دیکھا جاتا ہے اور کیمپس کو مکمل طور پر 'کنٹرول' کر کے طلباء کی تجزیاتی صلاحیتوں اور ان کی سیاسی تنظیم کو چیک کیا جاتا ہے۔

جی ہاں کشمیریوں کی یہ تیسری نسل اسی طرح بڑی ہوئی ہے، کہا جاتا ہے، عورتیں خاندانی میدان میں ہمارے 'تحفظ' اور عوامی میدان میں 'قومی یکجہتی' کے نام پر ہماری سرزمین کے لوگوں پر ہونے والے مظالم سے بے خبر رہیں۔ یہ ضروری ہے کہ ہم اس کہانی کو بتائیں چاہے یہ کتنی ہی مشکل کیوں نہ ہو، کیوں کہ اسے دفن کرنے، اسے عوام کی یادوں سے مٹانے کی بار بار کوششیں کی گئی ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ہم لکھ رہے ہیں، ہم اس رات اور اس کے بعد کے 25 سالوں کی کہانیاں بیان کر رہے ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ ہم بھول جائیں۔ جنگ زدہ جگہ پر قابض افواج کی جانب سے مظالم کی تکرار اتنی منظّم ہے کہ آپ کیلنڈر کی تمام تاریخوں کو کسی قتل عام، قتل، گمشدگی، انکاؤنٹر یا ریپ کے ذریعے یاد کرتے ہیں۔ عوام کی یادداشت کمزور ہو جاتی ہے۔ ہر روز ان مظالم میں سے ہر ایک کو یاد کرنے اور دوبارہ زندہ کرنے سے کہیں زیادہ بھول جانا آسان ہے۔ ہم یادوں کو اپنے ذہن کے تاریک کونوں میں دھکیلنے کا انتخاب کر سکتے ہیں، لیکن زندہ بچ جانے والوں کے پاس ایسا کوئی انتخاب نہیں ہے۔ وہ دن رات اپنی یادوں کے ساتھ جینے پر مجبور ہیں۔ یہ کتاب ایک یاد ہے، ایک خراج عقیدت ہے، بھولنے کے خلاف ایک تحریک ہے، پاکستان اور آزاد کشمیر کے عوام کو یاد دہانی ہے، ہماری یادوں کو محفوظ کرنے اور اپنے آپ کو واپس دینے کا ایک طریقہ ہے، یہ ''کنن پوش پورہ'' کی کہانی کو بیان کرنے کا ایک طریقہ ہے جیسا کہ یہ ہوا تھا اور ہندوستانی فوج کی اس کیس اور اس کی یادوں کو مٹانے کی مسلسل کوششیں ہیں۔

ہمارے پاس اپنی انفرادی کہانیاں بھی ہیں کہ ہم کون ہیں اور کس طرح ہماری زندگی ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین کے بڑے بیانیے کے ساتھ جڑی ہوئی ہے۔ ہم اپنی

کہانیاں انفرادی طور پر بیان کرتے ہیں، ہر کہانی منفرد، ایک مختلف بیانیہ، ایک مختلف آواز، اور مختلف یادوں کے ساتھ، اس سے پہلے کہ ہم ''کنن پوش پورہ'' کی کہانی شروع کریں، ہم اپنی شناخت تلاش کرنے کے ایک طریقے کے طور پر اپنی شناخت بیان کرتے ہیں، جو اتنے طویل عرصے سے خاموشی اور تحفظ کے آرام دہ احاطے کے نیچے رکھی رہی۔ ہم ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین کے ساتھ اپنے تعلقات کا ثبوت ان کو یاد کر کے اور ان کی کہانیاں سنا کر دیتے ہیں، جو طویل عرصے سے ہمارے ذمے تھا۔

بھارتی فوج نے تو اپنے کرتوتوں کو طاقت کے ذریعے دبا لیا تھا اور اس انسانیت سوز واقعہ کو معمول کا واقعہ قرار دے کر دبا دیا تھا لیکن جموں کا کشمیر کی پانچ نوجوان خواتین نے ہمت کی اور بین الاقوامی این جی او اور سری نگر کے ایک مقامی فلاحی ادارے کے اشتراک سے کامیابی حاصل کی جو ایک پی آئی ایل دائر کرنے سے وابستہ ہے جس کی وجہ سے ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری کا یہ کیس 22 سال بعد دوبارہ کھولا گیا، ان خواتین نے اس تنازعہ اور ''کنن پوش پورہ'' کے واقعہ کے ساتھ تعلق کی مختلف شکلیں اور کہانیاں بیان کیں۔

اس کتاب میں موجود ہر کہانی اس کی گواہی دیتی ہے کہ ''کنن پوش پورہ'' میں رونما ہونے والا واقعہ سچا ہے جہاں بھارتی فوج کے سپاہی اور افسر انسانیت سے گر کر جانور کے روپ میں سامنے آئے۔ ایک بھوکے کتے کی طرح جو مردار کو نوچتا ہے، آزاد کشمیر کے عوام کو ایسے واقعات سے بے خبر نہیں رہنا چاہیے جو مقبوضہ کشمیر میں ان کی بہنوں کے ساتھ ہو رہے ہیں۔ ہم تنہا سہی مگر مقبوضہ کشمیر کے بہن بھائیوں کے درد میں شامل ہونے کے لیے ہمیشہ کوشاں رہے اور اب بھی رہیں گے، اسٹیج پلے "دختر کشمیر" اسی جذبے کے تحت لکھا گیا تھا اور اب یہ کتاب پیش ہے جس میں ''کنن پوش پورہ'' اور مقبوضہ جموں وکشمیر میں ''دختر ون کشمیر'' کے ساتھ ہونے والے سلوک میں ان کے ساتھ کھڑے ہونے کا جذبہ اور اس کو کبھی نہ بھولنے کا عہد نامہ ہے اور اس مشکل گھڑی میں، اس سے زیادہ میں کر بھی کیا سکتا ہوں کہ ان

کے غموں اور دکھوں کو یاد رکھا جائے اور ان کے مسائل کو عام کیا جائے، اس وقت شدید دکھ اور افسوس ہوتا ہے کہ جب خود کشمیری، ایسے اہم ترین مقدمے میں بیگانے لگتے ہیں اور دنیا کے دیگر جھمیلوں میں مگن ہیں لیکن ہماری اس کوشش سے دو چار افراد بھی ہم خیال ہو جائیں تو اسے بھی ہم اپنی کامیابی سمجھتے ہیں اور ہم عہد کرتے ہیں کہ ہم ''کنن پوش پورہ'' کبھی نہیں بھولیں گے۔

☆......☆

دوسرا حصہ۔ کشمیر کی سچی کہانیاں

لاعلمی نعمت ہے

نتاشا راٹھر سری نگر کی ان پانچ نوجوان خواتین میں سے ایک ہے جنہوں نے انٹرنیشنل ڈیولپمنٹ ریسرچ سینٹر (IDRC) کے تعاون سے جنوبی ایشیا میں جنسی تشدد اور سزا سے استثنٰی کے ایک پروجیکٹ پر تین سال تک کام کیا ان خواتین نے ''کنن پوش پورہ'' واقعے پر اپنی اپنی کہانیاں لکھیں اور 21 سال بعد اس مقدمے کو دوبارہ زندہ کیا۔ نوجوان کشمیری خاتون نتاشا راٹھر کیا کہتی ہیں، آیئے پڑھتے ہیں:

'' کہتے ہیں لاعلمی نعمت ہے۔ میں نتاشا ہوں اور میں کہتی ہوں، اپنی زندگی کا 20 سال سے زائد عرصہ میں بہت زیادہ خوش اور مایوس کن حد تک لاعلم رہی ہوں۔ ایک ایسے خاندان سے تعلق رکھتے ہوئے جہاں تنازعات اور عسکریت پسندی پر بات چیت کی سختی سے حوصلہ شکنی کی جاتی ہے، مجھے کبھی سمجھ نہیں آیا کہ کشمیر میں ہندوستان کے خلاف مزاحمت کیوں ہے۔ میرے سوالات کا کبھی تسلی بخش جواب نہیں دیا گیا اس لئے میں حقائق سے غافل رہی۔ میرا یہ یقین مستحکم ہونے لگا کہ کچھ لوگ صرف ہنگامہ کھڑا کرنا اور ہنگامہ آرائی کرنا پسند کرتے ہیں۔ انہوں نے وادی کو پرامن کیوں نہیں ہونے دیا؟ کشمیر کے بھارت کا حصہ ہونے پر جھگڑا کیا ہے؟ میں جوابات تلاش نہیں کرنا چاہتی تھی بلکہ صرف وادی میں امن کی خواہشمند تھی۔

1980ء کی دہائی کے آخر اور 1990ء کی دہائی کے اوائل میں پیدا ہونے والے تمام کشمیری بچوں کی طرح، میں بھی اپنے اردگرد خونریزی دیکھتے ہوئے بڑی ہوئی۔ میں سری نگر شہر کے لال چوک علاقے میں رہتی تھی۔ لال چوک یا ریڈ اسکوائر بہت سے تاریخی واقعات کا گواہ رہا ہے جہاں ہندوستان اور کشمیر کے سیاستدانوں نے لوگوں سے

خطاب کیا۔ بظاہر ایسی غیر محفوظ جگہ پر رہنے کا مطلب مردوں کو قتل ہوتے اور خواتین کو بدسلوکی کا نشانہ بنتے دیکھنا تھا۔ میں نے لوگوں کو بم پھٹنے کی آواز سنتے ہی اپنی جان بچانے کے لیے بھاگتے ہوئے دیکھا ہے اور میں بھی ان کے ساتھ بھاگی۔ میں نے کریک ڈاؤن کے دوران گھنٹہ گھر کے قریب اکڑوں بیٹھے مردوں کو دیکھا ہے، میں نے انکاؤنٹر ہوتے دیکھے، اور گولیاں چلنے کی بھیانک آوازوں پر روئی ہوں۔

میں نے یہ جانتے ہوئے شدید گھبراہٹ اور بے بسی محسوس کی کہ میرے والد اپنے معمول کے وقت گھر واپس نہیں آئے تھے اور چپکے سے ان کی حفاظت کے لیے دعا کر رہی تھی، خدا سے وعدہ کیا تھا کہ میں ان کی بحفاظت واپسی کے عوض کوئی بری عادت ترک کردوں گی۔ مجھے خواتین کو اپنے پیاروں کو مرتے دیکھ کر سینہ کوبی کرتے اور چیختے اور چلاتے دیکھنا اچھی طرح یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ مرد معذور ہو رہے ہیں اور لوگ خوف و دہشت کی حالت میں جی رہے ہیں، خوف کی ہوا میں سانس لے رہے ہیں۔ آپ یقین سے نہیں کہہ سکتے تھے کہ جیتے جی واپس اپنے گھروں کو جاسکیں گے۔ کریک ڈاؤن ہوسکتا ہے، آپ کو عسکریت پسند سمجھا جاسکتا ہے، موقع پر گولی ماری جاسکتی ہے یا اٹھا کر لے جایا جاسکتا ہے۔ ملٹری والے خوف کی علامت تھے۔

میں بھی مسلح افواج سے خوفزدہ تھی۔ میں ان کو دیکھ کر ہمیشہ ڈر جایا کرتی تھی حالاں کہ وہ یہاں ہماری حفاظت کے لیے تھے اور وہ تمام بہادر کام کرتے تھے جو بہادر سپاہیوں کو کرنا ہوتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک دن اسکول سے واپسی پر میں نے راستے میں پتھراؤ ہوتے دیکھا۔ ایک لڑکی کو مسلح افواج نے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا اور مرنے کے لیے چھوڑ دیا۔ مجھے ٹھیک سے اصل تفصیلات تو یاد نہیں لیکن اس وقت اپنے ہی تراشیدہ خول میں بند ہونا یاد ہے۔ تب میری عمر 12 سال تھی اور مجھے اس دن احساس ہوا کہ میں بھی ایک لڑکی ہوں اور کمزور ہوں۔ میں وردی پہنے مردوں کی طرف سے عصمت دری کے خوف میں رہتی

تھی گو کہ اس وقت مجھے عصمت دری کی ہولناکی کی اتنی سمجھ نہیں تھی پھر بھی میں جانتی تھی کہ یہ بہت زیادہ بری چیز ہے اور اس پر بات نہیں کی جاسکتی۔ پھر خاموشی کا ایک وقفہ آیا جب اس تنازعہ کو چپ کا لبادہ پہنا دیا گیا اور چیزیں 'معمول' لگنے لگیں۔ زندگی آگے بڑھتی گئی۔ میں نے پرواہ کرنا چھوڑ دیا۔ میں تب بیس سال کی تھی۔ میرے پاس وہ سب کچھ تھا جس کا ایک متوسط گھرانے میں تصور کیا جاسکتا تھا۔ مجھے صرف اپنی پڑھائی میں اچھی کارکردگی دکھانے، اچھی ڈگری کے حصول اور اپنی اچھی زندگی گزارنے کی فکر تھی۔

لیکن کتابوں سے میری محبت مجھے کشمیر واپس لے آئی۔ میں نے شوق سے پڑھنا شروع اور چیزوں کو سمجھنا شروع کیا۔ میں نے موت اور تباہی کی خوفناک کہانیاں دیکھیں اور میں سمجھ گئی کہ کس طرح کشمیر کا استحصال کیا جارہا ہے، لوگوں کی المناک حالت اور ہندوستان اور کشمیر کے درمیان زبردست عدم مساوات جو ہر گزرتے دن کے ساتھ بڑھتی جارہی ہے۔ میں نے یہ دیکھنا شروع کیا کہ اس آزمائش میں عام لوگوں کو کس قدر نقصان اٹھانا پڑا، جس کی بدترین شکل گہری جڑیں پکڑ لینے والی خوف کی نفسیات تھی۔ میں نے دیکھا کہ کشمیری واقعی مظلوم ہیں۔ مجھے سمجھ آ گئی کہ 'ہم کیا چاہتے ہیں، آزادی' کی آوازوں کی گونج ہماری گلیوں میں اور اس کی بازگشت ریاست میں کیوں سنائی دیتی ہے۔

لیکن جب میں نے ان حقائق کو سمجھا اور لوگوں کے ساتھ ہمدردی کا اظہار کیا تو اپنے اندر تصادم محسوس کیا۔ میری ماں ہندوستانی اور میرے والد کشمیری، میں اصل میں کون تھی؟ میں نے ہندوستان سے وفاداری کی یا کشمیریوں کے مقصد سے؟ لمبے عرصے تک مجھے یقین رہا کہ اس کا جواب معلوم کرنے میں کئی سال لگیں گے۔ میں اب بھی کبھی کبھار خود کو منقسم محسوس کرتی ہوں۔

جموں و کشمیر پر اپنی مختصر تحقیق کے دوران، مجھے ''کنن پوشپورہ'' کے بارے میں ایک کہانی ملی، جو خواتین اور مردوں کی کہانی ہے جو ایک سرد رات مسلح افواج کے ہاتھوں

اجتماعی عصمت دری کا شکار ہوئیں جس کی تاریکی کبھی کم نہیں ہوئی۔ یہ جان کر میں خوفزدہ اور مشتعل تھی۔ ''کنن پوشپورہ'' کی خواتین کی حالت زار کا میں صرف تصور ہی کر سکتی تھی۔ عصمت کھونے کا داغ اور اس کے اوپر جھوٹ بولنے کے الزامات کے ساتھ مجھے یہ سب سراسر غیر منصفانہ اور ظالمانہ لگا۔ میں ہمیشہ اس سوچ کے خلاف لڑی ہوں کہ جن خواتین کی عصمت دری یا ان کے ساتھ زیادتی ہوتی ہے انہیں اسے خاموشی سے برداشت کرنا چاہیئے۔ آخر انصاف کو یقینی بنانے کا کوئی نہ کوئی طریقہ تو ہونا چاہیے۔ ہمیں کوئی راستہ تلاش کرنا ہوگا۔ آخر کب تک عورتوں کے خلاف تشدد کو جنگ کے نتائج کے طور پر جائز قرار دیا جاتا رہے گا؟ ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری کیس کو دوبارہ کھولنے کی عرضی داخل کرنا، اس واقعہ کے متاثرین کے لیے کچھ کرنے کا موقع تھا۔ مسلح افواج کی اس بدسلوکی پر ہم نے آپس میں طویل بحث کی تھی۔ یہ کچھ ٹھوس قدم تھا۔ اور ایک پدرشاہی معاشرے کے اندر، جو زیادہ تر مردوں کے زیر کنٹرول ہے، جہاں خواتین کو یہ یقین دلایا گیا کہ ان کا صرف ایک غیر فعال کردار ہے، نوجوان خواتین کے ایک گروپ کی طرف سے یہ ایک پہل تھی جس کے نتیجے میں یہ نوجوان خواتین ناجائز تسلط کے خلاف اٹھ کھڑی ہوئیں، 'سکیورٹی' فورسز کے ذریعے کئے گئے یک حقارت آمیز جرم کے خلاف متحد ہو کر آواز بلند کرنا غیر معمولی بات تھی۔ یہ خواتین باہمت اور مضبوط تھیں۔ دیگر درخواست گزاروں کی خوداعتمادی اور عزم میرے لیے متاثر کن تھا۔ میں اس کا حصہ بننا چاہتی تھی، حالاں کہ مجھے علم تھا کہ یہ میرے لئے مصیبت بن سکتا ہے۔ لیکن کسی نہ کسی طرح، اس سب سے کوئی فرق پڑتا محسوس نہ ہوا۔ میں نے ہمت کی اور پٹیشن پر دستخط کر دیئے۔

وقت نہ تو زخموں کا مرہم ہے اور نہ ہی یہ کوئی حل ہے۔ ان خواتین پر گزری دو دہائیوں سے زیادہ کی اذیت اور ناانصافی کو بھلایا نہیں جا سکتا۔ ہمیں کنن پوش پورہ یاد ہے اور ہم بھولیں گے نہیں۔ (نتاشا راٹھر)

آرمی انکل

میں اپنے بچپن میں سڑک پر کھڑے فوجی جوانوں کو 'آرمی انکل' سمجھتی تھی۔ وہ ہماری حفاظت کے لیے موجود تھے، کم از کم اس وقت میرا تو یہی خیال تھا، میرا بچپن بہت محفوظ تھا، سری نگر کے ایک متوسط گھرانے میں پیدا ہوئی، مشنری اسکول میں تعلیم حاصل کی۔ اسکول بس مجھے گھر سے لے جاتی اور ہر روز واپس چھوڑنے آتی۔ آج میں ایک وکیل ہوں، اور میں نے ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری کیس کو دوبارہ کھولنے کے لیے نوجوان خواتین کے ایک گروپ کی طرف سے دائر PIL کا مسودہ تیار کرنے میں جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے ایڈووکیٹ اور کنوینئر جموں وکشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی پرویز امروز کی معاونت کے فرائض انجام دیئے ہیں۔ میں اپنی قسمت پر شکر ادا کرتی ہوں جس نے مجھے پرویز امروز کے جونیئر وکیل کے طور پر کام کرنے کا موقع دیا جو ہماری وادی میں جہاں قانون خلاف ورزیاں بہت عام لیکن ان کے خلاف لڑنے یا قانونی موقف اختیار کرنے کی ہمت نایاب ہے، انسانی حقوق سے جڑے ایک جانا پہچانا نام ہیں لیکن ہمیشہ سے میری یہ سوچ نہیں تھی۔

1996ء میں جب میں دوسری جماعت میں تھی، اسکول سے واپسی پر ہماری اسکول وین کو پولیس کالونی، بمنہ کے قریب روکا گیا۔ فوجی جوانوں نے بس کو گھیر لیا اور ہمارے ڈرائیور کو اترنے کو کہا۔ بس میں پانچ بچے سوار تھے جن کی عمریں سات یا آٹھ سال کے لگ بھگ تھیں۔ ہم سب خوفزدہ اور فکر مند تھے کہ 'فوجی انکل' ناراض ہیں۔ انہوں نے ہمارے ڈرائیور سے کہا کہ وہ اسے آگے نہیں جانے دیں گے اور ہماری بس کو چیک کرنے

لگے۔ مجھے واضح طور پر یاد ہے کہ ہمارے بس ڈرائیور نے التجا کی تھی کہ ہم اس کے ذمہ دار ہیں اور وہ ہمیں وہاں نہیں چھوڑ سکتا۔ فوجی جوان اسے ہمارے ساتھ ہمارے گھروں تک جانے کی اجازت دینے سے گریزاں تھے۔ یہ ایک 'کریک ڈاؤن' تھا؛ پورے علاقے کو گھیرے میں لے کر سرچ آپریشن جاری تھا۔ ہم نے اپنا بیگ اٹھایا اور بس سے کود پڑے۔ ڈرائیور نے ہمیں کہا کہ ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑیں، تیز چلیں اور راستے میں فوجی جوانوں سے بات نہ کریں۔ 'اگر کوئی فوجی آپ کو بلائے تو اس کے پاس مت جانا۔ اگر آپ خوف محسوس کریں، تو صرف چیخیں، ہمیں تنبیہ کے لیے یہ اس کے آخری الفاظ تھے۔ میں ہنگامہ آرائی کی وجہ نہیں سمجھ سکی۔ یقین کریں اگر اس کی یہ ہدایات نہ ملتیں تو شاید ہم اتنے خوفزدہ نہیں ہوتے۔ جیسے ہی ہم ایک دوسرے کا ہاتھ پکڑ کر چلنے لگے، محاصرے کے آغاز والے مقام سے چند گز کے فاصلے پر ایک فوجی جوان نے ہمیں پکار کر کہا، 'جلدی چلو کسی کی دادی سڑک پر انتظار کر رہی ہے۔ وہ بہت شور کر رہی ہے۔''

میری تمام سہیلیوں نے میری طرف دیکھا اور کہا، ضرور منزہ کی دادی ہیں۔ میرے گال شرمندگی سے سرخ ہوگئے۔ میری دادی ہمیشہ یہی کرتی تھیں۔ وہ خاندان کے ہر فرد کے بارے میں پریشان ہوجایا کرتی تھیں، خاص طور پر جب فوج آس پاس نظر آتی۔ تب میں ان کے خوف کو کبھی نہیں سمجھی۔ میں اس وقت یہی سوچتی تھی کہ 'فوج ہماری حفاظت کے لیے یہاں موجود ہے، لہٰذا ان کے ساتھ تعاون کریں اور کوئی ایشو نہ بنائیں۔'

جہاں تک محاصرے کا سوال تھا اس کے متعلق میں نے اپنے بزرگوں سے جو کچھ سیکھا وہ یہی تھا کہ خاموش رہنا اور اپنی تمام قیمتی چیزوں کی حفاظت کرنا، جو میرے لیے میری گڑیا تھیں۔ جب میں تقریباً 14 سال کی ہوئی تو میں نے ''کنن پوشپورہ'' کے بارے میں ایک مضمون پڑھا۔ مجھے اچانک بس ڈرائیور کی طرف سے ہمیں دی گئی ہدایات کے پیچھے چھپا خوف اور وہ شور شرابا جو میری دادی نے اس دوپہر کو کیا تھا سمجھ آ گیا۔ مضمون پڑھنے کے بعد

میرا پہلا ردعمل غصہ اور بے بسی تھا۔ میں بس اتنا جانتی تھی اور سمجھ سکتی تھی کہ خوفناک جرائم کا ارتکاب کیا گیا تھا۔

اس کے بعد سے میں نے فوجی انکل کو 'محافظ' کے طور پر نہیں دیکھا البتہ میرے پاس اپنے غصے کا اظہار کرنے کا کوئی ذریعہ بھی نہیں تھا۔ میں نے تو بس یہی سوچا کہ ہم ناراض ہونے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکتے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ میں نے اپنی رائے قائم کی اور وہ یہ تھی: اگر ہندوستانی ریاست ہمیں اپنے ساتھ رکھنے پر اتنی بضد ہے تو ہمیں بھی اسے جیسے تیسے سہنا چاہیے۔ دسویں جماعت میں، میرے اسکول نے کپواڑہ ضلع میں انتخابات کی نگرانی کے لیے سفر کے دوران انسانی حقوق کی کارکن آسیہ جیلانی کی موت پر سوگ منایا۔ مجھے یاد ہے کہ میرے ریاضی کی استاد ہمیں بتا رہی تھے کہ وہ کتنی ذہین طالبہ تھی اور اس کی موت پر وہ کتنے غمزدہ تھے۔ انہوں نے یہاں تک کہا، 'تم بچے نہیں جانتے کہ تمہارے اسکول کی دیواروں کے آگے کیا ہو رہا ہے، ہم حالت جنگ میں ہیں۔' جس پر میں بس یونہی بول اٹھی کہ جناب، انہیں وہاں جانے کے لیے کہا کس نے تھا؟

'اب مجھے احساس ہوا ہے کہ میں کتنی نادان تھی کہ کوشش کرنے سے پہلے ہی ہار مان لی تھی لیکن جیسے ہی میں نے اپنے اسکول اور گھر کی محفوظ دیواروں سے پرے دیکھا، میری دنیا بدل گئی۔ جب ہم نے خاموش رہنے اور بھارت پر بھروسہ کرنے کی راہ چنی تو ہمیں دھوکہ دیا گیا۔ ہم نے آواز اٹھائی تو ہم کچلے گئے۔ خاموشی نہیں مزاحمت ہمارا راستہ ہے۔ انصاف کی جدوجہد جاری ہے اور اسے کبھی رکنا نہیں چاہیے۔ مزاحمت ہی بقا ہے۔ میں ایک آزاد خیال خاندان سے تعلق رکھتی ہوں؛ میرے والد شکر ہے کہ مردانہ بالادستی کے علمبردار نہیں ہیں۔ انہوں نے جموں وکشمیر پولیس ڈیپارٹمنٹ میں خدمات انجام دیں۔ میں کبھی بھی ان کے ساتھ تمام مسائل پر بات کر سکتی تھی۔ وہ ان لوگوں میں شامل نہیں جو یہ سمجھتے ہوں کہ کچھ سیکھنے یا بولنے کیلئے میری عمر بہت کم ہے۔ مجھے اپنے بہت سے سوالوں

کے جواب ان کے ذریعے ملے اور میرے بہت سے سوالات ان کی وجہ سے پیدا ہوئے۔

ہم ان لوگوں میں شامل تھے جنہیں دارالحکومت کی منتقلی کی وجہ سے چھ ماہ کشمیر اور چھ ماہ جموں میں رہنا پڑتا تھا۔ مجھے وادی کی نسبت جموں میں رہنے میں زیادہ مزہ آتا تھا۔ آخر ہم وہاں رات گئے تک باہر رہ سکتے تھے، تھیٹر جا سکتے تھے، باہر رات کا کھانا کھا سکتے تھے اور بہت زیادہ مزے کر سکتے تھے۔ یہ سب کشمیر میں ناممکن تھا جہاں کوئی شام 7 بجے کے بعد باہر نکلنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔ سب سے اہم بات، میں چھٹیوں کے دوران اپنے رشتہ داروں سے ملنے جا سکتی تھی۔ میرے ننھیالی رشتہ دار سری نگر کے قلب لال چوک پر رہا کرتے تھے۔ اس مقام نے بڑی تعداد میں فدائی حملوں، بم دھماکوں اور ہلاکتوں کا مشاہدہ کیا ہے، اور کشمیر کی تاریخ میں اس جگہ کا انتہائی اہم کردار ہے۔ اس جگہ تک پہنچنا ہمیشہ بہت آسان تھا کیوں کہ اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ آپ نے کس قسم کی ٹرانسپورٹ کا انتخاب کیا ہے، آپ کو بحر حال لال چوک سے گزرنا پڑے گا لیکن 1990ء کی دہائی میں یہ اتنا آسان نہیں تھا۔

مجھے کئی مواقع یاد ہیں جب تشدد کی وجہ سے ہمیں لال چوک سے واپس جانے پر مجبور کیا گیا تھا۔ مجھے ان سب چیزوں سے نفرت تھی اور ان سے بھی نفرت تھی جو یہ سب کر رہے تھے لیکن مجھے نہیں معلوم تھا کہ کس پر الزام لگایا جائے گا۔ میں صرف اتنا جانتی تھی کہ میں اپنے ماموں کے گھر کے ارد گرد دھماکوں اور خونریزی کے بغیر معمول کی چھٹیاں گزارنے کی مستحق تھی۔ مجھے یاد ہے کہ ایک بار ٹیکسی اسٹینڈ پر کھڑی اپنے رشتہ داروں کا انتظار کر رہی تھی۔ ہم بانڈی پورہ میں ایک شادی کی تقریب میں شرکت کے لیے جا رہے تھے۔ انہیں دیر ہو چکی تھی۔ جب وہ پہنچے تو میری والدہ نے ان سے پوچھا کہ انہیں تاخیر کس وجہ سے ہوئی؟ ان کا کہنا تھا کہ ان کے علاقے کا ایک لڑکا جسے فوج نے گرفتار کر کے تشدد کا نشانہ بنایا تھا، زخموں کی تاب نہ لاتے ہوئے چل بسا۔ اس وقت یہ بات اہم نہیں لگ رہی تھی، ہمارے لئے تو سب سے اہم بات یہ تھی کہ ہمیں شادی میں دیر ہو جائے گی۔ جی ہاں حیران نہ ہوں،

ہم کشمیر میں 1990ء کی دہائی کے بچے تھے، جہاں خون اور دھماکوں کی روزانہ خوراک نے ہمیں انہیں سہنے کے قابل اور کم حساس بنا دیا تھا۔

میں ہندوستان اور پاکستان کے کرکٹ میچوں کے دوران اپنے کزنز کو چھیڑا کرتی اور ہندوستان کی حمایت کرتی۔ تب میں اسی طرح سوچتی تھی لیکن حیرت کی بات یہ ہے کہ جب پاکستان کی جیت ہوتی تو میرے والد اور پولیس کالونی جموں میں ان کے ساتھی بھی خوش ہوتے۔ جیسے جیسے میں بڑی ہوئی مجھے سمجھ آتی گئی کہ آپ خواہ کوئی ہوں، کسی بھی عہدہ پر فائز ہوں یا کسی بھی ضابطہ اخلاق کی پیروی کرتے ہوں، آپ کسی ہندوستانی کی کھال پہن سکتے ہیں لیکن صرف ایک خراش پڑتے ہی آپ کا لہو 'پاکستان' پکار اٹھتا ہے۔ اب جب کہ میرے پاس تمام جوابات ہیں، مجھے اب کوئی حیرت نہیں ہوتی جب میں کمرہ عدالتوں میں وکلاء کو یہ پوچھتے دیکھتی ہوں: 'پاکستان کا اسکور کیا ہوا؟ کتنے آؤٹ ہوئے؟ شاہد آفریدی کھیل رہا ہے؟'' یہ سوالات عام طور پر ریاست کے ہر محکمے اور بہت سی دوسری جگہوں پر سننے کو ملیں گے۔

ایک لڑکی کے طور پر، جب میں نے کیس پر کام شروع کیا، مجھے احساس ہوا کہ میرے گرد حفاظتی حصار ٹوٹ چکا ہے۔ میرا خاندان کتنا ہی لبرل کیوں نہ ہو، ریپ کیس پر کام کرنے والی لڑکی کو قبول کرنا معاشرے کے لیے مشکل تھا۔ جب میں نے کورٹ پریکٹس میں شمولیت اختیار کی تو میں نے سیکھا کہ 'ریپ' ایک ایسا لفظ ہے جسے عوامی طور پر استعمال نہیں کیا جانا چاہیے۔ ''کنن پوش پورہ'' کیس میں گواہوں کے پولیس بیانات کا اردو ترجمہ کرنے میں، میں نے ایک سینئر مرد وکیل کی مدد لی۔ جیسے ہی وہ دستاویزات سے متن پڑھتا، خاموشی سے لفظ عصمت دری کی جگہ 'ڈیش' لگا دیتا تھا۔ اسے نوٹ کرتے ہوئے میں بھی اثبات میں سر ہلا دیتی۔ میں نے محسوس کیا کہ اس کے نزدیک 'ریپ' کا لفظ مخالف جنس کے فرد کے سامنے اونچی آواز میں نہیں کہا جانا چاہیے، خواہ یہ کیس پر کام کرنے والے ساتھی وکیل

ہی کیوں نہ ہو۔

''کنن پوش پورہ'' کیس میں میری شمولیت نے شروع میں میرے خاندان سمیت سب کو پریشان کر دیا۔لیکن جیسے جیسے دن گزرتے گئے اور میں نے انہیں گاؤں والوں کے رہنے کے طریقے اور اجتماعی عصمت دری کے بعد انصاف کے لیے جدوجہد ان کے بارے میں مزید بتانا شروع کیا، انہوں نے مجھے اس مقصد کے ساتھ کھڑے ہونے کی ترغیب دینا شروع کی۔ ''کنن پوش پورہ'' کی سماعت کے دنوں میں، جب مجھے کپواڑہ کی عدالت میں جانا ہوتا، میری ماں مجھ سے پہلے جاگتی تھیں اور اس بات کو یقینی بناتیں کہ میں وقت پر جاگوں۔ میرے ذریعے انہیں شاید اس احساس تقصیر کے بوجھ سے چھٹکارا حاصل کرنے کا ایک طریقہ مل گیا تھا جو ہر کشمیری عورت اٹھائے پھرتی ہے کہ وہ کنن پوش پورہ کی خواتین اور ان جیسی دیگر خواتین کے لیے کچھ نہیں کر سکی۔ (منزہ راشد)

☆......☆

یتیم بیٹی

کشمیر میں سبھی کے پاس سنانے کے لیے کوئی کہانی ہے اور میں اس سے مبرا نہیں ہوں۔ میرا شمار کشمیر کے یتیموں کی طویل فہرست میں ہوتا ہے۔ میں نے اپنے والد کو تین سال کی کچی عمر میں کھو دیا۔ میرے ذہن کے کسی نہ کسی گوشے میں ان کی ایک دھندلی سی تصویر ہے اور میں اسے اپنی یادوں میں زندہ رکھنے کی ہر ممکن کوشش کرتی ہوں۔ میں اکثر ان کی پرانی تصویروں پر نظر دوڑاتی ہوں، اور ہر شام سونے سے پہلے دن بھر میں ہونے والی ہر چیز پر ان کی تصویر سے بات کرتی ہوں ۔ 27 فروری 1992ء کو میرے والد کو بارڈر سیکورٹی فورس (BSF) کا دستہ اٹھا کر لے گیا۔ انہیں فوری ہرینیواس تفتیشی مرکز لے جایا گیا، جو سری نگر کے سب سے بدنام ٹارچر چیمبروں میں سے ایک تھا اور اب ایک سرکاری گیسٹ ہاؤس میں تبدیل ہو چکا ہے۔

یہ خیال کیا جاتا ہے کہ اس ٹارچر سینٹر کے نیچے تشدد کے دوران مارے گئے کشمیریوں کی بے نشان قبریں ہیں مگر شواہد کو تباہ کرنے کی ایک عجیب کوشش میں ریاست نے اسے وی آئی پی گیسٹ ہاؤس میں تبدیل کر دیا ہے۔ مجھے پختہ یقین ہے کہ میرے والد کی چیخیں اب بھی وہاں گونجتی ہیں۔ اس ٹارچر چیمبر کے باہر گلی سے گزرتے ہوئے مجھے تشدد کا نشانہ بننے والوں کی چیخیں سنائی دیتی ہیں۔ ایسا لگتا ہے کہ تشدد کرنے والے، وہاں قید افراد کو قتل کرنے کے باوجود، انہوں قید رکھنے اور ان کی آواز کو خاموش کرنے میں ناکام رہے ہیں۔

ہرینیواس میں، میرے والد کو بی ایس ایف کے سپاہیوں نے بدترین تشدد کا نشانہ بنایا اور آخری مراحل میں انہیں آرمی ہسپتال لے جایا گیا۔ جب میرے گھر والے انہیں دیکھنے

ہسپتال گئے تو سب ان کی حالت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ان پر بے دریغ تشدد جان لیوا ثابت ہوا۔میرے خاندان نے سنٹرل ریزرو پولیس فورس (سی آر پی ایف) کے اس وقت کے ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل کے کے ورما سے درخواست کی کہ وہ میرے والد کو سول ہسپتال منتقل کرنے کی اجازت دیں لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ 10 مارچ 1992ء کو جب میں اپنی گڑیا سے کہیں کھیل رہی تھی اور ارد گرد کیا ہو رہا تھا اس سے غافل تھی جب میں نے اپنے والد کو ہمیشہ کے لیے کھو دیا۔ 2002ء تک، مجھے اس بارے میں کچھ پتہ نہیں تھا کہ میرے والد کو کیسے قتل کیا گیا اور اس کے بعد کیا ہوا۔

میری ماں نے کبھی اس بارے میں بات نہیں کی۔انہوں نے اپنے وسیع اور دلیر قلب کے اندر ایک گہرے راز کے طور پر اس تفصیل کو میرے ساتھ شیئر نہ کرنے کا انتخاب کیا اور ان کے پاس مجھے اس تلخ سچائی سے دور رکھنے کا جواز بھی تھا۔جیسے جیسے میں بڑی ہوئی، میں نے چیزوں کو سمجھنا شروع کر دیا، خاص طور پر کشمیر کے حالات اور تنازعات کے بارے میں، لیکن مجھے اپنے والد کی موت کی حقیقت کا ابھی تک علم نہیں تھا۔جب میں 14 سال کی تھی تو مجھے اردو ہفت روزہ چٹان کا ایک پرچہ ملا جو میری ماں نے اپنی الماری میں چھپا رکھا تھا۔تب ضبط کے تمام بندھن ٹوٹ گئے۔ایک سرخی پر میری نظر ٹھہر گئی جس میں لکھا تھا، 'اُن سے بار بار پوچھا گیا سامان (ہتھیار) کہاں ہے؟۔یہ کہانی میرے والد کے بارے میں تھی۔

میں نے پورے خبری تراشے کو بدقت تمام حرف بہ حرف پڑھا کیوں کہ میری اردو اتنی اچھی نہیں تھی مگر صرف خوب یقین کرنے کے لیے، میں نے اسے دوسری اور پھر تیسری بار پڑھا۔اپنے آنسوؤں کے باعث میرے اندر کچھ دیکھنے کی تاب نہیں رہی تھی۔اس لمحے گویا میرے لیے سب کچھ ٹھہر گیا تھا۔میں نے اپنے خاندان اور دیگر رشتہ داروں سے غصے سے بھرے سوالات کئے۔مجھے معلوم ہوا کہ میرے والد صرف دہشت گردی کا شکار ہی نہیں بلکہ وہ ایک ہیرو تھے، ایک آزادی پسند، جو آزادی کے لیے جیے اور اس یقین کیلئے جان دی۔میرے

لئے وہ لمحہ غم ناک ہی نہیں باعث فخر اور محرک تھا۔پھر میں سوچنے لگی: ''میں اپنے والد کے قتل کا بدلہ کیسے لوں؟''

میں نے اپنے ارد گرد نظر دوڑائی تو میں نے بہت سے ایسے لوگوں کو دیکھا جن کی ایسی ہی کہانیاں ہیں جس سے حوصلہ پا کر میری بدلہ لینے کی خواہش مزید گہری ہوگئی اور میں نے مجرموں کو سزا دلانے اور اپنے خاندان کو انصاف دلانے کے ذرائع تلاش کرنے شروع کئے۔میرے اہل خانہ نے جانے پہچانے مجرموں کے خلاف ہائی کورٹ میں مقدمہ دائر کیا تھا لیکن ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی۔ان پر ابھی مقدمہ چلنا باقی ہے۔کشمیر میں ہندوستانی عدلیہ کے کام نہ کرنے اور انصاف کے حصول کے ناممکن ہونے کا احساس اتنا شدید ہوگیا کہ بعض مواقع پر میں نے عسکریت پسند بننے کا سوچا۔

2013ء میں، انسانی حقوق کے حوالے سے ہونے والی ایک ورکشاپ میں مجھے ایک رپورٹ ملی: ''مبینہ مجرم۔ہندوستان کے زیر انتظام کشمیر میں انسانی حقوق اور انصاف پر بین الاقوامی عوامی ٹریبونل اور گمشدہ افراد کے والدین کی تنظیم کی طرف سے جموں و کشمیر میں ہوئے ہولناک جرائم سے استثنیٰ کی کہانیاں''۔اس میں میرے والد کا مقدمہ (مقدمہ نمبر 78) درج تھا۔رپورٹ میں درج ذیل افسران کا تذکرہ کیا گیا ہے جو میرے والد کے تشدد اور قتل میں ملوث تھے: ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل (ADG) کے۔کے ورما، ہرینیواس تفتیشی مرکز کے انچارج؛ کمانڈنٹ کے سی شرما، 75ویں بٹالین (بی ایس ایف)؛ اور ڈپٹی کمانڈنٹ روہت، 75ویں بٹالین بی ایس ایف۔

میں نے اس وقت خود کو انتہائی بے بس محسوس کیا کہ ان لوگوں کے ملوث ہونے کا علم ہونے کے باوجود تشدد کے ذمہ داروں کے خلاف کارروائی نہیں کی گئی۔دسمبر 2012ء میں، جب دہلی میں ایک 23 سالہ فزیوتھراپسٹ کی عصمت دری ایک قومی مسئلہ بن کر ابھری تو میں نے ''کنن پوشپورہ'' اور مجرموں کو وردی میں عصمت دری کے گھناؤنے جرم میں دیئے گئے

استثنیٰ کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ دہلی میں عصمت دری کرنے والوں کے خلاف مقدمہ چلانے کے لیے فاسٹ ٹریک عدالتیں اور کمیٹیاں قائم کی گئیں لیکن کشمیر میں عصمت دری کو ہمیشہ جنگ کے ہتھیار کے طور پر استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ یہ 23 فروری 2013ء کا دن تھا، ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری اور تشدد کی 22ویں برسی تھی جب ہم نے جے کے سی سی ایس کے ایڈوکیٹ پرویز امروز کے ساتھ کیس پر بات چیت شروع کی اور آخر کار اس کیس کو دوبارہ کھولنے کے لیے ایک عوامی مفاد کی عرضی (PIL) دائر کرنے کا خیال آیا۔

ہمارے دوستوں کی طرف سے تجاویز آنے لگیں کہ ہم جو پٹیشن دائر کرنا چاہتے ہیں اس میں بڑی تعداد میں خواتین کو شامل کرنا چاہیے۔ ہم نے اس کے لیے ایک مہم شروع کی۔ چونکہ ہمارا مقدمہ بھارتی فوج کے خلاف تھا، اس لیے خواتین کو پٹیشن پر دستخط کرنے کے لیے راضی کرنا آسان نہیں تھا۔ انہی میں بعض سرکاری ملازم بھی تھیں اور انہیں نوکری سے نکالے جانے کا خدشہ تھا، کچھ کو اپنی جان کا خوف تھا اور ان میں سے کچھ اپنے کیریئر کے بارے میں فکر مند تھیں۔ میں نے اپنے گھر والوں سے بھی اس کیس پر بات کی۔ میری ایک ریٹائرڈ خالہ درخواست پر دستخط کرنے میں دلچسپی رکھتی تھیں لیکن وہ فکر مند تھیں کہ کہیں ان کی پنشن نہ روک دی جائے۔ کسی نہ کسی طرح میں انہیں یہ باور کرانے میں کامیاب رہی کہ ظلم کے خلاف آواز اٹھانا ضروری ہے۔ ہمیں درخواست گزاروں کے ساتھ رابطہ قائم کرنے اور کاغذات پر دستخط کرانے میں دو مہینے لگے بالآخر، 20 اپریل کو، 50 کشمیری خواتین جن میں اساتذہ، طالب علم، صحافی، انسانی حقوق کے کارکن، وکلاء اور دیگر پیشہ ور افراد شامل تھیں، ہائی کورٹ میں PIL دائر کی جس میں مطالبہ کیا گیا کہ پولیس اجتماعی عصمت دری اور تشدد کیس کی دوبارہ تحقیقات کرے۔ ''کنن پوشپورہ'' کیس کی پیروی کرنے کا میرا محرک کشمیر میں ہندوستانی ریاست کے مظالم کو بے نقاب کرنا ہے۔

ہائی کورٹ میں کیس کی پہلی سماعت کے بعد (جس میں PIL منظور نہیں کی گئی تھی)

ہم، 12 درخواست گزاروں کا ایک گروپ، گاؤں والوں کو PIL کے بارے میں مطلع کرنے کے لیے ''کنن پوشپورہ'' گیا۔ ہم بہت گھبرائے ہوئے تھے، اور یقین نہیں تھا کہ کیا توقع کی جائے۔ گاؤں والے یہ جاننے کے لیے بہت متجسس تھے کہ ہم کون ہیں، ہم کیا چاہتے ہیں، اور ان کے پاس ہمارے لئے بہت سے سوالات تھے۔ وہ ہمیں گاؤں کے سردار کے گھر لے گئے۔ انہوں نے گفتگو کا آغاز یہ کہہ کر کیا کہ گزشتہ 22 سالوں میں گاؤں میں بہت سے صحافی، کارکن اور فوٹوگرافر آئے، لیکن لوگوں نے صرف ان پر گزرے المیے سے پیسہ اور شہرت کمائی اور چلے گئے، کسی نے ان کی مدد نہیں کی تھی۔ ہم نے انہیں کیس کے بارے میں سمجھایا، اور انہیں یقین دلایا کہ ہم ان کے اپنے لوگ ہیں اور یہ ہماری اجتماعی جدوجہد ہے۔

گاؤں کے بزرگوں کو یقین تھا کہ اس کیس میں ہمارا کوئی ذاتی مفاد نہیں ہے۔ انہوں نے ہم سے اگلی سماعت کی تاریخ پوچھی اور کہا کہ وہ اس کے لیے آئیں گے۔ کچھ دیر بعد انہوں نے ہمیں گاؤں کی عورتوں سے ملنے کو کہا۔ جب ہم عصمت دری کا نشانہ بننے والی لڑکی سے ملے تو اس نے ہم سے اپنے موبائل بند کرنے کو کہا تاکہ کوئی بھی اس کی تصویر نہ لے سکے۔ پھر اس نے اپنی کہانی سنائی کہ کس طرح فوج کے جوان، گاؤں کے مردوں کو گھروں سے باہر لے گئے اور ان پر تشدد کیا اور اس دوران انہوں نے اس کی عصمت دری کی۔ اس نے ہمیں بتایا کہ یہ پورے گاؤں کے لیے ایک ڈراؤنا خواب تھا اور ابھی تک وہ اس رات کو یاد کر کے سہم جاتے ہیں۔

کشمیر میں بہت سے لوگ ہم سے پوچھتے رہتے ہیں کہ ہم نے درخواست کیوں دائر کی ہے، ہم ان کی اپنی عدالتوں میں ظالموں سے انصاف کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں اور ہمارے کیریئر کا کیا بنے گا۔ ہم نے پٹیشن اس لیے دائر نہیں کی کہ ہمیں نظام سے انصاف کی امید ہے بلکہ ہندوستانی فوج کو جوابدہ بنانے کے لیے، اسے یہ سمجھانے کے لیے کہ اس کے اہلکار بچ کر نہیں جا سکتے کہ دوبارہ وہی جرم دہرا سکیں۔ ہماری جدوجہد نتائج سے قطع نظر مزاحمت کے کلچر کو

فروغ دینے کے لیے ہے جہاں عوام کی طرف سے جرم سے استثنیٰ پر سوال اٹھائے جائیں، جہاں ہم جبر کے سامنے خاموش نہیں رہیں گے۔ یہ خوف کہ ہمارے ساتھ ایسا کچھ ہوسکتا ہے اس خوف سے کہیں زیادہ ہے کہ ہمارا کیریئر تباہ ہو جائے گا۔ عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنا ہر دیگر چیز سے زیادہ اہم ہے۔ (ثمرینہ مشتاق)

☆......☆

بڑی فوجی چھاؤنی

میں نے ہمیشہ سے ہر قسم کی صورتحال اور حالات میں خود کو ناموافق اور غیر مناسب محسوس کیا ہے۔ مجھے یاد ہے جب میں نے پہلی بار لفظ 'ریپ' سنا تھا تو میں پانچویں جماعت میں اپنی کلاس میں بیٹھی تھی۔ میں نے اپنے پیچھے کچھ قہقہوں کی آواز سنی۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے اس کا مطلب جاننے کیلئے کس تیزی کے ساتھ اپنی جیب سے آکسفورڈ ڈکشنری نکال کر دیکھی۔ کیا مرد اتنا ظالم ہوسکتا ہے؟ ان عورتوں کا کیا ہوگا جن کی عصمت دری ہوتی ہے؟ کیا وہ بھی اتنی ہی ذمہ دار ہیں؟' میں نے ان سوالات کے بارے میں سوچنے میں کافی وقت صرف کیا ہوگا (شاید لنچ بریک تک) اور پھر میں نے دوسری اہم چیزوں پر توجہ مرکوز کی (ہاں، عصمت دری میرے لنچ کی طرح اہم نہیں تھی)۔ لیکن اسی لمحے مجھے معلوم ہوا کہ 'ریپ' ایک ایسا لفظ ہے جسے کسی کے سامنے استعمال کرنے سے ہمیں روکا گیا ہے۔

میں سری نگر میں سب سے بڑی فوجی چھاؤنی کے بالکل ساتھ دنیا کی سب سے بڑی جمہوریت کے اٹوٹ حصے میں رہتی ہوں۔ بچپن میں، میں نے ہر صبح سب سے پہلے جس باہر کے آدمی کو دیکھا وہ ایک فوجی تھا جو اسکول جاتے ہوئے مجھے دیکھ کر مسکراتا تھا اور کہتا تھا، ' گڑیا اسکول جانا ہے؟' میں سر ہلا دیتی اور سوچتی کہ یہ بیچارا اپنے بچوں کو یاد کرر ہا ہوگا۔ انہیں صرف ہماری حفاظت کی خاطر اپنی فیملی سے دور رہنا پڑتا ہے۔ وہ حقیقی ہیرو ہیں۔ چند برسوں تک یہ صورتحال مجھے بالکل ٹھیک لگا کرتی تھی یہاں تک کہ وہ وقت آیا جب میں نے محسوس کیا کہ 'اٹوٹ انگ' دراصل دنیا کا سب سے بڑا عسکری قبضے کا علاقہ ہے۔ ہر گزرتے دن کے

ساتھ مجھے اس حقیقت کا احساس ہوتا گیا کہ ہم اپنے ہی وطن میں زیر قبضہ ہیں۔

مجھے یاد ہے کہ میری والدہ ہر سال 15 اگست (یوم آزادی) اور 26 جنوری (یوم جمہوریہ) کو دیوانہ وار اپنا شناختی کارڈ تلاش کرتی تھیں۔ وہ ہمارا سارا گھر الٹا پلٹ دیا کرتی تھیں۔ ویسے تو کسی بھی دن اس کارڈ کے بغیر کوئی مرد گھر سے باہر نہیں نکل سکتا تھا لیکن سخت سکیورٹی والے دنوں میں خواتین کو بھی روک دیا جاتا تھا۔ میرے ہیروز اب میرے لئے باعث ترغیب نہیں بلکہ بن بلائے ہوئے کرایہ داروں کی طرح محسوس ہوتے تھے۔ اب جس طرح سے فوجی جوان مجھے گھور رہے تھے اس سے میں پریشان ہو جاتی تھی۔ انکا سیٹی مارنا، آنکھ مارنا یا چھیڑنا میرے لئے سوہان روح بن گیا۔ لیکن میں ایک 'لڑکی' تھی جو 'کچھ نہیں' کر سکتی تھی کیونکہ یہی سماج کی طرف سے پیدا کردہ ذہنیت تھی۔ مجھے صرف نظر جھکا کر آگے بڑھ جانا تھا۔ لیکن میں ایسا کیسے کر پاتی؟ آخر میں کسی سے ہراساں ہونے کے لیے پیدا نہیں ہوئی چنانچہ میں انہیں بھی اسی طرح دیکھ کر یہ ظاہر کرتی کہ میں خوفزدہ نہیں ہوں۔ لیکن میں نہیں چاہتی تھی کہ میرے وطن کے لیے کچھ کرنے کی میری خواہش محض چمکدار نظریں لوٹانے تک محدود رہے۔

مارچ 2013ء میں، میں نے رضاکارانہ طور پر جموں کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی کے لیے خواتین کے خلاف تشدد پر ایک رپورٹ کے لیے کام کیا۔ مجھے بچپن سے ہی ''کنن پوشپورہ'' نامی جگہ کے بارے میں ایک دھندلا سا خیال تھا جہاں کچھ ہوا تھا، بدسلوکی ہوئی تھی یا کچھ انسانی حقوق کی خلاف ورزی ہوئی تھی یا اس سے بھی بڑھ کر وہ بات جس کا نام نہیں لیا جا سکتا تھا۔ یہ المیہ اسی سال ہوا جب میں پیدا ہوئی، یہ میری پیدائش سے تین مہینے پہلے کی بات ہے اور ایک چنچل بچی کے طور پر، میں نے 1991ء کے بارے میں سب کچھ جاننے کی کوشش کی تھی اور اپنے سال پیدائش میں پیش آنے والے حیران کن واقعات پر فخر کرنا پسند کرتی تھی لیکن یہ واقعہ ایسا نہیں تھا جسے میں خود سے متعلق کہہ سکتی کیوں کہ اسے یوم

سیاہ کے طور پر منایا جاتا تھا۔

اپنی انٹرن شپ کے دوران، جب میں نے کچھ بدنام زمانہ عصمت دری کے واقعات کے بارے میں پڑھا، مجھے پہلی بار یہ جان کر خوف محسوس ہوا کہ ''کنن پوشپورہ'' کسی ایک ریپ کا نہیں بلکہ کم از کم 100 خواتین کی اجتماعی عصمت دری کا معاملہ تھا۔ پہلی معلوماتی رپورٹ (ایف آئی آر) کو 'عدم معلومات کی بنیاد پر بند کر دیا گیا'۔ اور اس طرح ایک ایسے اجتماعی عصمت دری کے کیس کے متعلق جاننے کا میرا تجسس بڑھتا گیا جس کا سراغ نہیں لگایا جا سکا تھا۔

بعض دیگر رضاکاروں اور میں نے ''کنن پوش پورہ'' کو انصاف دلانے کیلئے حمایتی گروپ بنایا اور اجتماعی عصمت دری کی دوبارہ تحقیقات کرانے کے لیے مقدمہ درج کرنے کے بارے میں سوچنا شروع کیا۔ لیکن 50 سے زیادہ متاثرین، 22 سال کی تاخیر اور صدمے، اور صرف 7 خواتین درخواست گزار مجھے درست نہیں لگیں، اس لیے میں نے ایک تجویز پیش کی: صرف 7 خواتین ہی کیوں؟ کیا آپ کو نہیں لگتا کہ ہمارے اقدام کی حمایت کے لیے مزید خواتین کو آگے آنا چاہیے؟ مجھے یاد ہے کہ میں نے کس طرح اپنے اسکول سے کالج تک ہر دوست کو کال کی اور ٹیکسٹ کیا تاکہ ہماری PIL کا حصہ بننے کے لیے ان کی رضامندی حاصل کی جا سکے۔

کچھ نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے اتفاق کیا جب کہ کچھ ہچکچا رہی تھیں لیکن کسی نہ کسی طرح ہم کافی دستخط حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ اور پھر ایک اور جھٹکا لگا۔ ہمیں بتایا گیا کہ عدالت درخواست گزاروں سے شناخت کا ثبوت پیش کرنے کا مطالبہ کرتی ہے۔ اس کا مطلب تھا ان کے شناختی کارڈ یعنی کشمیر میں انتہائی قیمتی املاک ان کے حوالے کرنا۔ چھ خواتین نے اپنے نام واپس لے لیے کیوں کہ وہ اپنی شناخت ظاہر کرنے کو تیار نہیں تھیں۔ یا تو وہ روایت پسند خاندانوں سے تھیں جہاں عصمت دری ایک ناقابل بیان لفظ تھا

یا وہ پھر سرکاری ملازم تھیں۔ ایک نوجوان غیر مسلم لڑکی جو کھلے دل سے اس PIL کا حصہ بننا چاہتی تھی، اسے اپنا نام اس لئے واپس لینا پڑا کیوں کہ اس کی ماں نے مجھ پر الزامات لگائے اور کہا، 'تم اپنے ذاتی مقاصد کے لیے میری بیٹی کو پٹی پڑانے کی کوشش کر رہی ہو۔'

ایک دن باورچی خانے میں میری والدہ نے مجھے ان تمام شناختی کارڈوں میں گھرا ہوا دیکھا، انہیں تجسس پیدا ہوا کہ میں کیا کر رہی ہوں۔ مجھے ''کنن پوش پورہ'' کی پوری کہانی بیان کرنی پڑی تھی، لیکن اس وقت میں حیران رہ گئی جب انہوں نے مجھ سے پوچھا، ' کون اس پٹیشن کا حصہ بن سکتا ہے '۔ میں نے جواب دیا، ' کوئی بھی عورت، جس کا ضمیر زندہ ہو'۔ ''پھر میں کیوں نہیں؟'' انہوں نے پوچھا۔ میں نے اس پر بہت فخر محسوس کیا، اور میرے دل نے مجھے بتایا کہ میرے اندر ناانصافی کے خلاف لڑنے کی طاقت کہاں سے آئی ہے۔ (افراح بٹ)

☆......☆

کنن پوش پورہ، مصنف۔ بشیر سدروزوی

عام سی لڑکی اور خوف کا احساس

میں ایک عام سی لڑکی ہوں جس کا تعلق متوسط طبقے کے ایک مذہبی کشمیری گھرانے سے ہے جس نے ایک مشنری اسکول میں تعلیم اور لاعلمی کے اطمینان بخش سائے میں پرورش پائی۔ میری پرورش ایک شیعہ گھرانے میں ہوئی اس دوران مزاحمتی تحریک کی حمایت پر کمر بستہ پوشیدہ باقیات اور ہمارے خلاف بڑھتے ہوئے عدم اعتماد کے سبب اپنے مستقبل کے لیے خوف کا احساس برقرار رہا۔ میں نے اپنے خاندان کو ظلم و جبر سے نالاں دیکھا مگر پھر بھی انہوں نے اس بارے میں کبھی کھل کر بات نہیں کی اور نہ ہی مجھے اس کے متعلق پوچھنے کی اجازت دی، مستقبل کی فکر ان کے تاریک چہروں سے عیاں تھی۔

اپنی جوانی کی زندگی کا بیشتر حصہ، میں کتابوں میں کھوئی رہی، امن اور محبت سے بھری دنیا کا تصور کرتی رہی، ان کہانیوں کے لیے پرشوق رہتی جو دنیا کو سنانی تھیں۔ میں اکثر سوچتی تھی کہ میری سرزمین سے ایسی کوئی کہانی کیوں نہیں ملتی؟ میں اپنے وطن میں رائج ناانصافی اور ظلم، بہادری اور مزاحمت کی بے شمار کہانیوں سے بے خبر تھی جن سے میرے گھر والوں نے مجھے لاعلم رکھا کیوں کہ وہ نہیں چاہتے تھے میں کسی پریشانی کا سامنا کروں لہٰذا طویل عرصے تک میں یہی سمجھتی رہی کہ لوگ ہندوستانی مسلح افواج کی زیادتیوں کی بات کرتے ہوئے مبالغہ آرائی سے کام لیتے ہیں کیونکہ وہ اتنے برے نہیں، یہ فوجی جوان جو میرے شہر کے تقریباً ہر کونے میں موجود ہیں، کیا وہ ہماری حفاظت نہیں کر رہے؟ اس طرح میں ان آدمیوں کو دیکھ کر ہاتھ لہرانے کا جواز پیش کرتی جن میں زیادہ تر بزرگ تھے، واضح طور پر نفرت کرتے نظر آتے ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ دیوالی یا ہولی کے موقع پر مسلح افواج کے

سیاہ اکثر ہماری اسکول بس کو روکتے جس پر ڈرائیور کی خفگی دیکھنے والی ہوتی، جسے گاڑی روک کر بچوں میں سافٹ ڈرنکس بانٹنا پڑتی تھیں۔ میں حیران رہتی کہ زیادہ تر بڑی لڑکیاں اسی لمحے گہری نیند میں ہونے کا بہانہ کیوں کرتی ہیں۔ مجھے اس وقت احساس نہیں تھا کہ یہ ناپسندیدگی کا اشارہ تھا، اس عمل کو مسترد کرنے کا عندیہ تھا۔ یہ ایک انتخاب تھا جو انہوں نے ہندوستانی مسلح افواج کے خلاف استعمال کیا۔ یہ بات مجھے اب سمجھ میں آئی ہے کہ ریاست کتنی باریک بینی سے آراء اور خیالات کو کنٹرول کرتی ہے اور سچ کو سامنے آنے سے روکنے کے لیے کیسے انہی چیزوں کو اپنے کنٹرول میں لیتی ہے جو بظاہر لوگوں کے آگے بڑھنے کا راستہ بناتی ہیں۔

جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے میں فلسطین کی جدوجہد آزادی کی حمایت کرتی رہی ہوں۔ ستم ظریفی یہ ہے کہ مجھے اپنے وطن میں ہونے والے واقعات کے قریب آنے میں کافی وقت لگا۔ اس سے بھی زیادہ ستم ظریفی یہ ہے کہ یہ تولین سنگھ کی کتاب ''Kashmir- A tragedy of errors'' تھی جس نے مجھے وہ لٹریچر پڑھنے کی طرف راغب کیا جس نے درحقیقت کشمیر پر قبضے کو آشکار کیا تھا۔ میں ابھی تک یہ فیصلہ نہیں کر پائی تھی کہ مجھے کیا سوچنا ہے، گھر میں جس طرح بھی ممکن تھا میں پدرانہ اصولوں کے خلاف بغاوت کرنے میں مصروف تھی۔

سال 2008ء کو جب میں کالج کی طالبہ تھی، میری زندگی میں ایک اہم موڑ آیا۔ اس کے بعد کے سالوں میں میرا غصہ اور بڑھتا گیا۔ اس دوران ہونے والی ہلاکتیں، جنہیں ہم عام شہریوں کا قتل سمجھتے تھے اور جن میں زیادہ تر نوجوان اور نوعمر لڑکے شامل تھے، سڑکوں پر بڑے پیمانے پر غیض وغضب کے اظہار اور کشمیر پر بھارتی قبضے کے خلاف بے چینی میں اضافے کا باعث بنیں۔ مجھے بھارت اور اس کے قبضے کو مستحکم کرنے والی مسلح افواج کا بدصورت چہرہ واضح طور پر یاد ہے۔ بھارتی فوج کی طرف سے بڑی تعداد میں غیر معذرت

خواہانہ اور قصداً نوجوانوں کی ہلاکتیں ان کا حیوانی پہلو سامنے لائیں، اس چیز نے مجھے یہ احساس دلایا کہ میں اس جابرانہ تسلط کے سامنے مجرمانہ اطمینان سے رہنے کی متحمل نہیں ہوسکتی۔ ایسے حالات میں انسان کا دم گھٹنے لگتا ہے جب آپ کسی ایسی جگہ پر رہیں جہاں اس حد تک عسکریت ہو کہ دور تک پھیلے ملٹری گرین میں رنگ خود ایک حادثہ بن جائیں۔ جہاں جبر کے ادارے آپ کو وادی کی خوش کن تصویر پیش کرنے پر مجبور کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ آپ صرف اس تسلط کا مثبت پہلو دیکھیں حالاں کہ کسی تسلط یا قبضے کا کوئی مثبت پہلو نہیں ہوتا۔

2008ء میں لامتناہی کرفیو کے طویل، سست، پنجرے میں بند دنوں میں، میری ماں نے مجھے 1991ء کی وہ کہانیاں سنائیں جو اب تک شعوری کوششوں سے مجھ سے چھپائی جاتی رہی تھیں: انہوں نے اس وقت کے بارے میں بتایا جب مسلح تحریک اپنے عروج پر تھی اور میں کیسے، چار سال کی عمر میں، ہندوستانی ریاست سے علیحدگی کا مطالبہ کرنے والے جلوسوں کو دیکھ کر خوشی سے بھاگتی ہوئی آتی اور غلط تلفظ ادا کرتے ہوئے کہا کرتی، 'ممی ادادی (آزادی) آئی'۔ میں پریشان تھی، کیا ہم نے پیغمبر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کے نواسے امام حسین کی شہادت کی یاد نہیں منائی جنہوں نے ظلم سے لڑتے ہوئے اپنی جان دے دی؟ میں ظلم کے خلاف کھڑے ہونے کی قدر کو اتنی آسانی سے اپنے ہاتھوں سے کیسے پھسلنے دوں؟ میں نے پڑھنا شروع کیا اور سمجھنے کی کوشش کی۔

اور پھر، میری دوست ثمرینہ کے ایک سادہ سے سوال نے میری زندگی ہمیشہ کے لیے بدل دی۔ ''کیا تمہیں کنن پوش پورہ یاد ہے؟'' مجھے یاد ہے۔ کیا یہ وہ گاؤں نہیں تھے جہاں 1991ء میں 23 فروری کی رات اجتماعی عصمت دری ہوئی تھی؟ ہاں، یہ دو گاؤں کنن اور پوش پورہ تھے، اور وہاں، اجتماعی عصمت دری کے ساتھ بدترین قسم کا تشدد بھی ہوا تھا۔ پسماندگان اور دیہاتیوں کی طرف سے انصاف کے لیے ایک طویل لڑائی شروع ہونے کے بعد بھی انصاف تک ان کی رسائی نہیں ہوئی ہے۔

اس کے بعد ہی نوجوان خواتین کے ایک گروپ نے ہائی کورٹ میں پی آئی ایل دائر کر کے دوبارہ لڑائی شروع کی۔ ہم ادھر ادھر بھاگے۔ ہم نے جوان اور بوڑھی سبھی عورتوں سے رابطہ کیا۔ ہم نے ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین کی جدوجہد اور مزاحمت کو آگے بڑھانے کے لیے قانونی چارہ جوئی کی حمایت حاصل کی۔ یہ عمل جسے قابض افواج نے یقینی بنایا ہے کہ آسانی سے نہ چل سکے، اب بھی جاری ہے۔ میرا خاندان میرے لیے خوفزدہ ہے اور میری دوستوں کو اس بات کی فکر ہے کہ میں نے جو راستہ چنا ہے اس کی وجہ سے میرے ساتھ کیا ہو سکتا ہے۔ لیکن میں مطمئن ہوں کہ یہ میرا انتخاب ہے۔ مجھے ایک الجھی ہوئی روح کہا جا سکتا ہے جو طویل عرصے سے اپنی زمین کی حقیقت سے لاعلم تھی، لیکن یہ وہ قیمت ہے جو عسکری زون میں رہتے ہوئے ادا کرنا پڑتی ہے۔ قابضین کا بہت سارے اداروں پر کنٹرول ہے۔ قانونی نظام، میڈیا، تعلیم، گورننس۔ اور وہ آسانی سے آپ کی رائے کو مسخ کر سکتے ہیں اور آپ کی تنقیدی صلاحیتوں میں خلل ڈال سکتے ہیں۔ لیکن سچائی کے پاس یادوں کے ذریعے خود کو پہچاننے کا ایک طریقہ ہے اور ہم یہی کرتے ہیں۔ یاد کو زندہ رکھیں، اب آپ نے ہم سب کے بارے میں کچھ نہ کچھ جان لیا ہے۔ ہم ایک جیسی ہیں پر مختلف، لیکن ہم بھی اس کتاب کے صفحات کی طرح کسی نہ کسی طرح آپس میں جڑی ہوئی ہیں جس کا ہر باب آپ کو 1991ء کی اس رات سے لے کر آج تک مختلف مقامات اور ادوار سے گزارے گا۔

(ایثار بتول)

☆......☆

کنن پوش پورہ

مصنف۔ بشیر سدوزوی

تیسرا حصہ

کنن پوش پورہ کیس میں واقعات کی تاریخ وار ترتیب

(Chronology of events in Kunan Poshpora Case)

تاریخ	واقعہ
24-23 فروری 1991	کنن اور پوش پورہ کے دیہات میں 4 راجپوتانہ رائفلز، 68 ماؤنٹین بریگیڈ کے اہلکاروں کی طرف سے اجتماعی عصمت دری اور تشدد۔
26-25 فروری 1991	کنن اور پوش پورہ کے دیہاتیوں کی طرف سے کپواڑہ کے ڈپٹی کمشنر (ڈی سی ایس ایم یاسین) اور پولیس حکام کو عصمت دری اور تشدد کے حوالے سے لکھا گیا خط۔
26 فروری تا 2 مارچ 1991	گاؤں والوں نے مقدمہ درج کرانے کی کوشش کی، کوئی نتیجہ نہیں نکلا۔ گاؤں کے افراد اور دیگر لوگوں کا بریگیڈ ہیڈ کوارٹر کا دورہ۔
3 مارچ 1991	کپواڑہ کے ڈی سی کو سرکاری طور پر واقعہ کا علم ہوا اور اپنے اعلیٰ افسران کو مطلع کیا۔
5 مارچ 1991	کپواڑہ کے ڈی سی نے اسپاٹ انکوائری کے لیے کنن اور پوش پورہ کے گاؤں کا دورہ کیا۔
7 مارچ 1991	کپواڑہ کے ڈی سی نے اپنی رپورٹ کشمیر کے ڈویژنل کمشنر اور کپواڑہ کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ایس پی) کو اجتماعی عصمت دری اور تشدد کے متعلق اپنی تحقیقات کے ہمراہ بھیجتے ہیں، اور مزید تحقیقات اور قانونی کارروائی کی سفارش کرتے ہیں۔
8 مارچ 1991	کیس کی ایف آئی آر نمبر 10/1991 تھانہ ترہگام میں درج کی جاتی ہے۔

مارچ 1991 تا ستمبر 1991	پولیس تحقیقات کرتی ہے، کچھ گواہوں اور 68 ماؤنٹین بریگیڈ، 4 راجپوتانہ رائفلز کے اہلکاروں کے بیانات ریکارڈ کرتی ہے۔ تاہم تحقیقات غلط اور نامکمل رہتی ہیں۔ تفتیشی افسران کی بار بار تبدیلی اور تبادلے ہوئے۔ آپریشن میں شامل 125 فوجی اہلکاروں کی برائے نام فہرست حاصل کی گئی۔
15 مارچ 1991	پہلے مرحلے میں 18 خواتین کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے، جن میں سے سبھی کے دوران عصمت دری، گھسیٹے جانے اور تشدد کے باعث زخموں کے ثبوت ملتے ہیں۔
18 مارچ 1991	وجاہت حبیب اللہ کنن اور پوش پورہ کے دیہاتوں کا دورہ کرتے ہیں اور انکوائری کرتے ہیں۔ اس کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ عصمت دری کا واقعہ 'مشکوک اور' عسکریت پسندوں کے دباؤ' کے زیر اثر لگتا ہے۔
21 مارچ 1991	دوسرے مرحلے میں 14 خواتین کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے، اس بار بھی عصمت دری، تشدد کی وجہ سے زخموں کے شواہد ملے۔ کل طبی معائنوں کی تعداد 32 خواتین۔
جولائی 1991	بی جی ورگیز کی سربراہی میں پریس کونسل آف انڈیا کی ٹیم نے اپنی رپورٹ پیش کرتی ہے، جس میں کنن اور پوش پورہ میں پیش آنے والے واقعے کے متعلق ایک حصہ شامل کرتے ہوئے شکایات کو 'عسکریت پسندوں کا فریب' قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا جاتا ہے۔
23 ستمبر 1991	دوسرے مرحلے میں 14 خواتین کا طبی معائنہ کیا جاتا ہے، ایک بار پھر عصمت دری، تشدد کی وجہ سے آنے والے زخموں کے شواہد ملے۔ کل طبی معائنوں کی تعداد 32 خواتین۔
21 اکتوبر 1991	جموں وکشمیر پولیس کنن اور پوش پورہ کیس کو ناکافی شواہد کی بناء پر بند کر دیتی ہے لیکن ضرورت کے مطابق مجسٹریٹ کو اپنی کیس بند کرنے کی رپورٹ جمع نہیں کراتی۔
2004 اور 2011 کے درمیان	تقریباً 39 متاثرین، گروپس اور انفرادی حیثیت میں ریاستی انسانی حقوق کمیشن (SHRC) سے رجوع کر کے متعدد درخواستیں جمع کراتے ہیں۔

16 اکتوبر 2011	ایس ایچ آر سی کیس کا حتمی فیصلہ جاری کرتا ہے جس میں مالی امداد کی سفارش اور ملزمان اور واقعہ کو چھپانے کے ذمہ دار افسران کے خلاف فوجداری کارروائی کیلئے کہا جاتا ہے۔ ریاست ان سفارشات پر قانون کے تحت اپنی کارروائی کی رپورٹ جمع کرانے میں ناکام رہتی ہے۔
29 فروری 2012	وزیر قانون سیف اللہ میر متاثرین سے ملاقات کر کے بظاہر سرکاری طرف سے زر تلافی کے طور پر 39,25,000 روپے نقد ان کے حوالے کرتے ہیں۔ ریاستی حکومت 5 مارچ 2014 کو آر ٹی آئی کے جواب میں ایسی کسی بھی ادائیگی کی تردید کرتی ہے۔
مارچ 2013	سول سوسائٹی کی خواتین اس معاملے میں کارروائی کے لیے PIL دائر کرنے کے لیے مشاورت شروع کر دیتی ہیں۔
مارچ 2013	جموں وکشمیر پولیس نے 22 سال کی تاخیر کے بعد کپواڑہ مجسٹریٹ کی عدالت میں کیس میں بندش کی رپورٹ داخل کی، جس میں تاخیر کی کوئی وضاحت نہیں کی جاتی۔
20 اپریل 2013	ایس ایچ آر سی کے حکم پر عمل درآمد، فوجداری کیس کی دوبارہ تحقیقات اور دیگر ریلیف کیلئے سرینگر ہائی کورٹ میں PIL دائر کی گئی۔
14 مئی 2013	ہائی کورٹ تین سماعتوں کے بعد بھی PIL کو قبول نہیں کرتی یہ کہتے ہوئے کہ یہ 'قبل از وقت' ہے، کیونکہ ریاست نے حال ہی میں اس معاملے میں کیس کی بندش رپورٹ داخل کی ہے اور معاوضے کے معاملے پر فیصلہ کرنے کیلئے مشاورتی عمل جاری ہے۔
14 مئی 2013	ہائی کورٹ میں ایڈووکیٹ جنرل کی گذارشات کے مطابق معاوضے پر فیصلہ کرنے کے لیے اعلیٰ سطحی کمیٹی، حکومت جموں وکشمیر کا اجلاس منعقد کیا جائے گا۔
10 جون 2013	دو متاثرین نے کیس کی بندش رپورٹ پر کپواڑہ کے مجسٹریٹ کی عدالت میں ایڈووکیٹ پرویز امروز کے توسط سے ایک احتجاجی پٹیشن دائر کرتے ہیں اس دلیل کے ساتھ کہ معاملے کی مزید تحقیقات ضروری ہے کیونکہ پہلے کبھی ٹھیک طرح تحقیقات نہیں کی گئیں۔

13جون2013	چیف پراسیکوٹر، ریاست (پولیس) کے وکیل احتجاجی پٹیشن کی مخالفت کرتے ہوئے کیس کو بند کرنے کی دلیل دیتے ہیں۔
18جون2013	کپواڑہ کے سب جج، جوڈیشل مجسٹریٹ ایس پی کو تین ماہ کے اندر کیس بندش کی رپورٹ اور متاثرین کے دلائل کی بنیاد پر تحقیقات کا حکم دیتے ہیں۔
22جون2013	متاثرین سرینگر میں جموں و کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی سی ایس) اور کنن پوش پورہ کو انصاف دلانے کیلئے قائم سپورٹ گروپ (ایس جی کے پی) کے زیر اہتمام ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہیں۔
2جولائی2013	متاثرین کو اطلاع دی جاتی ہے کہ کپواڑہ کے ایس پی عبدالجبار کو اس کیس میں تحقیقاتی افسر مقرر کیا گیا ہے، اور یہ کہ ان کے بیانات 3 جولائی 2013ءکو کپواڑہ کی عدالت میں ریکارڈ کئے جائیں گے۔
3جولائی2013	متاثرین، ان کے اہل خانہ اور وکیل کپواڑہ آتے ہیں۔ پانچ گھنٹے انتظار کرانے کے بعد ایس پی عبدالجبار نے اپنا پروگرام منسوخ کر دیا۔ متاثرین کی طرف سے احتجاجی خط ایس پی عبدالجبار کے پاس جمع کرایا جاتا ہے۔
30جولائی2013	پولیس ایک بار پھر تین/ چار متاثرین/ گواہوں کو طلب کرتی ہے۔ ان میں سے طلب کئے گئے تین افراد اب زندہ نہیں رہے۔ اب تک زندہ واحد گواہ جسے طلب کی گیا پولیس تحقیقات میں گواہان کی اصل فہرست میں شامل نہیں تھا۔
13 ستمبر2013	ایس پی عبدالجبار تحقیقات کے لیے چھ ماہ کی مزید مہلت مانگتا ہے۔ متاثرین کی کیس میں نمائندگی ہونے کے باوجود انہیں کوئی نوٹس نہیں دیا جاتا، اس کی درخواست ظاہر کرتی ہے کہ اس نے تحقیقات کے لئے دیئے گئے وقت کے دوران محض دو لفظ لکھے اور چند فون کالیں کی ہیں۔
14 ستمبر2013	کپواڑہ کے سب جج، جوڈیشل مجسٹریٹ متاثرین (درخواست گزاروں) کو سنے بغیر ہی کیس میں تین ماہ کی توسیع جاری کر دیتے ہیں حالانکہ متاثرین خود اس معاملے میں قانونی طور پر اپنی نمائندگی کر رہے ہیں۔

اکتوبر2013	سری نگر ہائی کورٹ میں متاثرین کی جانب سے دائر کی گئی رٹ پٹیشن میں توسیع کے فیصلے کو چیلنج کیا جاتا ہے۔ کیس کی سماعت ابھی تک نہیں ہوئی ہے۔
12 نومبر2013	فوج کی طرف سے دائر نظر ثانی پٹیشن میں مزید تحقیقات کے مجسٹریٹ کے احکامات چیلنج کئے جاتے ہیں اور تحقیقات ختم کرنے پر زور دیا جاتا ہے۔
18، 19 اور 21 نومبر 2013	رٹ پٹیشن کی کوئی موثر سماعت نہیں ہوتی۔ رٹ پٹیشن کو ایک پی آئی ایل میں تبدیل کر کے دو ججز پر مشتمل ایک ڈویژن بینچ کو منتقل کی جاتی ہے مگر سماعت نہیں ہوتی۔
14 نومبر2013	کپواڑہ سیشن کورٹ میں فوج کی دائر کردہ نظر ثانی پٹیشن کی سماعت ہوتی ہے، فوج کا وکیل متاثرین کے اعتراض داخل کرنے یا اس معاملے میں انہیں سنے جانے یعنی ان کے حق مداخلت کی مخالفت میں دلائل دیتا ہے۔
13دسمبر2013	پولیس کو مزید تحقیقات کے لئے فراہم کردہ توسیع کی مدت ختم ہوتی ہے، ہے، متعلقہ جج، کپواڑہ مجسٹریٹ چھٹی پر ہیں۔ پولیس کی طرف سے کپواڑہ کے منصف سے کیس کی مزید تحقیقات کیلئے 13 مارچ 2013ءتک ایک اور توسیع حاصل کی جاتی ہے حالانکہ کپواڑہ منصف ایسی کوئی توسیع دینے کا اختیار نہیں رکھتا، ایک بار پھر کیس میں قانونی طور پر نمائندگی کرنے والے متاثرین کو اس توسیع سے آگاہ نہیں کیا جاتا۔
14دسمبر2013	متاثرین کپواڑہ سیشن کورٹ کے احکامات کے مطابق کنن پوشپورہ میں اجتماعی عصمت دری اور تشدد کے کیس میں تحقیقات کو مکمل نہ کرنے پر کپواڑہ کے ایس پی کے خلاف توہین عدالت کا کیس دائر کرتے ہیں۔
19دسمبر2013	واقعہ کے متاثرین، سول سوسائٹی کے اراکین، کنن پوشپورہ ولیج کمیٹی اور ایس جی کے پی کپواڑہ سیشن کورٹ جا کر قانونی کاروائی کا مشاہدہ کرتے اور اسے ریکارڈ کرتے ہیں۔ فوج کے وکیل مزید مہلت طلب کرتے ہیں حالانکہ ان کے پاس اعتراضات تیار اور جمع کرانے کیلئے پانچ دن کا وقت تھا۔

26دسمبر2013	فوج کے وکیل نظر ثانی کی درخواست پراپنے دلائل دیتے ہوئے یہ ابتدائی اعتراض اٹھاتے ہیں کہ متاثرین کوئی ایسا حق نہیں رکھتے کہ انہیں سنا جائے۔ سماعت کے بعد کنن پوش پورہ کے دیہاتیوں کے ساتھ سرینگر سے تعلق رکھنے والی سماجی کارکنان کیس میں تاخیر اور انصاف کی فراہمی سے انکار پرسیشن کورٹ کے باہراحتجاج کرتی ہیں۔
30دسمبر2013	کپواڑہ کے سیشن جج فیصلہ دیتے ہیں کہ کنن پوشپورہ کے متاثرین کو اپنی بات سنانے اور بھارتی فوج کی جانب سے تحقیقات بند کرنے کی درخواست کے مقابل دلائل دینے کا حق ہے۔ فوج کے وکیل مستقبل کے لائحہ عمل کے حوالے سے اعلیٰ فوجی حکام سے مشورہ کرنے کیلئے وقت مانگتے ہیں اور کہتے ہیں کہ فوج تلافی کیلئے فیصلے کے خلاف ہائی کورٹ سے رجوع کرسکتی ہے۔
18جنوری2014	سرکاری وکیل استغاثہ عدالت کے سامنے پیش نہیں ہوتے۔ پبلک پراسیکیوٹر کے پیش نہ ہونے کی وجہ سے فوج کے وکیل معاملے کو زیرالتوا رکھنے پراصرار کرتے ہیں۔
یکم فروری2014	فوج کے وکیل کرنیل سنگھ نظر ثانی درخواست کی سماعت کے دوران اپنے دلائل پیش کرتے ہیں۔ سرکاری وکیل استغاثہ، جنہیں متاثرین کے مفادات کی نمائندگی کرنی ہے ہیں، دلائل دینے سے ہچکچاتے ہیں اور متاثرین کے وکیل سے کہتے ہیں کہ پہلے وہ دلائل دیں۔
8فروری2014	سیشن جج کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے نظر ثانی کی درخواست پر سماعت نہیں ہوتی۔
23فروری2014	کنن پوش پورہ عصمت دری اور تشدد واقعہ کی 23ویں برسی کو 'کشمیری خواتین کے یوم مزاحمت' کے طور پر منایا گیا۔ زندہ بچ جانے والے اور سابق ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین کنن پوش پورہ میں ہونے والے واقعات اور اس کے بعد کے واقعات کو یاد کرتے ہوئے ایک عوامی اجتماع سے خطاب کرتے ہیں۔

یکم مارچ2014	سیشن جج کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے نظر ثانی کی درخواست پر سماعت نہیں ہوتی۔
13مارچ2014	مزید تحقیقات کے لئے پولیس کو دی گئی توسیع شدہ مہلت ختم ہوتی ہے۔
15مارچ2014	سیشن جج کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے نظر ثانی کی درخواست پر سماعت نہیں ہوتی۔
29مارچ2014	سیشن جج کے ایمرجنسی اجلاس میں شرکت کے باعث نظر ثانی پٹیشن کی کوئی موثر سماعت نہیں ہوتی۔ متاثرین کو توہین عدالت کی درخواست کے حوالے سے موصولہ جواب سے پتہ چلتا ہے کہ چند سرسری فون کالز اور خطوط سے زیادہ عملی طور پر کوئی تحقیقات نہیں کی گئیں۔
5 اپریل2014	متاثرین سیشن جج کے علم میں یہ بات لاتے ہیں کہ سرکاری وکیل استغاثہ کو سینٹرل گورنمنٹ کے نامزد کردہ وکیل کے طور پر نامزد کیا گیا ہے۔ جج کی طرف سے 'مفادات کے ٹکراؤ' کی وجہ سے نئے 'پبلک پراسیکیوٹر کی تقرری کے لیے کہا جاتا ہے۔
7 اپریل2014	کپواڑہ ضلع کے کنن گاؤں میں دھماکہ۔ دھماکہ راشٹریہ رائفلز اور ہری کیمپ کی 160 علاقائی فوج کے اہلکاروں کی طرف سے کیا گیا۔ گاؤں والوں سے فوج کا کہنا تھا کہ یہ ایک پرانی بارودی سرنگ تھی جسے دھماکے سے اڑانا پڑا۔ انہوں نے یہ اعلان بھی کیا کہ اس دھماکے کی جگہ کے نزدیک سے ہتھیار اور گولہ بارود بھی برآمد ہوا ہے۔ اس وقت وہاں کوئی فرد یا مقامی گواہ موجود نہ تھا۔
19اپریل2014	جج احکامات جاری کرتا ہے کہ کمشنر سیکریٹری، محکمہ قانون صورتحال واضح کرے اور ایک خصوصی پبلک پراسیکیوٹر کو چاردن کے اندر مقرر کیا جائے۔
20اپریل2014	50 درخواست گزاروں کی جانب سے دائر کی گئی پی آئی ایل کو ایک سال مکمل ہوتا ہے۔
26اپریل2014	سیشن جج کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے نظر ثانی درخواست پر سماعت نہیں ہوتی۔ تفتیشی افسر ایس پی عبدالجبار کے خلاف توہین عدالت کیس میں، ضروری دستاویزات متاثرین کے وکیل کو فراہم کی گئیں۔

10 مئی 2014	جج چھٹی پر ہیں۔ وکیل پرویز امروز تحقیقاتی افسر ایس پی عبدالجبار کے خلاف توہین عدالت کیس میں دلائل دیتے ہوئے کہتے ہیں کہ ایس پی عبدالجبار نے اب تک کوئی کام نہیں کیا ہے اور محض توسیع مانگتا رہا ہے، اسے اس کیس کی تحقیقات میں کوئی دلچسپی نہیں۔
11 مئی 2014	تشدد کے نتیجے میں ٹارچر کے متاثرہ ابلی ڈار کو طبی پیچیدگی کا سامنا ہے، اس کی دائیں ٹانگ کاٹ دی گئی ہے۔
20 مئی 2014	ہائی کورٹ کی طرف سے 23 اور 24 فروری 1991 کے اجتماعی عصمت دری اور تشدد کے کیس میں کونن پوش پورہ کے پانچ متاثرین کی جانب دائر کی گئی کنن پوش پورہ کیس کی پٹیشن پر نوٹس جاری کئے جاتے ہیں۔ ہائی کورٹ نے کیس میں نامزد تمام 17 مدعا علیہان کو نوٹس جاری کیے ہیں جن میں گورنمنٹ آف جموں و کشمیر، ڈیٹ اپونٹ جموں و کشمیر کی پولیس کے گورنر جنرل، یونین آف انڈیا اور کنن پوش پورہ میں فوجی آپریشن میں شریک 4 راجپوتانہ رائفلز کے کرنل کے ایس ڈیال اور آٹھ دیگر فوجی افسران شامل ہیں۔ بی جی ورگیس اور وجاہت حبیب اللہ کو بھی نوٹس جاری کیا جاتا ہے۔
24 مئی 2014	بھارتی فوج کی جانب سے دائر نظر ثانی درخواست میں نئے اسپیشل پبلک پراسیکیوٹر ایڈوکیٹ محمد سلطان ملک کو ریاست جموں و کشمیر کی جانب سے مقرر کیا جاتا ہے۔ وہ فوج کے دلائل سننا چاہتا ہے۔
2 جون 2014	سیشن جج کے چھٹی پر ہونے کی وجہ سے نظر ثانی کی درخواست پر سماعت نہیں ہوتی۔
11 جون 2014	ٹانگ کٹنے کے بعد طبی پیچیدگیوں کے سبب ابلی ڈار کی موت واقع ہو جاتی ہے۔
14 جون 2014	کپواڑہ سیشن کورٹ کنن پوش پورہ کے متاثرین اور اہل خانہ کی طرف سے دائر توہین عدالت کی درخواست مسترد کرتا ہے۔
18 جون 2014	کپواڑہ کے سب جج، جوڈیشل مجسٹریٹ کی طرف سے 23-24 فروری 1991 کے کنن پوش پورہ اجتماعی عصمت دری اور تشدد کیس میں مزید تحقیقات کا حکم دیئے جانے کو ایک سال مکمل ہوتا ہے۔

یکم جولائی 2014	23-24 فروری 1991 کے کنن پوش پورہ اجتماعی عصمت دری اور تشدد واقعے کے متاثرین کی طرف سے ہائی کورٹ میں دائر درخواست پر ہائی کورٹ نے کہا کہ ایس ایچ آر سی کی سفارشات کی حمایت میں ثبوت موجود ہیں لہٰذا حکومت کو تین ہفتوں کے اندر معاوضے کی ادائیگی کے امکانات کا جائزہ لینے کا حکم دیا جاتا ہے۔
12 جولائی 2014	فوج کے وکیل کرنیل سنگھ، وکیل پرویز امروز، متاثرین کے وکیل اور اسپیشل پبلک پراسیکیوٹر دلائل دیتے ہیں۔ جج نے 31 جولائی 2014 کے لئے فیصلہ محفوظ رکھا۔
24 جولائی 2014	ہائی کورٹ نے سرکاری وکیل کے دلائل کو قبول نہیں کیا، جواباً وکیل کی طرف سے اس معاملے پر غور کرنے کے لئے مزید تین ہفتوں کا وقت مانگا جاتا ہے۔ کیس کیلئے 12 اگست 2014 کی تاریخ دی جاتی ہے۔
8 اگست 2014	کپواڑہ سیشن کورٹ بھارتی فوج کی نظر ثانی کی درخواست مسترد کرتا ہے۔ عدالت نے جموں و کشمیر پولیس کو ان کی 'غیر سنجیدگی' اور 'غیر ذمہ دارانہ اور غیر ذمہ دارانہ طرز عمل' کے لئے تنقید کا نشانہ بنایا جو اس معاملے کی جانچ کرنے اور عدالت کے سامنے حتمی رپورٹ داخل کرنے میں سالوں کی تاخیر سے ظاہر ہوا ہے۔
12 اگست 2014	کنن پوش پورہ اجتماعی عصمت دری اور تشدد کیس کے متاثرین کی طرف سے دائر عرضی میں جموں و کشمیر حکومت کے وکیل کہتے ہیں کہ وہ معاوضے کی ادائیگی کے خلاف نہیں ہیں لیکن اس کے لئے مزید وقت مانگتے ہیں۔ سرکاری وکیل کا کہنا ہے کہ یہ معاوضہ صرف ان 23 افراد کو ادا کیا جائے گا جن کا ذکر ایف آئی آر میں کیا گیا ہے۔
8 ستمبر 2014	کشمیر میں سیلاب کی وجہ سے ہائی کورٹ میں دائر اس پٹیشن پر سماعت نہیں ہوسکتی۔

14 اکتوبر 2014	ہائی کورٹ حکومت کو ہدایت دیتی ہے کہ وہ کنن پوش پورہ عصمت دری کے مجرموں کو معاوضہ ادا کرے اور عدالت میں ادا کردہ رقم کی رسید پیش کرے۔ عدالت کی جانب سے اس معاملے کی تحقیقات کے حوالے سے اسٹیٹس رپورٹ جمع کرانے کیلئے بھی کہا جاتا ہے۔ ایڈیشنل ایڈوکیٹ جنرل آر اے خان رپورٹ جمع کرانے کیلئے چار ہفتے کا وقت مانگتے ہیں۔
11 نومبر 2014	ریاستی حکومت ہائی کورٹ کو مطلع کرتی ہے کہ اس نے کنن اور پوش پورہ کے متاثرین کیلئے معاوضے کے حوالے سے اپنی ہدایات سپریم کورٹ میں چیلنج کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

چوتھا حصہ

''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری

کشمیر میں جنسی تشدد اور جرم سے استثنیٰ

آپ اس گاؤں کی صورت حال کے بارے میں کیا کہیں گے جہاں مسلح افواج کے ہاتھوں کم از کم 100 سے زائد خواتین کی اجتماعی عصمت دری کی گئی ہو جب مردوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا۔ آپ حکومتی مشینری کو کیسے سمجھیں گے جس نے سرے سے اس حقیقت کو ماننے سے ہی انکار کر دیا کہ اس واقعہ میں انسانیت کے تمام معیارات کو پامال کیا گیا ہے، اس کے برعکس حکومتی مشینری نے ظلم و بربریت کا نشانہ بننے والوں کے دعوؤں کو جھوٹا ثابت کیا اور الٹا ان پر غداری کا الزام لگا دیا؟ ان لوگوں کے بارے میں کوئی کیا کہہ سکتا ہے جنہوں نے تمام تر مخالف اور مشکل حالات کے خلاف ڈٹ کر کھڑا ہونا قبول کیا اور خود پر گزرے ایسے کو تاریخ کا مبہم حصہ نہ بننے دیا۔ ایک ایسے نظام کے اندر انصاف کے لیے لڑنے کی حالت زار کو کیسے بیان کیا جا سکتا ہے جو اس حد تک مضحکہ خیز اور منصفانہ سلوک سے کوسوں دور ہے؟

1991ء میں فروری کی ایک سرد رات میں جب چلہ کلاں ختم ہوتے تھوڑے ہی دن ہوئے تھے لوگ بہار کی آمد کے منتظر تھے یہ واقعات رونما ہوئے۔ گاؤں والوں کے مطابق اندھیرے کی آڑ میں بڑی تعداد میں خواتین کی اجتماعی عصمت دری کی گئی اور مردوں کو تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ مجرمان بھارتی فوج کی 4 راجپوتانہ رائفلز، 68 ماؤنٹین بریگیڈ کی ایک یونٹ تھی، جو دونوں دیہاتوں میں محاصرے اور تلاشی کی کارروائی کے لیے آئی تھی۔ فوجی کارروائی کسی اصول و ضابطے کے بغیر اندھا دھند تھی۔ انہوں نے حاملہ عورت سمیت 60 سال کی عمر کی

کنن پوش پورہ، مصنف۔ بشیر سدروزوی

خواتین اور 13 سال سے کم عمر لڑکیوں کی عصمت دری کی۔ ''کنن اور پوش پورہ'' کے دیہات سرحد پر واقع ہیں ، اس لئے کشمیر میں ضلع کپواڑہ میں یہ انتہائی عسکریت زدہ علاقہ ہے۔ درحقیقت، کپواڑہ جموں کشمیر میں سب سے زیادہ ملٹری کے زیر اثر ضلع ہے کشمیر بذات خود دنیا کا سب سے بڑا ملٹری زون ہے جہاں ایک اندازے کے مطابق 15,00,000 فوجی اور نیم فوجی دستے تعینات ہیں، یعنی ہر 9 شہریوں کے لیے ایک فوجی موجود ہے مگر کپواڑہ میں فوجیوں کی تعداد اس سے کئی زیادہ ہے گو کہ یہ کشمیری عوام کے خلاف انتہائی وحشیانہ کاروائی اور خواتین پر جنسی حملوں میں سے ایک تھا مگر یقینی طور پر صرف یہی واحد نہیں تھا۔ کشمیر میں حریت کا مقابلہ کرنے کے لیے عصمت دری فوج کی حکمت عملی کا حصہ رہی ہے۔

واقعہ کے بارے میں پہلی معلوماتی رپورٹ (ایف آئی آر) صرف گاؤں والوں کے مسلسل اصرار کی وجہ سے درج کی گئی۔ اس وقت کے ضلع مجسٹریٹ نے ہمدردی کا مظاہرہ کرتے ہوئے گاؤں کا دورہ کر کے ایک رپورٹ لکھ کر اس عمل میں مدد کی جس میں واقعہ کو تفصیل سے بیان کیا گیا، اور اسے بڑے پیمانے پر آگے پہنچایا گیا۔ واقعہ کے 15 دن بعد ایف آئی آر درج کی گئی۔ اس کے بعد پولیس کی تفتیش کا سلسلہ جاری رہا اور اسی طرح متاثرین کے دعووں کی تردید اور الزامات کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس وقت کے منتظمین اور حکومت کی طرف سے مقرر کردہ انکوائری کمیٹیوں کی پیش کردہ رپورٹوں میں خواتین پر جھوٹ بولنے اور 'عسکریت پسندوں کے دباؤ میں کام کرنے' کا الزام لگایا گیا تھا۔ کیس کو بالآخر 'غیر سرکاری طور پر ''سراغ نہ ملنے کے باعث' بند کر دیا گیا۔

20 سال سے مجرموں کے خلاف کوئی قانونی کارروائی نہیں ہوئی۔ گاؤں والے پرعزم طریقے سے لڑے اور 2004ء میں جموں و کشمیر کے ریاستی انسانی حقوق کمیشن (SHRC) سے رجوع کیا۔ 2011ء میں SHRC کے فیصلے میں اس کیس کی دوبارہ تحقیقات کا مطالبہ کیا گیا، لیکن اسے سرکاری حکام نے آسانی سے نظر انداز کر دیا۔ اپریل

2013ء میں، کشمیر کی 50 خواتین نے کیس کو دوبارہ کھولنے کے لیے ایک PIL دائر کی۔ ہائی کورٹ نے PIL کو 'قبل از وقت' قرار دیتے ہوئے مسترد کر دیا، اور یہاں تک کہ جب یہ تیار ہو رہی تھی، پولیس نے واقعہ کے 22 سال بعد پراسرار طریقے سے اس کیس میں ایک رسمی بندش کی رپورٹ درج کرائی (حالانکہ انہوں نے اکتوبر 1992ء میں اس کیس کو اپنی فائلوں میں بند قرار دیا تھا)۔ کپواڑہ سیشن کورٹ کے ایک مجسٹریٹ نے کیس کی مزید تحقیقات کا حکم دیا۔ اس کے باوجود عملی طور پر کوئی تحقیقات نہیں کی گئیں۔ اس واقعے کو ہوئے اب تین عشرے گزر چکے ہیں اور متاثرین میں سے کئی مر چکے ہیں۔ انصاف سے انکار جاری ہے۔ فوج کی طرف سے تردید اور تضادات کا سلسلہ ختم ہونے کے قریب نظر نہیں آتا، ریاست اور فوج دونوں عصمت دری کرنے والوں کو بچانے کی بھرپور کوشش کر رہے ہیں۔ حق و انصاف کی جدوجہد جاری ہے۔ یہ کتاب اس جدوجہد کی کہانی بیان کرتی ہے۔

☆......☆

’’کنن پوش پورہ‘‘ کہاں ہے؟

اب تک بہت سے قارئین جو کشمیر کے جغرافیہ، تاریخ اور اس سے منسلک سیاست سے واقف نہیں ہیں، ان کے ذہن میں بہت سے سوالات ضرور ہوں گے۔ ’’کنن پوش پورہ‘‘ میں لوگوں کو کیوں نشانہ بنایا گیا؟ اور آخر مسلح سپاہی ہی خواتین کی عصمت دری کیوں کریں؟

1990ء کی دہائی کے اوائل میں کشمیر میں ایک خوفناک جگہ تھی۔ میں (نتاشا) اس وقت بڑی ہو رہی تھی، اور میں نے ہمیشہ بڑوں کو یہ کہتے سنا کہ کشمیر بہت خوب صورت اور پرامن جگہ تھی۔ میرے لئے یہ تصور بھی ممکن نہیں تھا، ہمیشہ یہی سوچ کے حیران ہوتی کہ بم پھٹنے یا گولیاں چلنے کی آواز نہ سننا، خون خرابہ نہ دیکھنا اور کراس فائرنگ یا دستی بم حملوں میں کسی کی موت کی خبر نہ سننا کیسا لگتا ہوگا۔ میرا ماننا تھا کہ مطلق 'امن' کوئی حقیقت نہیں ہے، کہ یہ وہ نہیں جسے کوئی 'نارمل' کہہ سکے۔

اسکول میں موسم سرما کی تعطیلات کے دوران ہندوستان میں چھٹیاں گزارنے پر، میں اندھیرا ہونے کے بعد لوگوں کو باہر دیکھ کر حیران رہا کرتی کیونکہ کشمیر میں ہم نے کبھی ایسا نہیں کیا۔ میں سوچتی شاید وہاں کے لوگ زیادہ سمجھدار تھے۔ سورج غروب ہونے کے بعد کسی کو باہر نکلنا نہیں چاہیے۔ جو لوگ 1990ء کی دہائی کے کشمیر میں پلے بڑھے وہ میرے اس احساس کو زیادہ بہتر سمجھیں گے۔ بچپن میں ہمارے پاس کرنے کو زیادہ کچھ نہیں تھا، نہ کھیل کود، نہ باہر جانا اور نہ پکنک منانا کہ حالات ہی اتنے خراب تھے۔ میں سوچا کرتی یہ کیا انصاف ہے کہ کشمیر سے باہر رہنے والے میرے کزن اتنے سارے کام کر سکتے ہیں جب کہ میری زندگی صرف اسکول اور گھر تک ہی محدود تھی یا کبھی کبھار کزنز سے ملنے جانا جو میری ہی

طرح بے کیف زندگی گزار رہے تھے۔ ہم بچپن میں اپنے محدود دکھ بانٹتے تھے۔

مجھے سکھایا گیا کہ کشمیر زمین پر جنت ہے۔ پرانی نسل اس وقت کے بارے میں بات کرتی جب تمام بڑے بجٹ والی بالیووڈ فلموں کی عکس بندی یہاں ہوتی تھی۔ میرے چچا ماضی کے بالی ووڈ اداکاروں کے ساتھ لی گئی تصویریں فخریہ دکھاتے اور موج کشیر (مدر کشمیر) کی اذیت ناک صورتحال پر افسوس کا اظہار کیا کرتے تھے۔ میں نے یہ بھی جانا کہ ہم بلوری آنکھوں، گوری جلد اور سیب جیسے سرخ گالوں والے پرکشش لوگ سمجھے جاتے ہیں۔ وہ کہا کرتے کہ کشمیر میں آب و ہوا صاف اور شفاف ہے۔

بعد میں، میں نے پڑھا کہ کشمیر میں اور بھی بہت کچھ تھا۔ خونریزی اور گولیاں برساتی بندوقیں، جو میری پرورش کا ایک الگ اور اہم حصہ تھیں اور اس کا باعث یہ حقیقت تھی کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ تھا، اور ہے۔ تقسیم ہند کے وقت مسلم اکثریتی ریاست جموں و کشمیر کو ہندوستان اور پاکستان میں سے ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ ریاست کے اس وقت کے مہاراجہ ہری سنگھ ابھی تک فیصلہ کرنے سے قاصر تھے جب 1947ء میں جموں کے علاقے میں ان کی حکمرانی کے خلاف ایک اندرونی بغاوت ہوئی اور اسی دوران پاکستان کی طرف سے فوج اور قبائلیوں کے تقریباً بیک وقت حملے نے مہاراجہ کو بھارت سے فوجی مدد لینے پر مجبور کیا اور اس طرح کشمیر کے بھارت سے الحاق کے معاہدے پر 26 اکتوبر کو دستخط کیے گئے لیکن اسے امن و امان کی بحالی تک ایک عارضی انتظام ہونا چاہیے تھا یعنی جب تک کہ امن و امان بحال نہ ہو جائے۔

بھارت نے پاکستان کے خلاف اقوام متحدہ میں شکایت درج کرادی۔ اقوام متحدہ کی 1948ء میں منظور کی گئی قرارداد میں جنگ بندی اور پاکستان سے کشمیر سے اپنی افواج کو نکالنے اور کشمیر کے مستقبل کا تعین کرنے کے لیے استصواب رائے کا مطالبہ کیا گیا۔ پاکستان نے اپنی افواج کو واپس بلانے سے انکار کر دیا، اس کا دعویٰ تھا کہ فوج کا وہاں رہنا

آزادانہ اور منصفانہ رائے شماری کیلئے ضروری ہے۔اس نے کشمیر کے شمالی علاقوں بشمول گلگت اور بلتستان پر اپنا کنٹرول برقرار رکھا۔اس حصے کو 'آزاد کشمیر' یا پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کہا جاتا ہے۔کشمیر کے وسطی اور جنوبی حصوں، جموں اور لداخ کے علاقے پر بھارت کا کنٹرول ہے، جسے بہت سے لوگ 'مقبوضہ کشمیر کہتے ہیں۔ بھارت نے یہ ماننے سے انکار کر دیا کہ کشمیر ایک متنازعہ علاقہ ہے اور 1950ء میں کشمیر باضابطہ طور پر بھارت کا حصہ بن گیا اور آرٹیکل 370 کے تحت اسے خصوصی حیثیت دی گئی۔استصواب رائے کبھی نہیں کرایا گیا اور لوگوں میں دھوکہ دہی کا احساس تھا۔

کٹھ پتلی حکومتوں کے بعد کے سالوں اور 1953ء میں جموں وکشمیر کے پہلے وزیر اعظم، مقبول رہنما شیخ عبداللہ کی قید نے غداری اور غصے کے اس احساس کو مزید گہرا کر دیا۔اس طرح ہندوستان نے آزادانہ اور منصفانہ استصواب رائے کے انعقاد کے اپنے وعدے کو مسلسل نظر انداز کیا ہے اور دعویٰ کیا ہے کہ کشمیر ہندوستان کا اٹوٹ انگ ہے، یہ بیان اکثر تمام سیاست دان دہراتے ہیں اا ور یوں استصواب رائے کے کسی بھی آئندہ امکان کو رد کیا جاتا ہے۔کشمیری ایک عرصے سے اپنے حق خودارادیت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں۔

1987ء میں نیشنل کانفرنس نے مسلم یونائیٹڈ فرنٹ (MUF) کو شکست دینے کے لیے انتخابات میں دھاندلی کی تھی۔اس سے یہ یقین پیدا ہوا کہ کشمیر کے مسائل کے حل کے لیے تمام غیر متشدد اور سیاسی ذرائع کا گلا گھونٹ دیا گیا ہے۔وادی کشمیر میں مسلح بغاوت اور اس کے ساتھ ساتھ استصواب رائے اور حق خودارادیت کے لیے جدوجہد، شدت اختیار کر گئی۔1990ء کی دہائی میں عسکریت پسندی اپنے عروج پر تھی۔بہت سے نوجوان لائن آف کنٹرول (ایل او سی) کے دوسری طرف چلے گئے۔ بھارت پاکستان پر پاکستانی اور افغان عسکریت پسندوں کی دراندازی کا الزام لگاتا رہا ہے،اس کا دعویٰ ہے کہ اس طرح

بھارت کے ساتھ پراکسی جنگ جاری ہے لیکن پاکستان نے ان الزامات کی تردید کرتے ہوئے کہا ہے کہ وہ صرف ایک مسلم اقلیتی ملک میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں اور جبر کے خلاف جنگ میں کشمیری حریت پسندوں کی اخلاقی حمایت کر رہا ہے۔

عوامی مسلح بغاوت کا مقابلہ کرنے اور عسکریت پسندوں سے لڑنے کے لیے مسلح افواج کو بھاری تعداد میں تعینات کیا گیا۔اس کے بعد شہری علاقوں،قصبوں اور دیہاتوں میں بغاوت کا مقابلہ کرنے کے لیے فوجی آپریشن ہوئے۔تمام کشمیریوں کو دشمن کے طور پر دیکھا گیا۔عصمت دری جنگی حکمت عملی کا حصہ بن گئی۔ایسا ہی ایک فوجی آپریشن تھا جو ''کنن پوش پورہ''میں ہوا۔

''کنن پوش پورہ'' کپواڑہ کے گیریژن ضلع میں واقع ہے۔ کپواڑہ کشمیر کے خوبصورت ترین مقامات میں سے ایک ہے۔ یہ ابھی تک اپنی اصل اور قدیم حالت میں ہے کیوں کہ وہاں کوئی زیادہ سیاحت نہیں ہوئی ہے۔ یہ سری نگر کے مرکزی شہر کے شمال میں تقریباً 90 کلومیٹر کے فاصلے پر ہے، سری نگر، بارہ مولا ہائی وے کے ساتھ تین گھنٹے کا سفر ہے جس کا رخ آخر میں پاکستان میں مظفرآباد کی طرف ہوجاتا ہے۔کپواڑہ کا سفر بہت دلچسپ اور پرفریب راہوں سے بھرا ہوا ہے۔پس منظر میں خوبصورت پہاڑ اور کھیت ہیں، اور سڑکوں پر بہت سے سخت نظر فوجی دستے ہیں۔راستے میں سیب کے باغات، چاول کے کھیت اور چنار کے قدیم درخت جن میں سے کچھ تقریباً ایک صدی پرانے ہیں۔آپ پل ہالن اور سوپور جیسے قصبوں سے بھی گزرتے ہیں۔ان جگہوں کی شناخت لوگوں کو خاص طور پر 2010ء کی عوامی بغاوت کے دوران ہوئی زبردست مزاحمت کی وجہ سے 'فسادزدہ' کہا جاتا ہے۔

بارڈر روڈز آرگنائزیشن کی طرف سے ہائی وے کی بہت اچھی طرح دیکھ بھال کی جاتی ہے، خاص طور پر بھاری فوجی گاڑیوں کی آمدورفت کیلئے، آپ کو راستے میں بہت

سے فوجی دستے اور فوجی قافلے نظر آتے ہیں۔ان قافلوں کی وجہ سے ٹریفک نہایت سست رہتا ہے مگر ڈرائیوروں کو اپنا راستہ بنانا اور ان سے آگے نکل جانا آ گیا ہے۔ یہ 1990ء اور 2000ء کی دہائی کے اوائل سے مختلف صورتحال ہے، جب لاٹھی اور بندوق بردار فوجی دستے اپنا راستہ صاف رکھتے اور جنبش کی ہمت کرنے والے کسی بھی شخص یا گاڑی کی ٹھکائی کر دیتے تھے۔ جیسے جیسے آپ کپواڑہ اور ایل او سی کے قریب پہنچتے ہیں، آپ کو زیادہ فوجی اور زیادہ قافلے نظر آنے لگتے ہیں۔آپ کے کان بند ہیں کیونکہ آپ انتہائی بلندی پر ہیں۔ راستے میں بہت سے کیمپ ہیں، جو خاردار تاروں سے گھرے ہوئے ہیں۔فوجی ان کیمپوں کے باہر کھڑے گاڑیوں اور لوگوں کی نقل وحرکت پر گہری نظر رکھتے ہیں۔کچھ جگہوں پر آپ کو مقامی لوگوں سے زیادہ فوجی نظر آتے ہیں۔

آپ کو معلوم ہے کہ آپ کپواڑہ پہنچ چکے ہیں جب آپ اپنے دائیں طرف بڑے بڑے پہاڑ دیکھتے ہیں، اتنے قریب کہ آپ کو لگتا ہے کہ آپ انہیں تقریباً چھو سکتے ہیں، اور جب آپ اپنے بائیں طرف ڈسٹرکٹ کورٹ کمپلیکس دیکھتے ہیں۔ یہاں آپ کو ضلعی پولیس لائنز اور ضلعی ہیڈ کوارٹر نظر آتے ہیں۔ کپواڑہ میں ایک سیاحتی استقبالیہ مرکز ہے، حالانکہ یہ جگہ درحقیقت سیاحتی مقام نہیں ہے۔ کپواڑہ اپنے گھنے جنگلات اور درختوں کی مختلف اقسام کیلئے مشہور ہے۔ مجھے یہ خوفناک اور دلچسپ لگتا ہے۔

کپواڑہ سری نگر سے زیادہ ٹھنڈا ہے اور چونکہ یہ زیادہ اونچائی پر ہے اس لیے یہاں زیادہ برف پڑتی ہے۔موسم سرما کی انتہائی ٹھنڈ میں چلا کلاں میں تین سے چار فٹ برف عام ہے۔ ایسے میں کپواڑہ آنے اور جانے کا سفر بہت مشکل ہو جاتا ہے۔ برف صاف کرنے والی مشینیں ہائی وے سے جلد از جلد برف ہٹاتی ہیں لیکن دوسرے قصبوں اور دیہاتوں کو جانے والی سڑکیں بند رہتی ہیں۔ برف کو اپنے راستے سے ہٹانے کے لیے لوگ عام طور پر بیلچے کا استعمال کرتے ہیں۔

کپواڑہ وہ جگہ تھی جہاں عسکریت پسند ایل او سی کے دوسری طرف جانے سے پہلے رکتے تھے، یہی وجہ ہے کہ یہ ہمیشہ سیکورٹی ریڈار پر رہتا تھا اور یہاں شہریوں کی کڑی نگرانی کی جاتی تھی۔ درحقیقت، کپواڑہ نے 1990ء کی دہائی میں تشدد کی کچھ انتہائی بھیانک شکلیں دیکھی ہیں، جب کشمیر میں مسلح مزاحمتی تحریک اپنے عروج پر تھی۔کشمیر میں کسی بھی جگہ کے مقابلے میں کپواڑہ میں محاصرہ اور تلاشی کی کارروائیاں یا 'کریک ڈاؤن' زیادہ عام رہا ہے۔ کپواڑہ کے لوگ انسانی حقوق کی خوفناک خلاف ورزیوں، جبری مشقت، گمشدگیوں، ماورائے عدالت قتل، تشدد، انتقامی کارروائیوں اور عوامی عصمت دری کا شکار جموں وکشمیر کے بقیہ حصوں سے بھی زیادہ تباہ کن حد تک متاثر ہوئے ہیں۔

''کنن پوش پورہ''، کپواڑہ کے ترہ گام بلاک میں واقع ہے۔ترہ گام مقبول بٹ کا گھر تھا، جو کشمیر میں آزادی کی جدوجہد کے علمبردار اور آزادی کے حامی رہنما تھے، جنہیں 1984ء میں تہاڑ جیل میں دوہرے قتل کے الزام میں پھانسی دی گئی تھی۔ وہ شہید اعظم یا 'عظیم شہید' کے نام سے مشہور ہیں۔ترہ گام میں ''کنن'' اور ''پوش پورہ''، دو الگ الگ گاؤں ہیں یہاں تک کہ ایک بدقسمت واقعے اور مشترکہ جدوجہد نے انہیں ایک کر دیا۔آج ان دونوں کو ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا۔

''کنن پوش پورہ'' ایل او سی سے کم از کم 60 کلومیٹر دور ہے۔ کپواڑہ سے وہاں جانے والی سڑک عام طور پر دیہی علاقے سے گزرتی ہے، جس میں بہت سے موڑ اور ابھار آپ کو ہلا ڈالتے ہیں۔راستے میں خوب صورت کھیت ہیں۔موسم بہار میں، زمین پر دور تک سرسوں کے پھولوں کے ساتھ ایک چمکدار پیلا رنگ نمایاں رہتا ہے اور گرمیوں میں ہر جانب پرسکون سبز رنگ چھایا رہتا ہے، پس منظر میں برف سے ڈھکے پہاڑ انتہائی حسین منظر پیش کرتے ہیں۔گرمی کے آخر تک پہاڑوں پر جمی برف نہیں پگھلتی۔ کاشتکار، مرد اور عورتیں دونوں، کمر جھکائے ہوئے، اپنے کھیتوں میں انتھک محنت کرتے دیکھے جا سکتے

ہیں۔ ہوا اتنی تازہ اور صاف ہے کسی اور دنیا میں سانس لینے کا گمان ہوتا ہے۔ میں ہمیشہ اپنے پھیپھڑوں کو زیادہ سے زیادہ آکسیجن سے بھر لیتی ہوں۔ اے فار ایپل اور بی فار بال کے نعرے لگانے والے بچوں کی آوازیں آپ کو کنن میں خوش آمدید کہتی ہیں۔ دیہات کے قریب سڑکیں تنگ ہیں لیکن تقریباً مکمل طور پر پکی اور پختہ ہیں جو دور دراز گاؤں کے لیے غیر معمولی بات ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہاں مرد اور عورتیں کام کرتے ہیں، کچھ عورتیں اپنے آنگنوں میں چاول بھر رہی ہیں، بچے شور مچاتے ہوئے کھیل رہے ہیں اور بوڑھے لوگ صحن میں بیٹھے کانگڑی یا دوپہر کی دھوپ میں خود کو حرارت پہنچا رہے ہیں۔ گاؤں میں بہت سے غلہ جات ہیں۔ ہوا گوبر کی خوشبو سے بھر جاتی ہے جب اسے لے جانے والی خواتین وہاں سے گزرتی ہیں۔ تازہ بادام کی مرتکز بو بھی ہے۔ ٹن کی چھتوں والے کچھ نئے تعمیر شدہ کنکریٹ کے ساتھ روایتی مٹی کے گھر۔ خواتین آپ کو دیکھ کر مسکراتی ہیں۔ مرد بات کرنے کے لیے رک جاتے ہیں اور پوچھتے ہیں، 'کہاں سے آئے ہیں آپ؟' تھوڑا مزید آگے چلتے ہیں تو ''پوش پورہ'' آ جاتا ہے اور یہ تقریباً ''کنن'' جیسا ہی لگتا اور محسوس ہوتا ہے۔

اپریل 2014ء میں اس دن بوندا باندی ہو رہی تھی۔ مجھے ''کنن پوش پورہ'' میں آرام دہ فرنشڈ کمرے کی ٹین کی چھت سے بارش کی بوندوں کا ٹکرانا سنائی دے رہا تھا۔ باہر صحن میں کھلنے والی کھڑکی کے سبب ہلکی سی سردی تھی۔ آسمان پر سیاہ بادل چھائے ہوئے تھے۔ ایک لڑکا کھڑکی سے ٹیک لگائے کمرے کی طرف دیکھ رہا تھا، اور وہاں موجود ہلکی سی روشنی کو روک رہا تھا۔ ہم باہر ایک شراکتی دیہی جائزہ مشق کرنا چاہتے تھے، جس طرح مجھے سماجی کام میں اپنے کورس کے دوران سکھایا گیا تھا۔ ہمیں چارٹ پیپرز اور مارکر استعمال کرنے پر اکتفا کرنا پڑا کیونکہ بارش تھمنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ میں نے ان کے سامنے کاغذ کی ایک بڑی سفید شیٹ پھیلائی اور پانچ عمر رسیدہ افراد چاروں طرف بیٹھ گئے۔ میں نے

ان میں سے ایک کو مارکر پیش کیا لیکن اس نے انکار کر دیا اور اپنا قلم استعمال کرنے پر اصرار کیا۔ میں بوڑھے کی ضد پر مسکرائی۔

جیسے ہی اس نے کاغذ پر کالی لکیریں لگانا شروع کیں، دوسرے آدمیوں نے اسے ٹوکا۔ جلد ہی چارٹ پیپر نقطوں اور کچھ شکلوں سے بھرا ہوا تھا جو گھروں کی طرح لگ رہے تھے۔ ایک راستہ بنایا گیا اور جن گھروں میں عصمت دری ہوئی تھی ان پر بھی نشان لگا دیے گئے۔ آپس میں بحث ہوئی، اختلاف ہوا اور دلائل دیئے گئے۔ اور پھر، کچھ ہی دیر میں، نقشہ تیار ہو گیا۔

میں نے ہمیشہ یہی سوچا تھا کہ یہ گاؤں اداسی اور مایوسی کی آغوش میں گھرا ہو گا کہ اتنے بڑے سانحے کے بعد یہ قدرتی امر ہے لیکن جونہی سری نگر کی بے چینی اور ہنگامے سے دور وہاں پہنچی، میں نے ایک عجیب سا سکون محسوس کیا۔ یہ سکون دلفریب تھا۔ کاروبارِ زندگی رواں دواں تھا۔ 23 سال بعد، بچے بڑے ہو چکے تھے اور ان کے اپنے بچے تھے، مرد اور عورتیں بوڑھے ہو چکے تھے اور بہت سے بوڑھے مر چکے تھے۔ بظاہر ایسا لگتا تھا جیسے اس وقت کے نشانات اب نظر نہیں آتے لیکن گاؤں والے اپنی جدوجہد میں ثابت قدم اور پرعزم تھے۔ ''کنن پوش پورہ'' میں اس بدقسمت رات جو کچھ ہوا وہ اس مخصوص حکمت عملی کا ایک خاص نمونہ ہے جو مسلح افواج نے کشمیر میں جدوجہد کو کچلنے کے لیے استعمال کی تھی لیکن کنن پوش پورہ واحد گاؤں نہیں تھا جسے 1990ء کی دہائی میں فوج کے اس طرح کے مظالم کا سامنا کرنا پڑا تھا۔ ماحول ہی ایسا تھا کہ کوئی جگہ محفوظ نہ تھی۔

کنن پوش پورہ میں اجتماعی عصمت دری کا واقعہ پیش آنے سے چھ ماہ قبل، کنن پوشپورہ سے بمشکل 10 کلومیٹر دور بالی پورہ۔ پازی پورہ سے بھی ایسا ہی ایک واقعہ رپورٹ ہوا تھا۔ 10 اگست 1990ء کو، 68 بریگیڈ کی 6 راجپوت رجمنٹ کا ایک فوجی قافلہ عسکریت پسندوں کے ساتھ شدید لڑائی میں مصروف تھا۔ دوطرفہ فائرنگ کے دوران تمام

صحتمند مرد پازی پورہ سے نکل گئے تھے اور خواتین نے بالی پورہ کے ملحقہ گاؤں میں پناہ لی تھی۔ مسلح تصادم کے بعد پازی پورہ سے فرار ہونے والی تمام خواتین کو ایک گائے خانہ میں جمع کیا گیا تھا۔

جسٹس بہاؤالدین فاروقی اپنی کتاب Kashmir-Aflame کی دوسری جلد میں لکھتے ہیں کہ ”ایک کشادہ مکان میں 20 سے 30 کے قریب خواتین جمع تھیں۔ فوجی جوان ان پر گدھوں کی طرح جھپٹے۔ ”جئے ہند“ وغیرہ کے نعرے لگانے کے بعد ایک ایک کر کے ان کی عصمت دری کی گئی۔

سکھ منی سنگھ کے مضمون 'محافظ یا شکاری؟' کے مطابق، تقریباً 8-10 خواتین کے ساتھ 8-10 مردوں نے عصمت دری کی۔ 1990ء کی دہائی میں کپواڑہ میں اسی طرح کے کئی اور واقعات درج ہوئے۔ Illustrated Weekly کے اسی مضمون میں، اس سال کے آغاز سے لے کر اب تک اس طرح کے آٹھ مقدمات درج کیے گئے تھے۔ ان میں، ' کپواڑہ کے خوب صورت ترہ گام گاؤں کی نوجوان لڑکیاں' شامل تھیں جنہیں 'ان کے گھروں کے اندر تنہا گھسیٹ کر لے جایا گیا اور بیلٹ اور رائفل بلب سے لے کر بجلی کے جھٹکے اور مختلف قسم کے جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔

کپواڑہ کے ایک اور پُرسکون گاؤں چوکیبل کے قریب ایک کیس، جہاں 'ایک جوڑے کو گرفتار کر کے فوجی کیمپ لے جایا گیا جہاں شوہر کو درخت سے باندھ دیا گیا جب کہ اس کی بیوی کو جوانوں نے زیادتی کا نشانہ بنایا،' کپواڑہ قصبے کا ایک اور معاملہ، جہاں کریک ڈاؤن کے دوران، 'ایک 26 سالہ لڑکی (نام ظاہر نہیں کیا گیا) کو تین جوانوں نے تنہا پا کر پکڑ لیا 'اس کے بچے کو اس کے بازو سے چھین لیا اور اسے اپنی رائفل کے بٹوں سے زمین پر گرا دیا۔ اس کے بعد انہوں نے اسے اپنے ہی کپڑوں سے باندھا، اس کا کرتہ پھاڑ دیا، اور اس کی عصمت دری کی۔ ان میں سے ایک نے اپنے بوٹ کو اس کے بچے کے سینے پر رکھ کر

دبایا تا کہ وہ ان کی درندگی دیکھ کر رو نہ سکے۔ یہ عمل ایک گھنٹے تک جاری رہا، جس کے بعد وہ بے ہوش ہو گئی۔

کپواڑہ میں عصمت دری اور قتل کی زیادہ تعداد بالواسطہ طور پر ہتھیار اٹھانے والوں کو نشانہ بنانے کے لیے جاری اس جنگ کی نشاندہی کرتی تھی جو عام شہریوں کے خلاف لڑی جا رہی تھی، گو کہ کشمیر میں کوئی بھی جگہ مسلح جدوجہد اور ہندوستانی مسلح افواج کی جوابی کارروائی کے اثرات سے پاک ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتی لیکن کپواڑہ کی خصوصی صورتحال کا اندازہ کشمیر کے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس کے 1990ء میں السٹریٹڈ ویکلی کو دیئے گئے انٹرویو کے دوران اس بیان سے لگایا جا سکتا ہے جہاں کپواڑہ کے تئیں ریاست کا رویہ اور 'عسکریت پسندی' کو روکنے کے لیے جنسی تشدد کے استعمال کا جواز سامنے آتا ہے۔ انٹرویو کرنے والے کا سوال تھا کہ کپواڑہ میں ہی سب سے زیادہ عصمت دری اور دیگر مظالم و تشدد کیوں ہوئے ہیں؟ جس کے جواب میں ڈی جی پی سکسینہ نے کہا ”کیونکہ یہ بری طرح سے (دہشت گردوں سے) متاثرہ علاقہ ہے۔ اُدھر تو جہاں پیر ماریں وہاں ہتھیار ملتے ہیں“۔

اس بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ فوج کشمیر میں اپنے آپریشن کے معاملے میں لاپرواہ اور متکبر تھی اور جوابی کارروائی کی حکمت عملی کے طور پر ان کے لیے سب کچھ جائز تھا۔ یہ مجھے اس گفتگو کی یاد دلاتا ہے جو میری اپنے والد کے ساتھ 1990ء کی دہائی کے آخر میں ہوئی تھی۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مشہور ہل اسٹیشنوں میں سے کون سا اسٹیشن سب سے خوب صورت اور بہترین ہے، گل مرگ یا پہلگام؟ اس پر میرے والد کا جواب تھا دونوں ہی نہیں بلکہ تمہیں اس کے لیے کپواڑہ میں وادی لولاب جانا چاہئے۔ یہ سب سے زیادہ دلکش جگہ ہے جو میں نے آج تک دیکھی ہے۔ اس پر میرے یہ پوچھنے پر کہ کیا آپ مجھے وہاں لے جائیں گے؟ انہوں نے کہا تھا بے وقوف مت بنو۔ کپواڑہ سے زندہ واپسی کا مشکل سے ہی کوئی امکان ہے۔

1990ء کی دہائی میں کپواڑہ میں ایسا ماحول تھا کہ یہ سب سے زیادہ خوفناک جگہوں میں سے ایک تھی۔ کپواڑہ کا دورہ کرنے کا مطلب سیدھا میدان جنگ میں قدم رکھنا اور اپنے آپ کو خطرے میں ڈالنا تھا۔ آج بھی کپواڑہ جانے کا خیال بہت سے لوگوں کو خوفزدہ کر دیتا ہے اور میں نے لاتعداد بار وہاں جانے کی خواہش ترک کی ہے۔ کنن اور پوش پورہ میں اجتماعی عصمت دری کا واقعہ کسی بھی طرح سے منفرد نہیں تھا لیکن یقیناً یہ ہندوستان میں اجتماعی عصمت دری کا سب سے بڑا واقعہ ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ یہ واقعہ کشمیری خواتین کی جدوجہد کا مظہر بن چکا ہے کیوں کہ ''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں نے غیر متزلزل ہمت اور زبردست مزاحمت کا مظاہرہ کیا ہے جو کہ قابض عسکری گرفت میں جکڑے بے بس لوگوں کے لیے غیر معمولی بات ہے۔ کسی وجہ کے بغیر لوگوں کی نظروں میں آنے والا کوئی بھی اس کی خواہش نہیں کرے گا، خاص طور پر ایک ایسے وقت میں جب لوگوں کے ذہنوں پر ممکنہ تشدد، عصمت دری، قتل، جبری گمشدگی کا خوف سوار ہو مگر ''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں نے ان حالات میں بھی ہار نہیں مانی۔ ان کی جدوجہد اس وقت شروع ہوئی جب تشدد کی اس بدترین رات یعنی ان کے گاؤں کی تاریخ کی سیاہ ترین رات کے بعد صبح کا سورج طلوع ہوا۔

☆......☆

عصمت دری بطور انتقام

اس حقیقت کے باوجود کہ ہمیں ہر وقت ریپ عصمت دری کا خطرہ رہتا ہے، کشمیر میں ریپ ایک ممنوعہ لفظ ہے۔ نوجوان لڑکیوں کیلئے یہ سمجھا جاتا ہے کہ انہیں اس کا استعمال نہیں کرنا اور نہ ہی انہیں یہ معلوم ہونا چاہئے کہ اس کا کیا مطلب ہے۔ لیکن میں جانتی تھی، میری دوست جانتی تھیں، دوپہر کے کھانے کے وقفے یا جب کلاس نہ ہوتی اس دوران ہم اس ڈر سے کہ کہیں استاد ہماری بات نہ سن لے یا اس بارے میں بات کرنے پر شاید ہمیں سزا دے، دبی آوازوں میں ریپ کے بارے میں باتیں کرتے، اور آپ کیوں نہ جانتے؟ عصمت دری ایک عام بات تھی۔ اسکول کے باہر، بس اسٹاپ کے پاس، میری گلی کے کونے میں، یا کہیں بھی ہر دم موجود تلخ چہرے والے بھاری فوجی کچھ بھی کر سکتے تھے: قتل، اغوا، عصمت دری۔ میں ان سے ڈرتی تھی، ان کے چہرے دیکھ کر مجھے خوف محسوس ہوتا تھا۔ ان کی فوجی وردی اور ان کے ناقابل فہم ارادے بدحواس کر دیتے تھے۔ فوجی ہر صبح اور شام سڑکوں پر گشت کرتے تھے۔ اگر وہ مجھے کہیں ملتے تو میں ہمیشہ سڑک کے دوسری طرف چل دیتی اور دل میں دعا کرتی کہ مجھے جانے دیں اور میں کسی محفوظ جگہ پر پہنچ جاؤں۔

ہر چند ہفتوں یا مہینوں میں فوج کی طرف سے کریک ڈاؤن کیا جاتا تھا۔ وہ گھروں میں گھس کر بندوقیں، دستی بم یا ایل او سی کے دوسری طرف سے روابط کا کوئی سراغ تلاش کرتے تھے۔ وہ گھر کو الٹ پلٹ کر رکھ دیتے، گدے پلٹ دیتے، چاول اور دالیں بکھیر دیتے، درازیں اور الماریاں سب کھول کر خالی کر دیتے اور بالا خانے میں تلاشی کے لئے جا گھستے تھے۔ میں اپنے چچا زاد بھائی کی بغل میں خوفزدہ بیٹھی ان کے گھر سے نکلنے کا

انتظار کرتی تھی۔ اس دوران میں نے کبھی اوپر دیکھنے کی ہمت نہیں کی۔ میں سمجھتی تھی کہ ریپ قتل یا تشدد سے بھی بدتر ہے۔ میری زندگی میں ایک وقت ایسا بھی آیا جب میں نے لڑکی ہونے پر ندامت محسوس کی کیونکہ میں کمزور تھی۔ میری پرورش سرینگر شہر کے وسط میں ہوئی۔ میں مسلح جدوجہد میں شامل کسی کو نہیں جانتی تھی۔ زندگی کے تقریباً بیس سال تک میں اس مسلسل قتل و غارت اور خونریزی کی وجوہات سے بے خبر رہی۔ پھر بھی میں ڈرتی تھی، نہیں بلکہ خوفزدہ تھی، ہندوستانی مسلح افواج نے ہمارے ذہنی حالت ہی ایسی بنادی تھی کہ لوگ خواہ وہ مسلح جدوجہد سے وابستہ تھے یا نہیں، سبھی کو نشانہ بنائے جانے کا خطرہ تھا۔

1990ء کی دہائی کے اوائل میں، جب مسلح جدوجہد نے زور پکڑا اور عوامی حمایت حاصل کی، تو اسے روکنے کیلئے فوج کو تعینات کیا گیا تھا۔ فوج کا واحد مقصد کسی بھی طرح سے مزاحمت کو روکنا تھا، اور وہ اپنے ترکش میں بہت سے جوابی جارحانہ ہتھیاروں کے ساتھ پوری طرح تیار تھی۔ لوگوں کو ڈرایا دھمکایا گیا، محض شک کی بنیاد پر اٹھایا گیا، گرفتار کیا گیا، غائب کر دیا گیا، تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اکثر کو قتل کر دیا گیا۔ جیسا کہ دنیا بھر کے تنازعات کا شکار علاقوں میں عام ہے، کشمیر میں فوجی کارروائیوں کے ایک حصے کے طور پر، عصمت دری کو لوگوں کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کرنے کے لئے ایک طاقتور ہتھیار کے طور پر استعمال کیا گیا تھا، یہ لوگوں کے 'اجتماعی جرم' کا آسان بدلہ ہے، مخالف ہونے کا جرم اور بھارتی ریاست کے ساتھ بے وفائی، جو کم از کم تمام کشمیری مسلمانوں کو قصوروار ٹھہراتی ہے۔ فوجی قبضے کے خلاف جدوجہد میں عوام کو ڈرانے دھمکانے، ذلیل کرنے، نیچا دکھانے اور ان کے جذبے کو سرد کرنے کے لئے عصمت دری کو حکمت عملی اور منظم طریقے سے استعمال کیا گیا ہے چنانچہ عصمت دری کو کشمیری عوام کے لئے سزا کی ایک شکل کے طور پر استعمال کیا گیا ہے، جو غیر منصفانہ بالادستی کے خلاف اٹھ کھڑے ہونے کی سزا ہے۔

کشمیر میں جارحانہ اور جوابی جارحانہ اقدامات میں تیزی آنے کے ساتھ، ہندوستانی

مسلح افواج کی طرف سے عصمت دری کے ارتکاب کے بارے میں خبریں عام ہو گئیں۔ جلد ہی یہ کشمیر کی سوختہ حال وادی کے المیے کی علامت بن گیا۔ "Medicins Sans Frontieres(2006)" کے ذریعہ ہوئی ایک اسٹڈی کے دوران کئے گئے سوال کا جواب دینے والوں میں سے 67 فیصد 1989ء کے بعد سے شمالی کشمیر کے کپواڑہ ضلع کے کرال پورہ بلاک (جہاں کنن پوش پورہ بھی واقع ہے) میں عصمت دری یا چھیڑ چھاڑ کے واقعات کے عینی شاہد نکلے، اس سے یہ نتیجہ اخذ ہوا کہ کشمیری خواتین دنیا میں جس قدر جنسی تشدد کا شکار ہیں اتنا جنسی تشدد دنیا کے کسی خطے میں نہیں۔ رپورٹ میں مزید کہا گیا ہے کہ 1989ء میں کشمیر میں مسلح جدوجہد کے آغاز کے بعد سے کشمیری خواتین پر باقاعدگی سے جنسی تشدد کیا جاتا رہا ہے جس میں 11.6 فیصد رائے دہندگان نے کہا کہ وہ جنسی استحصال کا شکار ہیں۔

جب آپ اس طرح کے جنگی علاقے میں رہتے ہیں، تو محفوظ اور خطرناک کے درمیان کوئی حد بندی نہیں کی جاسکتی، کوئی بھی جگہ نقصان کے راستے سے باہر نہیں ہے، آپ مسلسل خطرے میں رہتے ہیں، یہاں تک کہ گھر تک محفوظ پناہ گاہ نہیں رہے۔ خواتین کے لئے ہر صورت حال اہم ہوتی ہے۔ کشمیر میں خواتین کے لیے کوئی محفوظ جگہ نہیں تھی، خاص طور پر اگر وہ کسی بھی طرح سے عسکریت پسندوں سے وابستہ ہوں۔ بھارتی مسلح افواج کے لیے لوگوں کے گھر اب 'نو انٹری' زون نہیں رہے بلکہ وہ میدان جنگ کا حصہ بن گئے۔ ٹارگٹڈ ریپ اور جنسی تشدد جنگجوؤں کے لئے بالواسطہ سزا بن گئے، جوابی کارروائی اور محکومی کے لئے ایک اہم آلہ۔ وہ خواتین جن پر عسکریت پسندوں سے تعلق کا شبہ تھا، یا جن پر انہیں رہائش دینے یا کھانا کھلانے کا شک تھا انہی کو نشانہ بنایا گیا۔ اگرچہ ہم اس حقیقت کو ثابت نہیں کر سکے لیکن ایک محقق کے مطابق ''کنن پوش پورہ'' سے تعلق رکھنے والی ایک خاتون جس کا تعلق ایک 'ہتھیار ڈالنے والے عسکریت پسند' سے تھا، کو 1992ء میں غیر قانونی طور پر حراست میں لے کر ریپ اور جنسی تشدد کا نشانہ بنایا گیا اور اس کے جنسی اعضاء سے بجلی گزاری گئی۔

2 جنوری 1992ء کو پیش آنے والے ایک واقعہ میں 5 راشٹریہ رائفلز کے ایک میجر اور دیگر اہلکار ضلع اننت ناگ کے ریسی پورہ میں ایک مقامی شخص کے گھر میں گھس گئے۔ ان لوگوں کے والد حزب المجاہدین کے ایک عسکریت پسند کے سسر تھے۔ اہل خانہ پر حملہ کیا گیا اور والد کو اغوا کر لیا گیا۔ میجر نے بڑی بیٹی کی عصمت دری کی اور چھوٹی بیٹی کو دوسرے کمرے میں دیگر فوجی اہلکاروں نے زیادتی کا نشانہ بنایا۔ تقریباً 90 منٹ کے بعد 5 آر آر کے اہلکار گھر سے نکل گئے اور اسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ ریپ کا نشانہ بننے والی دونوں بہنوں نے ایک ندی کے کنارے بنے باتھ روم میں رات گزاری اور ان کے والد تب سے لاپتہ ہیں۔ ہمیشہ کی طرح، اس معاملے میں ایک ایف آئی آر درج کی گئی تھی جس کے بعد بے نتیجہ تحقیقات کا سلسلہ شروع ہوا۔ دستیاب دستاویزات سے یہ نہیں پتہ چلتا کہ آیا اس معاملے میں کوئی کورٹ مارشل بھی کیا گیا تھا۔

انتقامی عصمت دری کے ایک اور واقعے میں، 10 اکتوبر 1992ء کی رات کو شوپیاں کے چک سید پورہ گاؤں میں 22 گرینیڈیئرز کے ایک یونٹ کے ذریعہ سرچ آپریشن کے دوران چھ (ممکنہ طور پر نو) خواتین کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔ مرنے والوں میں ایک 11 سالہ لڑکی اور ایک 60 سالہ خاتون شامل تھیں۔ میڈیکل رپورٹس میں عصمت دری کی تصدیق ہوئی ہے۔ کسی فوجی پر مقدمہ نہیں چلایا گیا۔ دراصل حکومت کے بیان میں کہا گیا ہے کہ مبینہ طور پر ریپ کا نشانہ بننے والی دو خواتین حزب المجاہدین نامی عسکریت پسند گروپ کے کمانڈروں کی بیویاں تھیں۔ حکومت کا یہ بیان اس بات کا ثبوت ہے کہ عصمت دری کو عسکریت پسندوں سے وابستہ افراد کو دی جانے والی جائز سزا کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔

بعض اوقات عصمت دری اندھا دھند کی جاتی تھی کیونکہ یہ کشمیری مسلمان تھے اور غلط وقت پر غلط جگہ پر ہوتے تھے۔ عصمت دری کا استعمال عسکریت پسندوں کو پناہ دینے پر یا اس گاؤں میں بھی کیا جاتا تھا جہاں مسلح افواج پر گھات لگا کر حملہ کیا گیا تھا، جیسا کہ بڑی پورہ

کے معاملے میں ہوا تھا، جس کا پہلے ذکر کیا گیا ہے۔ مجرموں نے 'جئے ہند' کا نعرہ لگاتے ہوئے تقریباً آٹھ خواتین کی عصمت دری کی جس سے یہ بھی پتہ چلتا ہے کہ ریپ کو قومیت کے تصور سے کس طرح جوڑا جاتا ہے۔

کسی شخص کے لئے یہ دیکھنا یا سننا ناقابل برداشت ہوگا کہ اس کے خاندان کی خواتین کو اس شخص سے تعلق رکھنے یا تحریک کے ہمدرد ہونے کی سزا کے طور پر عصمت دری یا جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔ ایک عورت کی عصمت دری کو اس کے خاندان کے وقار اور عزت کے احساس پر ایک مستقل دھبے کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ جیسا کہ سیما قاضی کہتی ہیں، 'فوج کی جانب سے کشمیری مسلم خواتین کا جنسی استحصال نہ صرف ایک طاقتور سیاسی ہتھیار کے طور پر ہی نہیں بلکہ کشمیری مسلم مردوں کی اجتماعی بے عزتی کرنے کے لیے ایک ثقافتی ہتھیار کے طور پر بھی کام کرتا ہے۔

کشمیری معاشرہ جدیدیت اور روایت کے درمیان اپنے تضادات سے گزرا ہے اور کشمیر کی ہر چیز کی طرح صنفی تعلقات میں بھی عسکریت پسندی کا کردار ہے۔ آج معاشرہ آہستہ آہستہ تبدیلی کو قبول کر رہا ہے، لیکن 1990ء کی دہائی میں، یہ انتہائی قدامت پسند تھا۔ لوگ بلا جھجک اور بلاشبہ عزت و پاکیزگی کے اصولوں اور قواعد کی پاسداری کرتے تھے۔ ان اصولوں میں سے ایک یہ ہے کہ خواتین کو خاندان کی عزت اور وقار کو برقرار رکھنا چاہئے۔ یہ قاعدہ صرف کشمیر کے لیے مخصوص نہیں ہے بلکہ یہ ایک ایسا تصور ہے جس پر پورے برصغیر میں وسیع پیمانے پر یقین کیا جاتا ہے۔ اگرچہ مجھے گھر پر یہ کبھی واضح طور پر نہیں سکھایا گیا تھا، لیکن میں نے کسی نہ کسی طرح اسے اپنا لیا۔ مجھے یقین تھا کہ بیٹی کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ اپنے خاندان کی عزت برقرار رکھنے کی کوشش کرنی چاہئے۔ میرا طرز عمل قابل ستائش ہونا چاہیے۔ مجھ پر میرے گھر والوں کی طرف سے کامل، باوقار خاتون بننے کے لئے کوئی دباؤ نہیں تھا، لیکن میں ایسی لڑکیوں کو جانتی ہوں جو بہت سخت پس منظر سے آتی ہیں جن کے

پاس اس کردار کو سنبھالنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہے،ان کے کردار یا طرز عمل کے بارے میں کوئی بھی سوال، مثال کے طور پر اگر انہیں طلاق ہوجاتی ہے، تو یہ ان کے خاندان کی ساکھ کا معاملہ بن جاتا ہے،ایک عورت کی توہین کا مطلب ہے ایک پورے خاندان اور برادری کی تذلیل،اوراس کی اجتماعی عزت پر حملہ۔

ہم جس طرح کے سماجی ماحول میں رہتے ہیں،اس میں عصمت دری کسی بھی عورت کے لئے تباہ کن ہوسکتی ہے حالانکہ وہ فوج اور عسکریت پسندوں کے درمیان تنازعات کا شکار بنتی ہیں پھر بھی انہیں بدنامی کے ساتھ ساتھ برادری سے اخراج کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ یہ ''کنن پوش پورہ'' میں دیکھا گیا جہاں خواتین کو پڑوسی گاؤں سے باہر نکالے جانے کا سامنا کرنا پڑا۔''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں کے ساتھ بات چیت کے دوران ہی مجھے پتہ چلا کہ نہ صرف گاؤں کے باہر بلکہ اندر بھی اگلی نسل کی عورتوں تک کے لئے شادیوں کا انتظام کرنا کتنا مشکل ہے۔ بہت سے خاندانوں نے رشتہ داروں میں اپنی لڑکیوں کی شادیاں کراتو دیں مگران میں کچھ مکمل طور پر بے جوڑ تھیں۔ اکثر خواتین نے تین اہم وجوہات کی بنا پر جنسی استحصال کے بارے میں شکایات درج کرانے سے گریز کیا ہے: وہ سماجی مسائل جو ریپ کے عوامی اعتراف کی وجہ سے پیدا ہوتے ہیں۔ انتقامی کارروائی کا خوف۔ اور عدالتی نظام پر ان کے مکمل اعتماد کا فقدان۔ عدالتوں میں اور پولیس کے سامنے لامتناہی شہادتیں پیش کرنا ایک بے معنی انتخاب کے طور پر دیکھا جاتا تھا جس کی وجہ سے اس بھیانک جرم کی سزا سے استثنٰی کے موجودہ ماحول میں ان کی بے عزتی کے سوا کچھ نہیں ہوتا تھا۔

ایک ایسے معاشرے میں جہاں خواتین کی پاکیزگی اور طہارت کے تصورات کو بہت اہمیت دی جاتی ہے، عصمت دری مسلح جدوجہد کی طرف راغب ہونے والے مردوں کو نشانہ بنانے کے لئے چالاکی سے استعمال کیا جانے والا ہتھیار بن گئی ہے۔ خواتین کے جنسی استحصال کو انتقامی کارروائی کے طور پر دیکھنے کے خوف اور شرم اور عزت کے اجتماعی تصورات

نے اس جدوجہد میں شامل ہونے میں مردوں کی سخت حوصلہ شکنی کی۔ مسلح جدوجہد میں حصہ لینے کے انتخاب کا مطلب یہ تھا کہ 'ان کی' خواتین پرامن طور پر نہیں رہ سکیں گی اوران کی حفاظت خطرے میں پڑ جائے گی۔ یقینی طور پر انہیں ہراساں کیا جائے گا، ڈرایا دھمکایا جائے گا، بدسلوکی کی جائے گی، ان پر حملہ کیا جائے گا اوران سے زیادتی کی جائے گی۔ سیما قاضی نے جے کے ایل ایف کے ایک سابق عسکریت پسند کا ایک بیان پیش کیا ہے جو اس اذیت کے بارے میں بات کرتا ہے جس سے مرد اس وقت گزر رہے تھے جب فوج کا انتقام ان کی خواتین رشتہ داروں پر ڈالا گیا تھا۔ یہ شخص اپنی بہن یا بیوی کی سکیورٹی فورسز کے ہاتھوں عصمت دری کے بارے میں سننے کے درد اور خاندان سے محبت اور مادر وطن سے محبت میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنے کی کشمکش کے بارے میں بھی بات کرتا ہے۔ وہ اس بات کو تسلیم کرتا ہے کہ اگر ان کے خاندان کی کسی خاتون کی عصمت دری کی جاتی ہے یا اس کی توہین کی جاتی ہے تو وہ آزادی کے لئے لڑنے کے قابل نہیں ہوں گے۔

اجتماعی عصمت دری اور عوامی اجتماعی عصمت دری برادریوں اور پورے گاؤں کے خلاف استعمال کیا جانے والا ایک خاص طور پر طاقتور ہتھیار ہے تاکہ انہیں دہشت زدہ کیا جاسکے۔ کشمیر میں بھارتی مسلح افواج کے ہاتھوں اجتماعی عصمت دری کا نشانہ بننے والی خواتین کی بہت سی مثالیں اور شہادتیں موجود ہیں۔ ایشیاواچ نے کشمیر میں عصمت دری کے واقعات پر اپنی رپورٹ میں سنہ 1993ء میں فوج کی جانب سے اجتماعی عصمت دری اور گینگ ریپ کے چھ دستاویزی معاملے ثبوت کے ساتھ درج کیے۔ بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں انسانی حقوق اور انصاف سے متعلق بین الاقوامی پیپلز ٹریبونل نے اپنی اشاعت 'مبینہ مجرموں' میں بھارتی فوج کے اہلکاروں کی جانب سے کی جانے والی عصمت دری کے نو واقعات کا ذکر کیا ہے۔ کشمیر میں عصمت دری کی بے شمار اور مثالیں موجود ہوں گی، کیوں کہ تمام متاثرین ایسے ماحول میں جنسی استحصال کی شکایت نہیں کرتے ہیں جہاں

انصاف کا دور دور تک نشان نہیں ملتا۔اس طرح کے بہت سے مقدمات غیر دستاویزی تھے کیوں کہ متاثرہ خاندانوں کو خاموش رہنے پر مجبور کیا گیا تھا جب کہ انسانی حقوق کی تنظیموں کی طرف سے رپورٹ کردہ اور بعد میں دستاویزی شکل دینے والے مقدمات کو کبھی منطقی انجام تک نہیں پہنچایا گیا، مجرموں کو ہمیشہ سزا سے مستثنیٰ رکھا گیا۔اس کی کئی وجوہات ہیں لیکن سب کی سردار ایک ہی بات ہے کہ یہ سب حکومت ہند کی ریاستی پالیسی کے تحت ہو رہا تھا۔ جب ریاست کی پالیسی ہی ظلم وستم ہو تو کوئی کیوں کہ محفوظ رہ سکتا ہے اور عدالتیں اپنی ریاست کی پالیسی سے مخالف سمت کتنا عرصہ کام کر سکتی ہیں اس صورت میں نہ کوئی گواہ عدالت میں پیش ہوتا ہے اور نہ ریاست پیروی کرتی ہے حتیٰ کہ مدعی بھی تھک ہار کر دست بردار ہو جاتا ہے یا مزید نقصان کے خوف سے خاموش ہو جاتا ہے کشمیریوں نے لگ بھگ 35 سال تک اس ماحول اور ان حالات میں بھارت کے ساتھ سیاسی وعسکری محاذ پر تن تنہا جنگ لڑی ہے۔

☆......☆

مردوں پر جنسی تشدد

یہ صرف خواتین ہی نہیں جو مقبوضہ جموں وکشمیر میں جنسی تشدد کا شکار ہوئیں۔جنسی تشدد کو بطور طاقت کا ہتھیار، مخالفین کی سرکوبی کے لیے، کشمیر میں مردوں کے خلاف بھی براہ راست استعمال کیا گیا۔تشدد کی شکلوں کے طور پر اغلام اور مقعد میں مختلف چیزیں داخل کرنے کو بڑے پیمانے پر رپورٹ کیا گیا ہے۔جنسی اعضاء سے بجلی کا کرنٹ گزارنے کے عمل نے بہت سے مردوں کو جنسی طور پر ناکارہ بنا دیا ہے۔ "کنن پوش پورہ" میں مردوں پر بڑے پیمانے پر تشدد کے دوران بھی یہی ہوا تھا۔ ایمنسٹی انٹرنیشنل کی 1992ء کی ایک رپورٹ کے مطابق تشدد کے سب سے عام طریقے بری طرح مارنا ہے۔خصوصاً جب کسی کو الٹا لٹکا دیا جاتا ہے، اور بجلی کے جھٹکے دیے جاتے ہیں۔لوگوں کو بھاری رولرز سے کچلا اور جلایا گیا ہے۔ تیز دھار آلات گھونپ دیئے گئے، مرچ یا سخت چھڑی جیسی چیزوں کو ان کے مقعد میں بزور ڈالا گیا ہے۔جنسی اعضاء کاٹ دینے کی اطلاعات بھی ملی ہیں۔

مورخ اوما چکرورتی بتاتی ہیں، 'مردوں کے خلاف جنسی تشدد تقریباً مکمل طور پر غیر رجسٹرڈ رہا ہے یا کم از کم تحریری طور پر اس کا کوئی ریکارڈ نہیں ہے۔ چونکہ مردوں کے خلاف جنسی تشدد ان کے ساتھ کیے جانے والے تشدد کا ایک حصہ تھا، لہٰذا خواتین کے خلاف جنسی تشدد کے برعکس، اس پر توجہ نہیں دی گئی۔ جہاں خواتین پر جنسی تشدد خاندانوں یا برادریوں کی بے عزتی کے لیے کیا جاتا ہے، وہیں مردوں کو جسمانی نقصان پہنچانے کے علاوہ انہیں نفسیاتی طور پر نقصان پہنچانے اور مجروح کرنے کے لیے جنسی تشدد کا نشانہ بنایا جاتا ہے، اس لئے یہ ضروری ہے کہ مردوں کے خلاف جنسی تشدد کو بھی یکساں طور پر ریکارڈ کیا

جائے اور تسلیم کیا جائے۔

عام طور پر تو ایسا ہوا کہ تشدد زدہ مرد ہلاک ہو گئے اور ان کی لاشیں بھی ورثاء کے حوالے نہیں کی گئیں۔ جو باقی رہے ان کی زیادہ تر زندگی عقوبت خانوں اور جیلوں ہی میں گزری۔ اکا دکا کوئی واپس گھر پہنچا بھی تو وہ اس نے اپنے اوپر ہونے والے مظالم کا ذکر نہیں کیا کیوں کہ اس کے لیے دنیا میں کوئی انصاف کی عدالت نہیں تھی۔ ہندوستانی نظام انصاف تو شہریوں کے لیے مکمل ناکام یا ناکارہ ہو چکا ہے۔ اگر وہ انہیں اپنی بپتا بتاتا بھی تو کیسے کیوں کہ جموں وکشمیر میں مردوں کے ساتھ ہونے والے جنسی تشدد کے بہت زیادہ تحریری یا ریکارڈڈ ثبوت دستیاب نہیں ہیں تاہم مظالم کی ایک طویل داستان ہے جس کو بیان کرنے میں رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔

افسوس کا مقام یہ نہیں کہ بھارتی فوج اور حکومت نے کشمیر میں یہ مظالم کیے ان سے تو کشمیریوں کو ایسی ہی توقعات تھیں مگر افسوس کا مقام یہ ہے کہ کشمیریوں کی بغاوت کو کچلنے کے بہانے سے بھارتی حکومت اور کشمیر میں تعینات 10 لاکھ سے زیادہ فوج نے انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے ریکارڈ توڑے مگر کسی ملک، کسی ادارے یا سول سوسائٹی کے کسی فرد نے بھی بین الاقوامی عدالت میں ان کا مقدمہ نہیں اٹھایا۔ حتیٰ کہ پاکستان اور خود حریت کانفرنس بھی ان مظالم کے خلاف بین الاقوامی برادری کو قائل کرنے اور بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ اٹھانے میں ناکام رہی۔ اس نے اپنا وتیرہ بنا لیا کہ جو کہا جائے بس اتنا ہی بولو۔ بدقسمتی سے حریت کانفرنس بطور ادارہ کھڑی نہ ہو سکی اور سفارت کاری کے تمام اوزار دوسروں کے ہاتھوں میں دے کر خود مار کھانے تک محدود ہو کر رہی۔ ان مظالم کے خلاف کوئی بین الاقوامی عدالت میں جاتا تو خود اقوام متحدہ کے ذیلی اداروں کے پاس اتنے ثبوت تھے کہ اسرائیلی وزیراعظم بنیامین نیتن یاہو کی طرح بھارتی وزیراعظم نریندرہ مودی کے بھی جنگی جرائم میں وارنٹ گرفتاری جاری ہو سکتے تھے۔ نیتن یاہو کے خلاف تو ساؤتھ افریقہ

بین الاقوامی عدالت میں مقدمہ لے گیا۔ کشمیریوں کا مقدمہ کون اٹھائے۔ یہ کشمیریوں کو خود ہی کرنا پڑے گا خاص طور پر ڈائس پورہ کو سکھوں کی طرح ایک مضبوط اتحاد قائم کرنا پڑے گا جو بین الاقوامی سطح پر کشمیریوں کی سفارت کاری کرے ان کے مسائل اٹھائے۔ اس میں زیادہ تاخیر ہوئی تو دنیا بھول جائے گی۔

☆......☆

استثنٰی کا ماحول

سزا سے استثنٰی کے بارے میں تحقیق کرتے اور اسے تحریر کرتے ہوئے کوئی بات مجھے تاریخ کے اسباق کی طرف لے جاتی ہے اور ماضی کے ان ظالم حکمرانوں کی یاد آتی ہے جن کے متعلق میں نے پڑھا ہے۔ طاقتور اور بے رحم حکمرانوں کی ٹی وی پر پیش کی جانے والی کہانیاں ڈرامائی باتوں سے بھری پڑی ہیں۔ حکمران جو چاہیں کرتے ہیں، کسی کو پھانسی دینے کا حکم دیتے ہیں، کسی کے ہاتھ کاٹنے کا حکم صادر کرتے ہیں، کسی دوسرے کی آنکھیں نکال دیتے ہیں اور اس سے بھی بدتر، عام لوگوں میں سے سب سے خوبصورت لڑکی کو اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور اس کا غریب باپ مجبوری اور بے بسی کی تصویر بنا دیکھتا رہتا ہے۔ ایسے حکمرانوں کے پاس مطلق اختیارات تھے اور ان کے اختیار پر سوال اٹھانے کا مطلب موت یا قید کی دعوت دینا تھا۔ قوانین کا مقصد صرف لوگوں کو قابو میں رکھنا، رعایا کو زیر کرنا تھا، کیونکہ حکمران قانون سے بالاتر تھا لیکن آج کی معزز دنیا میں کشمیر میں ایسا ہی ہو رہا ہے جو لوگ قصے کہانیوں میں سن رہے ہوتے ہیں۔

اس طرح کی جگہ پر رہنے کا تصور کریں، یہ جانتے ہوئے کہ آپ کو دبایا جا رہا ہے اور آپ کو ناانصافی کے خلاف بولنے کا کوئی حق نہیں ہے، کیونکہ یہ بغاوت اور غداری کے زمرے میں آ سکتا ہے۔ آپ کہیں سکون نہ پائیں گے، یہ صورتحال انتہائی تکلیف دہ اور دم گھٹ جانے والی ہوگی۔ کشمیر میں رہنا ہمارے لیے ایسا ہی ہے، جہاں تشدد کے مجرموں کو کھلی چھوٹ ملی ہوئی ہے، جہاں سزا سے استثنٰی کا ماحول کبھی ختم نہیں ہوتا۔ یہ ہوا میں چلتا ہے، یہ بارش کے ساتھ گرتا ہے، یہ برف میں چھپ جاتا ہے، یہ خوفناک ہے اور وسیع پیمانے

پر پھیلا ہوا ہے۔ ''کنن پوش پورہ'' معاملے میں ہم اس حقیقت کی ایک مثال دیکھتے ہیں کہ کس طرح ہندوستان اور جموں و کشمیر دونوں ریاستوں کے تمام اداروں، مقامی منتظمین سے لے کر پولیس، طبی اسٹیبلشمنٹ، عدلیہ اور یہاں تک کہ ریاست کے زیر کنٹرول میڈیا نے مل کر مجرموں کو سزا سے استثنٰی دلانے کے لئے ایک بھرپور مشین کی طرح کام کیا ہے۔ جھوٹ کو اس طرح پیش کیا کہ سچ اس کے سامنے دب گیا۔ اس پر بھی صد افسوس کے کشمیریوں کی آزادی کا بیس کیمپ اس ساری صورت حال پر خاموش رہا اور یہاں کے عوام اپنے کاموں میں مشغول رہے جیسے ان سارے معاملات سے ان کا واسطہ ہی نہ ہو جب کہ کشمیریوں کے وکیل پاکستان کے اپنے مسائل ہیں وہ ان مسائل کے تناظر میں ہی کوئی پالیسی بناتا ہے کیا یہ کشمیریوں کے سوچنے کے لیے کافی نہیں یا ان کے لیے آل پارٹیز حریت کانفرنس کے لولی پاپ ہی کافی ہیں۔ بات علی گیلانی کی سمجھ میں آئی لیکن اس وقت پانی بہت بہہ چکا تھا اور ان کا آخری خط فقط تاریخ کا حصہ ہی بنا۔

ہندوستان ایک آزاد ملک ہے۔ یہاں سب کو کچھ بنیادی حقوق کی ضمانت دی گئی ہے لیکن کشمیریوں کو دی گئی ضمانت مودی نے 5 اگست 2019ء کو واپس لے لی۔ ہندوستانی مسلح افواج کی بھی اپنی آزادیاں ہیں، اور ہمارے خیال میں، اس کا مطلب ہے قتل کرنے، زخمی کرنے، اذیت دینے، عصمت دری کرنے کی آزادی۔ کشمیریوں کو کچھ آزادیاں حاصل نہیں اظہار رائے کی آزادی پر بھی قدغن ہے، لیکن پھر بھی ہمیں خاموش رہنے، کبھی آواز نہ اٹھانے، بھارت کی محکومی کو قبول کرنے کی آزادی ہے۔ اگر آپ اپنی آواز بلند کریں تو آپ کو سزا مل سکتی ہے لیکن جرائم کے ریاستی مجرم آزاد رہیں گے۔

بھارتی فوج اور نیم فوجی دستوں کو ریاست کی پیشگی اجازت کے بغیر قانون کے تحت فرائض کی انجام دہی کے دوران کیے جانے والے کسی بھی کام میں سزا سے مستثنٰی رکھا گیا ہے اور اب بھی یہ سلسلہ جاری ہے، چوں کہ ان کی ڈیوٹی میں سویلین آبادی کے خلاف فوجی

کارروائیاں شامل ہوسکتی ہیں، لہٰذا سیکورٹی اہلکار ہمیشہ لڑا کا زون میں فعال ڈیوٹی پر ہوتے ہیں اور کرکٹ کھیل کر واپس آنے والے نوجوان لڑکوں کو قتل کرنے سمیت ان کے کسی بھی عمل کا مطلب 'سرکاری عمل' کے طور پر لیا جاسکتا ہے۔ جیسا کہ برہان مظفروانی کے بھائی اور اس کے ساتھیوں کو صرف اس بناء پر قتل کر دیا گیا کہ وہ برہان مظفروانی کا بھائی ہے اور دیگر اس کے دوست ہیں۔ چناں چہ ریاستی فوج کے اس اقدام کو درست مان لیا گیا اور اور قاتلوں کو قانونی تحفظ دے دیا گیا۔ حال ہی میں سپریم کورٹ نے زاہد فاروق کیس کی سماعت کی۔ وزارت داخلہ اور وزارت دفاع نے 1990ء سے 2011ء کے درمیان ریاستی حکومت کو آرمڈ فورسز اسپیشل پاورا یکٹ (اے ایف ایس پی اے) کے تحت ایک بھی معاملے میں قانونی چارہ جوئی کی اجازت نہیں دی۔ فوجی اہلکاروں کے خلاف کبھی سویلین عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا گیا اور نہ ہی مبینہ کورٹ مارشل کے بعد کوئی مقدمہ یا سزا کے متعلق کچھ بتایا گیا۔ حکومت کی منظوری کے بغیر قانونی چارہ جوئی سے استثنٰی کی قانونی دفعات افسپا، آرمی ایکٹ اور کریمنل پروسیجر کوڈ (برائے پولیس) جیسے قوانین میں شامل ہیں اور انہیں عدالتی فیصلوں جیسے پتریبل جعلی انکاؤنٹر کیس پر سپریم کورٹ کے فیصلے کے ذریعے مزید تقویت ملتی ہے، جو تمام معاملوں میں قانونی چارہ جوئی کی منظوری کے لیے مؤثر طریقے سے درخواست کر کے فوجی اہلکاروں کے ذریعے کیے گئے جرائم کی سماعت کیلئے سویلین عدالت کے اختیارات کو مزید کم کرتا ہے۔ لہٰذا یہ مکمل طور پر فوج کا استحقاق بن جاتا ہے کہ وہ کھلی عدالت میں یا بند دروازوں کے پیچھے مقدمے کی سماعت کرانے کا انتخاب کرے اور یہ مقدمہ بھی ان کے اپنے بھائی بند چلاتے ہیں جن پر فوج کی ساکھ کے تحفظ کیلئے یکساں طور پر سرمایہ کاری کی ہوئی ہے لیکن اس کے جواب میں کشمیریوں کے پاس کوئی قانونی جواز باقی نہیں رہا کہ وہ اپنے اوپر ہونے والے مظالم و جرائم پر بات کرسکیں بلکہ وہ عدالت میں بھی اپنے دفاع میں کچھ بیان نہیں دے سکتے۔ نہ کوئی گواہی پیش کی جاسکتی ہے اور نہ کوئی مدعی بن سکتا ہے اس

صورت میں عدالت کا جو فیصلہ ہوگا اس کا انتظار کیا کرنا۔ بھارتی فوج ہی انتظامیہ ہے، مقننہ بھی۔ اور عدلیہ بھی۔ اس اندھے قانون کو دنیا کے سامنے آشکارہ کرنے والا کوئی نہیں حتیٰ کہ کشمیری خود بھی نہیں۔

1989ء کے بعد سے جموں وکشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کی کہانیاں معمول بن چکی ہیں۔ جنسی تشدد کے معاملات میں استثنٰی کی ضمانت دی جاتی ہے، جیسا کہ انسانی حقوق کی دیگر خلاف ورزیوں کے معاملات میں ہوتا ہے، لیکن یہ معاشرتی اور ثقافتی مضمرات اور متاثرین کی بدنامی کی وجہ سے زیادہ سنگین ہے۔ خواتین کو ان کے شوہروں، بچوں اور دیگر رشتہ داروں کے سامنے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا ہے۔ یہ نہ صرف متاثرہ کے لئے بلکہ پورے خاندان اور برادری کے لئے صدمے کا باعث ہے۔ انصاف کے حصول کی قانونی جستجو بے کار رہی ہے، مجرموں کی ساکھ کو مقدمات میں تاخیر، التوا اور غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی کرنے کے ہتھکنڈوں کے ذریعے برقرار رکھا گیا ہے، جس حکمت عملی کو ہم ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری میں بڑے پیمانے پر اثر انداز ہوتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ یہ متاثرہ فرد کی سلامتی ہی ہے جس سے انکار کیا جاتا ہے یعنی خواتین کو 'جنگ کی لوٹ مار' سمجھا جاتا ہے، جن کے حقوق جنگ کے دوران پامال کرنا جائز قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ کشمیر میں کسی صورت جنگ نہیں ہو رہی بلکہ بنیادی حقوق کے حصول یا ان کی بحالی کیلئے محض ایک احتجاج اور مزاحمت ہو رہی ہے۔ ویسے بھی چند سو نہتے افراد اور 10 لاکھ سے زیادہ تربیت یافتہ مسلح فوج کے درمیان جو دنیا کے جدید جنگی ہتھیاروں، ٹینکوں، طیاروں اور ڈرونز سے لیس ہے کے درمیان جنگ ہو ہی نہیں سکتی لیکن مقبوضہ جموں وکشمیر کے عوام کی طرف سے بنیادی حقوق کے لیے احتجاج اور مزاحمت کو بھی جنگ یا جنگی ماحول قرار دے کر کشمیری خواتین کو مال غنیمت سمجھا جانے لگا اور فوج کو ہر قسم کے اقدامات کی اجازت دے دی گئی جس کی کوئی سزا یا احتساب کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

چنگیز اور ہلاکو خان مظالم کے حوالے سے بہت مشہور ہوئے لیکن ہندوستانی فوج نے گزشتہ 35 برسوں کے دوران مقبوضہ جموں وکشمیر میں جو انسانیت سوز مظالم ڈھائے ہیں ان کی مثال انسانی تاریخ میں شاید ہی ملے۔ حتیٰ کہ پنجاب میں رنجیت سنگھ اور جموں وکشمیر میں ڈوگرہ راج کو بھی برا کہا جاتا ہے مگر بھارتی فوج نے مقبوضہ کشمیر میں جس بربریت کا مظاہرہ کیا اس کے سامنے وہ بھی کچھ نہیں۔

19 اپریل 2016ء کو وادی کشمیر کے ضلع بڈگام کے ایک غریب شال باف فاروق ڈار کو بھارتی آرمی کے میجر گگوئی نے اس وقت فوجی جیپ کے بمپر پر باندھ کر نشان عبرت بنایا جب علاقے میں پارلیمنٹ کی ایک سیٹ کے لیے ضمنی انتخابات ہو رہے تھے اور عوام انتخابات میں بڑے پیمانے پر دھاندلی کے خلاف احتجاج کر رہے تھے، اس دوران عوام اور پولیس کے درمیان جھڑپوں میں چھ افراد ہلاک اور درجنوں زخمی ہوئے۔ میجر گگوئی فاروق ڈار کو جیپ کے بمپر پر باندھ کر کئی گھنٹے سڑکوں پر گھماتا رہا اور اس کے ساتھ یہ اعلان بھی ہوتا رہا کہ ''پتھر مارنے والوں کا ایسا حال ہوگا'' جب یہ ویڈیو دنیا بھر میں وائرل ہوگئی تو بین الاقوامی دباؤ کو کم کرنے کے لیے اعلان ہوا کہ واقعہ کی ایف آئی آر کاٹی جارہی ہے۔ انسانی حقوق کے ریاستی کمیشن نے حکومت سے سفارش کی کہ وہ فاروق ڈار کو 10 لاکھ روپے معاوضہ ادا کرے لیکن اس طرح کی کوئی خبر نہیں آئی کہ فاروق ڈار کو معاوضہ دیا گیا ہو یا اس واقعہ کی ایف آئی آر کاٹی گئی ہو۔ البتہ نئی دلی میں ایک تقریب میں اس کارنامے پر بھارتی آرمی چیف نے میجر گگوئی کو ایوارڈ سے نوازا۔ یہ وہی میجر گگوئی ہے جس کو مئی 2018ء کو سری نگر پولیس نے عارضی طور پر اس وقت حراست میں لیا تھا جب اس کو سری نگر کے ایک ہوٹل کے عملے نے اغوا کی ہوئی طالبہ کے ساتھ ہوٹل میں رات ٹھہرنے کی اجازت نہیں دی تھی تو اس نے عملے کے ساتھ ہاتھا پائی کی تھی۔ اس پر شور ہونے پر ایک فوجی عدالت نے تادیبی کارروائی کا حکم دیا تھا جو اس کے علاوہ بھی نزاعی کارروائیوں کی وجہ سے ذرائع ابلاغ کی

سرخیوں کا محور بن گیا تھا۔ بھارتی آرمی چیف جنرل بپن راوت نے کہا تھا کہ میجر گگوئی کے خلاف لگایا گیا الزام صحیح ثابت ہوتا ہے تو اس کو سخت سزا دی جائے گی لیکن فوج کی تحقیقاتی رپورٹ میں میجر گنگوئی کو بری کر دیا گیا بلکہ جنرل بپن راوت نے شاباشی کا ایک خط اور ایوارڈ سے بھی نوازا جس میں عسکریت مخالف مہم میں اس کی بہترین حکمت عملی اور اعلیٰ کارکردگی کا اعتراف بھی کیا گیا۔ یہ اقدام جموں وکشمیر میں تعینات بھارتی فوجیوں کی جرائم و کرائم کرنے کے لیے کھلی چھوٹ اور حوصلہ افزائی تھی اور کشمیریوں کے لیے خوف کی علامت کہ تم جتنا بھی شور کرو آرمی کو مکمل اختیار ہے تمہارے ساتھ جو سلوک کرے۔

ایک اور کیس میں، دو بچوں کی ماں کو 5 دسمبر 1999ء کو بارہ مولا میں اس وقت مبینہ طور پر ریپ کا نشانہ بنایا گیا تھا، جب اس کا شوہر اپنے کام کے لیے سامان خریدنے ریاست سے باہر گیا ہوا تھا۔ واپسی پر اس نے دیکھا کہ 28 راجپوتانہ رائفلز کے میجر یادیو اور دیگر اہلکار، جو رفیع آباد کے شال کوٹ گاؤں میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے، زبردستی ان کی رہائش گاہ میں گھس گئے اور لاکھوں روپے مالیت کا سونا اور دیگر سامان لوٹ لیا۔ جب گھر والوں نے شور مچایا تو ان میں سے ایک عورت کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنایا گیا، برہنہ کیا گیا اور ریپ کیا گیا۔ آر آر اہلکاروں اور میجر یادیو نے ڈکیتی کی اطلاع دینے کی صورت میں متاثرہ خاندان کو سنگین نتائج کی دھمکی دی۔ اس واقعے کے بعد متاثرہ فرد اور اس کے اہل خانہ کو گھر چھوڑ کر کہیں اور پناہ لینے پر مجبور ہونا پڑا۔ 4 جنوری 2000ء کو پنزالہ پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر درج کی گئی تھی لیکن 19 اگست 2011ء کو اس کیس کو بند کر دیا گیا تھا۔

سزا کے طور پر خواتین کا جنسی استحصال اور وردی میں مجرموں کو ملنے والا جرم سے استثنیٰ صرف کشمیر تک محدود نہیں ہے، بلکہ تمام تنازعات سے متاثرہ علاقوں میں یہ عمل فوجی کارروائیوں کا ایک معمول ہے، جو بغاوت کو کچلنے کا امتیازی ہندوستانی طریقہ ہے۔ اس کی ایک مثال 32 سالہ خاتون تھنگم منورما دیوی کا کیس ہے، جو مبینہ طور پر امپھال میں ایک

حریت پسند تنظیم کے لیے کام کرتی تھی۔اسے رات گئے اس کے گھر سے اٹھایا گیا اور قریبی کھیتوں میں لے جایا گیا جہاں 11 جولائی 2004ء کو 17 آسام رائفلز کے فوجیوں نے اس کی عصمت دری کی اور بے رحمی سے قتل کر دیا۔اس کی لاش پر جنسی عضو سمیت مختلف مقامات پر 18 گولیوں کے زخم تھے۔

اس واقعہ کے بعد پورے منی پور میں احتجاج شروع ہو گیا۔امپھال میں آسام رائفلز کے ہیڈکوارٹر کے سامنے خواتین کے ایک گروپ نے خود کو برہنہ کر لیا،جن پر 'انڈین آرمی، ہماری عزت کے لٹیرے' کے بینرز تھے اور ایک نوجوان نے خودسوزی کر لی،جس کے بعد قومی میڈیا کو آخر کار اس معاملے کا نوٹس لینا پڑا۔منی پور اور شمال مشرق میں مختلف سماجی کارکنوں اور انسانی حقوق کی تنظیموں کے ذریعہ افسپا کو منسوخ کرنے کے لئے احتجاج اور مطالبات معمول بن گئے۔

ایک ریٹائرڈ ضلع جج سی اوپیندر سنگھ کی سربراہی میں ایک کمیشن نے اس معاملے کی جانچ کا حکم دیا تھا، تاکہ موت کی وجوہات کا جائزہ لے کر ذمہ دار افراد کا تعین کیا جا سکے اور مستقبل میں اس طرح کے واقعات کو روکنے کے لئے تجاویز پیش کی جا سکیں۔آسام رائفلز کے جوانوں کو کمیشن کے سامنے پیش ہونے کے لئے بلایا گیا تھا،لیکن وہ بار بار بلانے پر بھی نہیں آئے۔دراصل آسام رائفلز نے اس تحقیقاتی کمیشن کی تشکیل کو گوہاٹی ہائی کورٹ میں چیلنج کرتے ہوئے کہا تھا کہ صرف مرکزی حکومت ہی مسلح افواج کے طرز عمل کی جانچ کیلئے کمیشن تشکیل دینے کی مجاز ہے، تاہم ان کے اس مؤقف کو ہائی کورٹ نے مسترد کر دیا تھا۔

ہیومن رائٹس واچ کی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ اوپیندر سنگھ نے تسلیم کیا کہ آسام رائفلز واضح طور پر تعاون کے لئے تیار نہیں تھی۔کمیشن نے نومبر 2004ء میں اپنی رپورٹ پیش کی تھی لیکن اسے عام نہیں کیا گیا تھا۔سال 2005ء میں اپنے آخری فیصلے میں

ہائی کورٹ نے کہا تھا کہ چونکہ آسام رائفلز کو افسپا کے تحت تعینات کیا گیا تھا، اس لیے مرکزی حکومت کو ذمہ داری سنبھالنی ہوگی اور رپورٹ مرکزی وزارت داخلہ کو سونپی جانی چاہیے۔2010ءؤ میں گوہاٹی ہائی کورٹ کی ایک ڈویژن بنچ نے ریاستی حکومت کو جانچ رپورٹ کھولنے اور نتائج پر عمل کرنے کی اجازت دی۔2011ء میں مرکز نے سپریم کورٹ کے سامنے ایک خصوصی اجازت کی عرضی دائر کی تھی جس میں ہائی کورٹ کے اس فیصلے کو چیلنج کیا گیا تھا۔حکومت کی طرف سے اس معاملے میں تاخیری حربے استعمال کرنے کی وجوہ سے منورما کا خاندان اب بھی انصاف کا انتظار کر رہا ہے۔

ریاست اور اس کی ایجنسیوں کی حمایت نے فوجیوں کو یقین دلایا ہے کہ ان کے ذریعہ کی گئی عصمت دری کے لئے ان پر الزام عائد نہیں کیا جائے گا اور انہیں ہرجانے کا مکمل زرتلافی ملے گا۔ ایشیا واچ اور فزیشنز فار ہیومن رائٹس کی رپورٹ 'ریپس ان کشمیر' (1993ء) شائع کرنے کا مقصد کشمیر میں 'عصمت دری کے جنگ کے حربے کے طور پر استعمال اور اس حوالے سے ان حکومتی پالیسیوں کو سامنے لانا تھا جس سے فورسز کو یقین ہو چلا کہ وہ ان جرائم کو بغیر کسی سزا کے انجام دے سکتے ہیں۔رپورٹ میں اس بات کا بھی ذکر کیا گیا ہے کہ اگرچہ سیکورٹی فورسز کے ذریعہ کی جانے والی عصمت دری کی اصل تعداد معلوم نہیں ہے کیونکہ زیادہ تر واقعات دور دراز اور اندرونی علاقوں میں ہوئے ہیں،' لیکن اس میں کوئی شک نہیں ہے کہ عصمت دری عام ہے اور عموماً اس کے مرتکب کو سزا نہیں دی جاتی'۔

جب عصمت دری کے واقعات سامنے آتے ہیں تو فوج، بیوروکریسی اور عدلیہ اس طرح اکٹھے ہو جاتے ہیں کہ حقائق مکمل طور پر مسخ ہو جاتے ہیں۔حکام کو اس سلسلے میں تاخیر کے بہت سے ہتھکنڈے دستیاب ہیں۔مثال کے طور پر فوج تو سرے سے واقعہ کو ہی تسلیم نہیں کرتی جبکہ پولیس جب تک ممکن ہو ایف آئی آر درج کرنے میں تاخیر کرتی ہے۔بہت سے معاملوں میں عوام کا غصہ اور دباؤ پولیس کو ایف آئی آر درج کرنے پر مجبور کرتا ہے،

لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ تحقیقات کی جائیں گی۔ تحقیقات میں تاخیر ہوتی ہے، اور اگر کی جاتی ہیں تو یہ ناقص ہوتی ہیں اور ان کا مقصد مناسب ثبوت جمع کرنے میں ناکام ہو کر ذمہ داروں کو بچانا ہوتا ہے۔ درحقیقت یہ سارا طریقہ کار ایک تماشہ ہے اور ہندوستان کے نظام انصاف کو مذاق بناتا ہے۔ عصمت دری کی متاثرہ کا طبی معائنہ، جوان کیسز میں سب سے اہم ثبوت ہے، اکثر تاخیر کا شکار ہوتا ہے یا نتائج میں گڑبڑ اور چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے۔ اس کا ثبوت 2009ء میں شوپیاں میں مسلح افواج کے ذریعہ دو خواتین کی عصمت دری اور قتل کا کیس ہے جسے سب سے زیادہ شہرت ملی اور جس پر بھرپور احتجاج بھی ہوا۔

29 مئی 2009ء کی شام کو 22 سالہ آسیہ اور اس کی 15 سالہ نند نیلوفر لاپتہ ہو گئیں۔ ان کی لاشیں ایک دن بعد رمبی آرا نالے میں مختلف مقامات پر ملی تھیں۔ دونوں نوجوان خواتین کو اغوا کیا گیا، ریپ کیا گیا اور قتل کر دیا گیا۔ واقعہ کی خبر پھیلتے ہی علاقے میں کشیدگی پھیل گئی اور لوگ سڑکوں پر نکل آئے اور احتجاج کیا۔ مظاہروں کو روکنے کے لیے بھارتی مسلح افواج کو علاقے میں تعینات کیا گیا تھا۔ پولیس نے اپنی ابتدائی تحقیقات کے بعد دعویٰ کیا کہ یہ دو خواتین کے نالے میں ڈوبنے کا کیس ہے۔ اس کے نتیجے میں مزید سخت احتجاج ہوا۔ شوپیاں عصمت دری معاملے پر میڈیا کو رپورٹنگ کرنے سے بھی روک دیا گیا تھا۔

ایک معمول کا ریاستی ردعمل، جسے لوگوں کو مطمئن کرنے کی حکمت عملی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے، انکوائری کمیشن قائم کرنا ہے۔ گزشتہ 12 سالوں (2002ء-2014ء) میں 173 تحقیقات شروع کی گئی ہیں جن کے نتیجے میں ایک بھی مقدمہ نہیں چلا ہے۔ ایسے کیسز میں جہاں عوامی دباؤ کے نتیجے میں تحقیقات ہوئی ہیں وہاں اکثر صرف دکھاوے کی کارروائی ہی ہوئی ہے کیوں کہ اس طرح کے ریاستی مقرر کردہ کمیشن اختیارات سے عاری ہوتے ہیں اور ان کے نتائج صرف سفارشی ہوتے ہیں۔ پولیس کی

تحقیقات یا مجرمانہ طریقہ کار کی بنیاد بننا تو دور کی بات، ان کے نتائج شاذ و نادر ہی منظر عام پر آتے ہیں۔ شوپیاں معاملے میں جسٹس جان کمیشن کی جانب سے پیش کی گئی رپورٹ میں واضح طور پر کہا گیا ہے کہ 'اس میں کوئی شک نہیں کہ دونوں لڑکیوں کی عصمت دری کی گئی اور اپنے غیر انسانی فعل کے قانونی نتائج سے بچنے کے لیے شواہد کو مٹانے کی غرض سے دونوں لڑکیوں کا قتل کیا گیا تاکہ جرم کے واحد گواہ کو بھی ہمیشہ کے لیے خاموش کر دیا جائے۔

اس کے باوجود یہ معاملہ جلد بازی میں سی بی آئی کو منتقل کر دیا گیا، جس نے قبر کشائی کر کے خواتین کی لاشوں کو باہر نکالا اور ایک بار پھر دعویٰ کیا کہ ان کی موت کی وجہ نالے میں ڈوبنا ہے۔ سی بی آئی نے انصاف کے لئے جدوجہد کی حمایت کرنے والے وکیلوں اور ڈاکٹروں کے خلاف بھی چارج شیٹ دائر کی۔

ایک خبر میں کہا گیا ہے، 'سی بی آئی نے چھ ڈاکٹروں، پانچ وکیلوں اور دو شہریوں کے خلاف جھوٹے ثبوت پیش کرنے کے لیے چارج شیٹ دائر کی ہے، جن میں مرنے والی ایک خاتون کا بھائی بھی شامل ہیں۔ 66 صفحات پر مشتمل اس رپورٹ میں پولیس اہلکاروں کو بری کر دیا گیا ہے، جنہیں تقریباً 47 دنوں تک حراست میں رکھا گیا تھا اور جن کے خلاف ریاست کی جانب سے مقرر کردہ عدالتی کمیشن نے ثبوتوں کو تباہ کرنے کے الزامات عائد کیے تھے۔ سی بی آئی کی رپورٹ میں 13 لوگوں پر الزام لگایا گیا ہے کہ انہوں نے سکیورٹی فورسز کے خلاف عوامی غصے کو بھڑکانے کے لئے مجرمانہ سازش تیار کی تھی۔ شوپیاں کے معاملے میں جو کچھ ہوا وہ اس بات کی ایک مثال ہے کہ کس طرح ہندوستانی نظام انصاف پر کسی بھی طرح کا اعتماد یقینی طور پر مایوسی کا باعث بنتا ہے۔ شوپیاں ریپ اور قتل کی متاثرین نیلوفر اور آسیہ کے اہل خانہ کی قانونی جدوجہد اب بھی جاری ہے حالاں کہ اس طرح کے کیس میں ملوث فوجی جوانوں اور نیم فوجی اہلکاروں کے خلاف کبھی سویلین عدالت میں مقدمہ نہیں چلایا گیا، جس طرح انہیں افسپا کے ذریعے تحفظ حاصل ہے لیکن پولیس اہلکاروں کے کیس میں بھی جن

کوعوامی ناراضگی اورانسانی حقوق کی تنظیموں کی مداخلت کے بعد دی گئی سزائیں بہت کم رہی ہیں۔

ایک دلہن کے گینگ ریپ کے بہت مشہور کیس کو لے لیجیے۔ قاضی گنڈ میں ایک 18 سالہ لڑکی (جس کا نام نہیں مخفی ہے) کے لیے خوشی اس وقت، سوگ میں بدل گئی جب رخصت ہوکر اپنے دولہا کے ساتھ سسرال جاتے ہوئے اسے اغوا کرلیا گیا تھا۔ ساتھ میں اس کی خالہ کو بھی اغوا کیا گیا اور دونوں خواتین کی عصمت دری کی گئی۔ سکیورٹی فورسز نے شادی کی تقریب پر بھی فائرنگ کی جس کے نتیجے میں ایک شخص ہلاک ہوگیا۔ اس معاملے کو قومی اور بین الاقوامی ذرائع ابلاغ سے ملنے والی تشہیر کی وجہ سے حکام نے پولیس تحقیقات کا حکم دیا جس میں یہ نتیجہ اخذ کیا گیا کہ خواتین کے ساتھ عصمت دری کی گئی تھی تاہم کورٹ مارشل میں مجرموں کو دی گئی سزا بے معنی تھی۔ بی ایس ایف نے دعویٰ کیا کہ دو کانسٹیبلوں کو پانچ سال قید اور ملازمت سے برخاست کرنے کی سزا سنائی گئی ہے جب کہ دو دیگر کو سنیارٹی سے محروم کرنے اور رینک میں کمی کی سزا دی گئی ہے۔ لیکن مبینہ طور پر یہ ساری کارروائی جعل سازی پر مبنی تھی صرف دنیا کو دھوکہ دینے کے لیے مجرموں کو کسی دوسری جگہ تبدیل کیا گیا۔

سیما قاضی نے اپنی کتاب "Gender & Militarization Kashmir" میں 15 کور ہیڈکوارٹرز سرینگر کے تعلقات عامہ کے افسر (دفاع) لیفٹیننٹ کرنل وی کے بترا کے انٹرویو سے اقتباسات پیش کیے ہیں۔ فوجی افسر کے جوابات پریشان کن ضرور ہیں لیکن حیران کن نہیں۔ سکیورٹی اہلکاروں کی جانب سے عصمت دری کے الزامات کے بارے میں سوال پوچھے جانے پر انہوں نے جواب دیا کہ 'یہ بڑے پیمانے پر کیا گیا پروپیگنڈا ہے کیونکہ 98 فیصد کیسز کا کوئی نتیجہ نہیں آیا۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ 'کشمیر میں عصمت دری سماجی بدنامی کا باعث نہیں رہی۔ کسی بھی چیز سے زیادہ، یہ بیان ظاہر کرتا ہے کہ فوج کی نظر میں عصمت دری کتنی غیر اہم ہے کہ سری نگر میں فوجی ہیڈکوارٹر میں کرنل وی

نے جوانوں کے ذریعہ کی گئی عصمت دری کو یہ کہتے ہوئے جائز ٹھہرایا کیونکہ فوجی 'بہت دباؤ والے حالات میں کام کرتے ہیں'۔ لہٰذا ان سے ایسے واقعات سرزد ہونا معمول کی کارروائی ہے، کرنل کا یہ تبصرہ کشمیر میں فوجیوں کی بے رحمی اوران کے افسروں کی پشت پناہی کی عکاسی کرتا ہے۔

سیما قاضی یہ بھی بتاتی ہیں کہ فوج 'اس معاملے کو چند مجرم فوجیوں کی حرکتوں تک محدود کررہی ہے، جس طرح فوج، ایگزیکٹو اور پولیس ریپ کے واقعات پر ردعمل ظاہر کرتی ہے۔ فوج نے ہمیشہ عصمت دری اور جنسی تشدد کی کوئی اخلاقی یا قانونی ذمہ داری لینے سے گریز کیا ہے۔ اس کے بجائے، اس نے حکمت عملی کے ساتھ اس سے نمٹنے کی کوشش کی ہے: کبھی تو وہ کچھ سنتے ہی نہیں یا تفصیلات میں مسلسل مداخلت کرتے ہیں، زیادہ تر وقت ایک ہی بات پر اڑے رہتے ہیں، اوراپنے انسانی حقوق کے ریکارڈ سے متعلق تمام سوالات کو قومی سلامتی معاملات کے طور پر پیش کرتے ہیں۔ اسی طرح جب 2012ء میں دہلی میں ایک نوجوان خاتون کے ساتھ اجتماعی عصمت دری کے بعد تشکیل دی گئی جسٹس ورما کمیٹی نے جموں وکشمیر اور شمال مشرق کی خواتین نمائندوں کی دلیلیں سنی تھیں اور سفارش کی تھی کہ جنسی جرائم کو افسپا کے دائرے سے باہر رکھا جانا چاہئے کیونکہ عصمت دری کبھی بھی کسی 'سرکاری فرائض' کا حصہ نہیں ہوسکتی تو تب بھی فوجی اسٹیبلشمنٹ نے اپنے معمول کے غصے کے ساتھ اس پر اپنا ردعمل ظاہر کیا۔ آخر کار فوجداری قانون (ترمیمی) ایکٹ، 2013ء (جسے جموں وکشمیر تک توسیع نہیں دی گئی ہے) نے افسپا کیلئے منظور کی گئیں دفعات کو تبدیل نہیں کیا اور جموں وکشمیر میں فوج کیلئے جنسی جرائم سے استثنیٰ کا راج قائم رہا۔

کشمیر میں انصاف تلاش کرنا ایک مشکل کام ہے لیکن ہندوستان میں مایوسی، ناامیدی، غصہ اوراعتماد کی کمی کو تلاش کرنا آسان ہے۔ ناامیدی اور فطری طور پر غیر منصفانہ نظام کے تحت زندگی گزارنے کا احساس ہندوستان نے پیدا کیا ہے۔ کشمیر میں 'امن وامان'

کو برقرار رکھنے کے لیے بھارت کا طریقہ کار، جس کے دوران اس کی مسلح افواج کو بلا شبہ اختیارات دیے جاتے ہیں، عوام کی ناراضگی میں بہت بڑی ذمہ دار ہے۔

یہاں کچھ معاصر کشمیریوں کے ساتھ ہمارے انٹرویوز کا حوالہ دینا مناسب ہوگا۔

ہم نے ایک تاجر جمشید (بدلا ہوا نام) سے پوچھا کہ وہ کشمیر کی صورتحال اور انصاف کے موجودہ نظام کے بارے میں کیا محسوس کرتے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ انہیں ہندوستانی عدالتی نظام سے بہت کم امیدیں ہیں۔ جمشید کی پرورش جنوبی ضلع انت ناگ یا اسلام آباد میں ہوئی۔ ان کی جوانی کی یادیں فوجیوں کے حوالے سے تھیں جو ان سے پوچھتے تھے کہ وہ کہاں رہتے ہیں اور اگر وہ 'اسلام آباد' کا نام استعمال کرتے تو انہیں مارا پیٹا جاتا۔ انہیں یاد ہے کہ وہ بیک وقت غصے میں بھی تھے اور خوفزدہ بھی، وہ اپنے تفتیش کاروں کی ناراضگی کا خطرہ مول نہیں لے سکتے تھے کیونکہ وہ 'لاپتہ' یا قتل نہیں ہونا چاہتے تھے اور نہ ہی اپنے والدین کو بے بس چھوڑ کر انصاف کے لیے ایک بے معنی جنگ لڑنا چاہتے تھے۔

ان کا کہنا تھا 'لڑکیوں کے لیے تو یہ اور بھی زیادہ غیر محفوظ تھا'۔ مسلح افواج کی جانب سے خواتین کو نشانہ بنانا اتنا عام تھا کہ بہت سی خواتین کو اسکول اور کالج چھوڑنے پر مجبور ہونا پڑا اور کبھی اکیلے باہر نہیں نکلتی تھیں۔ اگر کسی عورت کی عصمت دری کی جائے یا اس کے ساتھ چھیڑ چھاڑ کی جائے تو کوئی کیا کر سکتا ہے؟ احتجاج یا مظاہرے گرفتاریوں یا ہلاکتوں کا باعث بنیں گے۔ انہوں نے اس بات پر تبادلہ خیال کیا کہ کس طرح کوئی اپنی آواز اٹھانے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ یہاں تک کہ اگر کوئی ایسا کرتا ہے، تو آخر کار اس کا گلا گھونٹ دیا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ کئی سال پرسکون رہنے کے بعد اب بھی انصاف نہیں مل سکا ہے۔ حالاں کہ لوگوں نے آواز اٹھانے سے ڈرنا چھوڑ دیا ہے، جیسا کہ شوپیاں معاملے میں ہوا، اس بات کی کوئی گارنٹی نہیں ہے کہ مجرموں کو سزا دی جائے گی۔

بارہ مولہ سے تعلق رکھنے والے ایک بینکر تنویر (بدلا ہوا نام) نے ایک اور انٹرویو

میں کہا کہ کشمیر جیسی جگہ جہاں مسلح افواج کو خصوصی اختیارات حاصل ہیں وہاں انصاف کی تلاش ہمیشہ مایوسی کا باعث بنتی ہے۔ وہ یاد کرتے ہیں کہ جب وہ نوجوان تھے تو ہندوستانی فوج کے جوانوں کے ایک گروپ نے انہیں انسانی ڈھال کے طور پر استعمال کرنے کی کوشش کی تھی۔ جب اس نے مزاحمت کی تو اسے بے رحمی سے پیٹا گیا اور اس واقعہ کے بعد کئی دنوں تک بستر پر پڑا رہا۔ ان کے اہل خانہ نے حکام سے شکایت کرنے کے بارے میں سوچا بھی نہیں تھا۔ اس کے ساتھ جو کچھ ہوا اس میں کچھ بھی غیر معمولی نہیں تھا۔ یہ ایک معمول کی بات تھی۔ جنسی تشدد کے سوال پر تنویر نے کہا کہ اس حوالے سے صورت حال نہ صرف خواتین بلکہ مردوں کے لئے بھی غیر محفوظ ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ خواتین جنسی تشدد کا شکار ہوئی ہیں، لیکن مردوں کو بھی نہیں بخشا گیا ہے۔

انہوں نے کہا کہ کشمیر میں جانور انسانوں سے زیادہ محفوظ ہیں، مسلح افواج جانوروں کے معاملے میں 'طاقت کا استعمال کرنے، یہاں تک کہ موت کا سبب بننے' یا 'وارنٹ کے بغیر گرفتاری' (افسپا، دفعہ 4) کی حقدار نہیں ہیں لیکن وہ محض شک کی بنیاد پر کسی بھی انسان کو قتل یا گرفتار کر سکتے ہیں۔ اگر فوجی اہلکار کسی مقدمے سے گزرتے ہیں تو کورٹ مارشل یا ٹرائل کی کارروائی کبھی بھی منظر عام پر نہیں لائی جاتی، جس سے ان فیصلوں کی صداقت پر سوالیہ نشان لگ جاتا ہے جو اکثر فوجی جوانوں کو کلین چٹ یا غیر ضروری سزائیں دیتے ہیں۔

یہاں تک کہ اگر افسپا اور آرمز ایکٹ کو ریاست سے منسوخ کر دیا جاتا ہے، تب بھی عصمت دری کے متاثرین کو ایف آئی آر درج کرانے میں اور منصفانہ جانچ کو یقینی بنانے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑتا ہے، تب بھی جب ملزم عام شہری ہوتے ہیں اور پھر اگر وہ مسلح افواج کے ممبر ہوں تو ان کے خلاف جانا کافی چیلنج ہے۔ پولیس متاثرین کی شہادتوں کی صداقت پر شک کرنے میں جلدی کرتی ہے، جس پر اکثر مزید ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے،

جس کی وجہ سے انہیں الزامات عائد کرنے یا ان کی پیروی کرنے سے حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔

'مبینہ مجرموں' کی رپورٹ میں نشاندہی کی گئی ہے کہ عصمت دری کے معاملوں میں حکام کے ذریعہ استعمال کی جانے والی زبان بھی اس رجحان میں کردار ادا کرتی ہے۔ جب ریپ اور جنسی استحصال کے معاملوں کی بات آتی ہے تو تفتیشی اور عدالتی نظام کے خلاف بھی سخت تنقید کی جاسکتی ہے۔ کیس نمبر 122 اور کیس نمبر 57 اس بات کی وضاحت کرتے ہیں کہ جموں وکشمیر پولیس اور دیگر سرکاری اداروں نے کس طرح غلط زبان استعمال کی گئی اس کا کسی بھی مقدمے پر اثر پڑ سکتا ہے جبکہ کیس نمبر 122 میں پولیس ریپ کے بجائے بدسلوکی کا حوالہ دیتی ہے، کیس نمبر 57 میں ایس ایچ آر سی نے اپنے حتمی فیصلے میں "ریپ" لفظ کا استعمال نہ کرنے پر زور دیا اور اس کے بجائے اسے "انسانی حقوق کی بدترین قسم کی خلاف ورزی" قرار دیا۔

اس طرح وادی کشمیر میں جنسی تشدد کو بڑے پیمانے پر استعمال کیا گیا ہے تا کہ ہندوستان اور ریاست کے خلاف بغاوت کے لئے اپنے لوگوں کو سزا دی جاسکے۔ عصمت دری جیسے ہولناک جرائم رپورٹ ہوئے ہیں لیکن انہیں نظر انداز کر دیا گیا ہے اور جھوٹ بولا گیا ہے۔ خواتین کی عصمت دری کی گئی تا کہ لوگوں کی تذلیل کی جاسکے اور ذمہ داروں کو سزا سے مستثنٰی قرار دے کر بے بس کر دیا جائے۔ تفتیش کے عمل ایک تماشا رہا ہے اور سزا سے استثنٰی کا اندازہ لگانا مشکل نہیں ہے۔ جی ہاں، آگے کا راستہ مشکل ہے اور ظالم مضبوط ہے، لیکن لوگوں میں عزم بھی ہے۔ ''کنن پوش پورہ'' میں اجتماعی عصمت دری کے متاثرین کی جدوجہد کی کہانی، جسے اس کتاب میں پیچیدہ انداز میں بیان کیا گیا ہے، اس حقیقت کی علامت ہے کہ کشمیری لڑنے کی خواہش رکھتے ہیں اور اپنی شکست ماننے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ ریاست نے یہ تمام مظالم اور غیر انسانی رویہ اس لیے رکھا کہ کشمیری اپنے پیدائشی حق، حق خود ارادیت سے تائب ہو جائیں لیکن ریاست کا یہ سخت گیر رویہ کشمیریوں کو نہ مزاحمت

سے روک سکا اور نہ حق آزادی مانگنے سے پچھاڑ سکا۔ کشمیری آج بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں 1947ء کو اس کے بڑوں نے مطالبہ کیا تھا اور آج کا نوجوان بھی یہی مطالبہ کر رہا ہے کہ ہم بھارت کے ساتھ نہیں رہنا چاہتے۔ بھارت نے کشمیریوں کی سماجی قدروں کو توڑنے کی جو کوشش کی ہے اس کے نتیجے میں وہ بھارت سے اور دور جاچکے ہیں، ان زخموں کو بھرنے میں بہت وقت لگے گا، یہ کشمیریوں کی اخلاقی مذہبی اور سماجی قدروں پر حملہ ہے جسے یہ قوم وقتی طور پر خاموش تو رہ سکتی ہے مگر کبھی بھلا نہیں سکتی۔

☆......☆

پانچواں حصہ

کنن پوش پورہ میں وہ رات

(ذیل میں زندہ بچ جانے والی خواتین کیلئے استعمال کیے جانے والے نام ان کے اصل نام نہیں ہیں بلکہ ہم نے ان کی رازداری رکھنے کیلئے فرضی نام دیئے ہیں)

دُرّی کی کہانی:

کشمیر میں یہ جما دینے والا فروری ہے۔ آج 23اور 24 فروری 1991ء کی درمیانی رات ہے، یہ ایک روشن چاندنی رات ہے۔ دنیا کے اس کونے میں زمین برف کی چادر سے ڈھکی ہوئی ہے۔ اتنی گہری کہ آپ گھٹنوں تک اس میں ڈوب جائیں۔ گھروں کی کھڑکیاں برف کی موٹی پرت سے ڈھکی ہوئی ہیں، بالکل یوں جیسے پہلی پرت پر شیشے کی ایک اور چادر ہو۔ شیشے پر اپنا ہاتھ رگڑتے ہی یہ منجمد ہو جاتا ہے۔ ٹھنڈی ہوا جو آپ کے چہرے پر ایک سیکنڈ کیلئے ٹکراتی ہے آپ کی سانس روک دیتی ہے۔

میں کشمیر کے کپواڑہ ضلع کے کنن گاؤں میں رہتی ہوں۔ یہ میرا گاؤں ہے۔ میں دُرّی ہوں، میں یہاں پیدا ہوئی ہوں، میں پہاڑوں، ڈھلوانوں، درختوں، پرندوں اور اس ندی کی دوست ہوں جو ہمیشہ جلدی میں لگتی ہے، میں ایک نوجوان لڑکی ہوں، شاید آپ ہی کی طرح، مجھے ستارے دیکھنا اور خوابوں میں کھوئے رہنا پسند ہے۔ عام طور پر اس وقت تک میں اپنے بستر پر اپنی بہن فاطمہ کے ساتھ سو رہی ہوتی ہوں اور کانگڑی (کشمیری حرارتی برتن) ہمارے ~~درمیان میں ہوتا ہے۔ یہ ہماری پرائیویسی کا وقت ہے، حالانکہ~~ میرے دو

کمروں کے اس گھر میں زیادہ پرائیویسی نہیں ہے،: میرا چھوٹا بھائی حسین ہمارے سروں پر ناچ رہا ہوتا ہے۔ وہ سب سے کم عمر اور سب سے پیارا ہے، ہمارے پاس یہاں تفریح کے لئے زیادہ کچھ نہیں ہے سوائے ایک ریڈیو کے، جسے زیادہ تر میرے دادا جنہیں میں 'باب' کہتی ہوں، استعمال کرتے ہیں، میں اسے خبریں اور کشمیری لوک گیت سننے کے لئے استعمال کرتی ہوں۔ اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ہماری زندگی بوریت زدہ ہے، ہر رات ہم شاید میری شادی کی تیاری کے لئے شادی کے گیت گاتے ہیں۔ آج رات ہمارا ساتھ دینے کے لیے میری دوست آمنہ بھی آئی ہوئی ہے، جو پڑوس کے گاؤں پوش پورہ میں رہتی ہے۔ جیسے ہی ہم گانا شروع کریں، میری ماں ہمیں ڈانٹنا شروع کر دیتی ہے،' کیا تم لوگ شادی کے بعد یہی کروگی؟ اب کچھ کھانا پکانا اور سلائی بھی سیکھو تا کہ تمہاری شادی کے بعد ہمیں بھی فخر ہو۔" میرے والد، اس کے برعکس، ہمارے گانے اور ہنسنے مسکرانے کو پسند کرتے ہیں، میں اپنے والد کو 'توتھ' کہتی ہوں، جس کا کشمیری زبان میں مطلب ہے کسی کا پسندیدہ ترین شخص۔ وہ جموں وکشمیر پولیس میں کانسٹیبل ہیں اور زیادہ تر وقت وہ گھر پر نہیں رہتے۔

میرے دادا میرے والد کے پیشے کو ناپسند کرتے ہیں کیونکہ انہوں نے اپنے بڑے بیٹے، میرے چچا کو فوج کی بندوق سے گولی لگنے سے کھو دیا۔ کتنا عجیب ہے ناں یہ کہ سیکورٹی فورسز کی گولی سے ایک بیٹے کو کھو دینا جب کہ آپ کا دوسرا بیٹا ایک آن ڈیوٹی پولیس اہلکار ہے۔ میرے چچا محمد اقبال ان نوجوانوں میں سے ایک تھے جو یہ سمجھتے تھے کہ بھارت کی جانب سے کشمیر پر قبضے کی سیاسی مزاحمت کا کوئی نتیجہ نہیں نکلا، پنڈت نہرو کے زمانے سے صرف جھوٹے وعدے کیے گئے اور اب بھی یہی سلسلہ جاری ہے۔ وہ سری نگر میں فوج کے ساتھ تصادم میں شہید ہو گئے تھے۔ میرے جیسی گاؤں کی لڑکی سے 'قبضہ'، 'مزاحمت'، 'پنڈت نہرو کے وعدے' جیسے الفاظ سننا آپ کے لیے عجیب ہوسکتا ہے، لیکن یہ سب کچھ میرے چچا نے مجھے بتایا۔ یہ وہی تھے جنہوں نے سڑکوں پر خون اور دھماکوں کے بارے میں

میرے سوالات کا جواب دیا جب کہ دوسروں نے مجھے بہت کم عمر جان کر ایسی باتیں مجھ سے چھپائیں۔ انہوں نے مجھے کشمیر کی کہانی صرف تقسیم ہند اور پنڈت نہرو کے وعدوں سے ہی نہیں بلکہ ڈوگرہ راج کے آغاز سے سنائی۔ پھر ایک دن ہمیں بتایا گیا کہ وہ نہیں رہے، ان کے متعلق آخری بات جو مجھے یاد ہے ان کے تابوت کو مقامی افراد کا لے جانا ہے جن کے پیچھے پانچ قریبی دیہاتوں کے ہزاروں لوگ چل رہے تھے، اس دن کے بعد مجھے یاد ہے کہ ہر فوجی محاصرے پر ہمارے ساتھ ''خصوصی'' سلوک کیا جاتا رہا جو اس سے کہیں بدتر ہوتا جس کا نشانہ مزاحمت سے دور رہنے والے گھروں کو سہنا پڑتا تھا۔ میری ماں لان میں میرے ساتھ کھڑی رہتیں اور فوج کو ہر طرح کی لوٹ مار کرنے دیتیں، وہ ان سے پوچھا کرتے تھے کہ چھپائے گئے ہتھیار دکھاؤ، وہ بے بسی سے رو دیتیں اور کہتیں ہمارے پاس کوئی ایسی چیز نہیں ہے، وہ انہیں میرے والد کے ایک پولیس آفیسر ہونے کا بتاتیں مگر وہ اس کی پرواہ نہ کرتے، وہ تو بس ہمیں یہ سمجھتے تھے کہ ہم متحارب خاندان ہیں جنہوں نے ریاست کے سامنے کھڑا ہونے کی جرات کی ہے اور بھارتی فوج سے لڑ رہے ہیں، وہ شام کے وقت یا رات گئے یا صبح سویرے محاصرہ کرتے اور میری فیملی کے ساتھ ہر بار یہی سلوک اختیار کیا جاتا۔

خیر میں تو شاید اس کی عادی ہو چکی تھی مگر پھر بھی آج کی رات مجھے عجیب سا خوف محسوس ہوا، بسا اوقات اندرونی کیفیت قبل از وقت ہونے والی بات سے آگاہ کر دیتی ہے، میں تسلیم کرتی ہوں مجھے اس کی وجہ معلوم نہیں، میں چونکہ آپ کو بے حد ایمانداری سے بتا رہی ہوں، لہٰذا مجھے اپنے خوف کو چھپانا نہیں چاہیئے، اور میں تو ہر رات اس خوف کے سائے میں سوتی ہوں، میرا گاؤں لائن آف کنٹرول کے قریب اور امن سے بہت دور ہے، ہر رات میں سورہ فاتحہ پڑھتی ہوں، اپنے چچا کی موت سے بہت پہلے سے ہر رات۔ میں یہ تب سے کر رہی ہوں جب سے میں نے اسکول سے واپسی پر راستے میں کپواڑہ کی سڑک پر خون دیکھا اور لوگوں کو نعرے لگاتے سنا ''ہم کیا چاہتے ہیں؟ آزادی'' اس کے باوجود آج رات

تک میں یہ نہیں سمجھ سکی کہ وہی لوگ جو خود کو ہمارا محافظ اور مسیحا کہتے ہیں ہتھیاروں کے ذریعے ہمارے روحوں کو چیر سکتے ہیں، یعنی اس وقت تک نہیں سمجھی جب ہمارے دروازے پر دستک کی آواز نے رات کی خاموشی توڑی۔ ہر فسانہ کچھ حقائق رکھتا ہے اور ہر حقیقت فسانہ لگتی ہے اگر ہم اس کا بھرپور مطالعہ کریں۔ ہم کبھی کسی چیز کے متعلق مکمل سچائی نہیں جان سکتے، خواہ ہم کتنا ہی اس کے لئے جستجو کریں۔

مذکورہ بالا فسانہ ''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں کے ساتھ میری ملاقاتوں اور گفتگو اور اس کے ساتھ ان تمام افراد کے بیانات سے متاثر ہے جن میں اس المیے کا نشانہ بننے والوں سے لے کر حقائق کے متلاشی، پولیس اور رپورٹرز شامل ہیں، یہ میرے ذہن میں آنے والے سوالات کے جواب کی صورت میں لکھی گئی تحریر ہے جی ہاں وہی سوالات جو دستاویزات اور انفرادی تفصیلات کا سامنا کرتے ہوئے اس وقت میرے حد درجہ فعال خیالات سے ٹکرائے یہاں تک کہ میرا دماغ اس حوالے سے سوچ سوچ کر شل ہو گیا، میں نے اس رات کے حقائق کا مطالعہ کرتے ہوئے جوابات جاننے کی کوشش کی مگر مجھے کوئی مکمل جواب نہ مل سکا، میں ان سوالوں کے جواب ڈھونڈ رہی تھی جیسے اس گاؤں کی لڑکی اجتماعی عصمت دری کا نشانہ بننے پر کیا محسوس کرتی ہوگی؟ مگر مجھے لگا کہ ہم میں سے کسی کے پاس بھی اس کا جواب نہیں ہو سکتا۔ اس لیے کہ جس ریاست میں ہم رہتے ہیں یہاں کے شہریوں کو ریاستی تحفظ حاصل نہیں۔

یہ علاقہ بے آئین ہے، یہاں کوئی قانون نہیں، یہاں کی ریاست کسی قانون اور دستور کی پابند نہیں اور یہاں کے عوام کو کسی کا سہارا اور آسرا نہیں بس قدرت کا ہی آسرا ہے لیکن قدرت کا قانون تو پھر کبھی کبھی ہی حرکت میں آتا ہے ہم ایسے لوگ ہیں کہ ہم پر کوئی ڈاکو یا دہشت گرد نہیں بلکہ ریاست خود حملہ آور ہے اور ہماری ہر چیز کی دشمن ہے، عزت کی، ہماری سماجی قدروں کی، ہماری معیشت کی اور سب سے زیادہ خطرناک بات یہ ہے کہ

ریاست عصمت کی دشمن ہے ۔اجتماعی عصمت دری اس کی ترجیح ہے، بس یہی خوف اب ہمیں ہنسنے نہیں دیتا، رات کو سونے نہیں دیتا اور دن کو چین نہیں لینے دیتا۔

☆......☆

پولیس کی تحقیقات

بیشتر لوگ 23 اور 24 فروری 1991ء کی اس درمیانی رات کو کنن پوش پورہ میں ہونے والی اجتماعی عصمت دری کے حوالے سے پولیس کی تحقیقات سے آ گاہ نہیں ہیں، یہ تحقیقات عصمت دری کا نشانہ بننے والوں کے نکتہ نظر کو ثابت کرنے کیلئے مناسب حقائق پر مبنی ثبوت فراہم کرتی ہیں، پولیس کے کاغذات میں قریباً دو سو صفحات متاثرہ عورتوں کے بیانات، گاؤں کے نقشوں، فوج کی طرف سے فراہم کردہ ملزمان کے متعلق برائے نام تفصیل اور عصمت دری کے واضح ثبوت دکھانے والی طبی دستاویزات شامل ہیں۔اس حوالے سے ثبوت اتنے مضبوط تھے کہ اس کیس کے ساتھ ساتھ سچائی کو دفن کرنے کی کئی کامیاب کوششیں کی گئیں۔تفتیشی افسر کا تبادلہ عین اس وقت کیا گیا جب وہ ملوث فوجیوں کی شناختی پریڈ کرنے جا رہے تھے۔

فوج کا امیج صاف رکھنے کے لیے متعصّبانہ رپورٹس شائع کی گئیں۔ رائٹ ٹو انفارمیشن ایکٹ کے تحت پوچھے گئے ایک سوال کے جواب میں نامکمل اور غلط جانکاری دی گئی تھی۔ پولیس کی جانب سے ریاستی ہیومن رائٹس کمیشن کو بھی غلط معلومات فراہم کی گئیں کہ اس معاملے میں کیس کو بند کرنے کی رپورٹ 1991ء میں ہی داخل کر دی گئی تھی جبکہ درحقیقت یہ رپورٹ مارچ 2013ء میں اس واقعہ کے 22 سال بعد اس وقت فائل کی گئی جب حکام کو اپنی انٹیلی جنس معلومات کے ذریعے پتہ چلا کہ ایک معاون گروپ ''کنن پوش پورہ'' معاملے سے متعلق ایک مفاد عامہ کی عرضی (پی آئی ایل) تیار کر رہا ہے۔

یہ باب اس کیس کے بعض دفن کئے گئے اور نامعلوم حقائق سے پردہ اٹھائے گا

اور کچھ اہم دستاویزات کو سامنے لانے کی بابت بتائے گا جیسے جموں وکشمیر پولیس کی جانب سے کپواڑہ کے جوڈیشل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کی گئی کیس ڈائری، ایس ایچ آر سی کے بیانات اور فیصلہ۔

اجتماعی عصمت دری کے متاثرین اور تشدد سے بچ جانے والوں کی جانب سے اگست 2013ء میں جموں کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی سی ایس) اور سپورٹ گروپ فار جسٹس فار کنن پوش پورہ (ایس جی کے پی) کی تحقیقی ٹیم کو دیے گئے بیانات اور اس واقعہ میں متاثرہ افراد کے ساتھ انسانی حقوق کے نمائندوں کی بات چیت۔ ریاست نے مقدمے کو خراب کرنے اور حقائق کو چھپانے کے لیے دھونس، دھمکی کا کھلے عام استعمال کیا، ہر سطح پر اس واقعے کو جھوٹا ثابت کرنے کی حتی الامکان کوشش کی گئی ہر فورم پر غلط معلومات مہیا کی گئیں اور دھونس کے ذریعے گواہان کو ڈرا دھمکا کر فرار کرانے کے ہتھکنڈے استعمال کیے گئے۔

یہ صرف ''کنن پوش پورہ'' میں ہی نہیں بلکہ ریاست جموں وکشمیر میں عصمت دری قتل و غارت اور تحریک آزادی سے جڑے ہر واقعے کو اسی طرح دبایا گیا مگر ''کنن پوش پورہ'' چوں کہ ایک بڑا واقعہ تھا جو بین الاقوامی شہرت حاصل کر چکا تھا اس لیے ریاست بھارت نے اس کو غلط ثابت کرنے کے لیے اپنی تمام مشینری کو استعمال کیا۔ اسی وجہ سے پولیس نے اس واقعے کی تحقیقات ہی نہیں کیں اور نہ ہی غیر جانبدار رپورٹ مرتب کی، الٹا اس واقعے کو ہی جھٹلا دیا کہ ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں لیکن اس کے باوجود کچھ رپورٹیں ایسی تھیں کہ جن سے مجرموں کو پکڑا جا سکتا تھا لیکن اتنے زیادہ طاقتور مجرموں کو کیسے پکڑا جائے؟ یہ ایک سوال ہے جو ابھی تک کنن پوش پورہ کے عوام کے ذہنوں میں گھوم رہا ہے۔

☆......☆

محاصرے اور تلاشی

یہ 1991ء کی بات ہے، اور آپ ایک کہانی پڑھنے والے ہیں کہ توپ خانے کا ایک بھی راؤنڈ چلائے بغیر جنگ کیسے جیتی جا سکتی ہے۔ کپواڑہ بھارت کے زیر انتظام کشمیر کا ایک دور افتادہ علاقہ ہے جو بین الاقوامی سرحد کے بہت قریب ہے۔ یہ پاکستان کے زیر انتظام کشمیر کے ساتھ ایک طویل سرحدی علاقہ ہے۔ درحقیقت سرینگر سے کپواڑہ کا فاصلہ تقریباً 85 یا 90 کلومیٹر اور کپواڑہ سے سرحد کا فاصلہ 40 کلومیٹر ہے۔ کپواڑہ کے پہاڑوں کے پار آزاد کشمیر یا پاکستان کے زیر انتظام کشمیر واقع ہے۔ کپواڑہ شہر سے 20 کلومیٹر طویل چکر دار سڑک کا فاصلہ طے کر کے آپ کنن اور پوش پورہ پہنچتے ہیں۔ زیادہ تر لوگ ان دونوں گاؤں کا دورہ اس لئے کرتے ہیں کہ وہ اس ایک رات کے بارے میں تجسس رکھتے ہیں۔ فروری کی وہ ٹھنڈی رات اب بھی اس جگہ پر سایہ فگن ہے اور شاید قیامت تک رہے، کوئی بھولنا بھی چاہے تو بھولنے والی نہیں۔

پولیس دستاویزات کے مطابق '23-24 فروری 1991ء کی درمیانی رات' کی کہانی تریگام میں 4 راجپوتانہ رائفلز، 68 ماؤنٹین بریگیڈ کے فوجی ہیڈ کوارٹر میں محاصرے اور تلاشی کی کارروائی کی منصوبہ بندی سے شروع ہوتی ہے۔ محاصرے اور تلاشی کی کارروائی اس وقت کی جاتی ہے جب فوج کو اپنے کسی مقامی یا انٹیلی جنس ذرائع کے ذریعے غیر معمولی نقل و حرکت یا 'ملک دشمن عناصر' کے خفیہ ٹھکانے کی اطلاع ملتی ہے۔ (اطلاع ملتی بھی ہے کہ نہیں مصنف اس سے باخبر نہیں تاہم یہ بھارتی فوج کا موقف ہے کہ آتنگ بادیوں کی بڑے پیمانے پر کارروائی کے لیے اس علاج میں روپوش ہونے کی اطلاع پر فوج نے یہ

کارروائی کی) اس علاقے کو محاصرے میں لے لیا گیا ہے، یعنی چاروں طرف سے فوجیوں نے گھیر رکھا ہے، اور پھر ایسے عناصر کو تلاش کرنے کے لئے گھر گھر تلاشی لی جاتی ہے۔فوج کے پاس آرمڈ فورسز اسپیشل پاورا یکٹ (افسپا) اور گڑ بڑ والے علاقوں کے ایکٹ کے تحت وسیع اختیارات ہیں اور وہ دن یا رات کے کسی بھی وقت محاصرے اور تلاشی کی کارروائیاں کر سکتی ہے۔مقامی زبان میں انہیں 'کریک ڈاؤن' کہا جاتا ہے۔

''کنن پوش پورہ'' کریک ڈاؤن کے معاملے میں، 4 راجپوتانہ رائفلز، 68 ماؤنٹین بریگیڈ کے فوجی جوانوں نے آپریشن کے لئے باضابطہ کلیئرنس حاصل کی اور بعد میں تریگام کیمپ میں تعینات فوجیوں کو اس کی بریفنگ دی۔ بٹالین رات 9 بجے فوجی کیمپ (تریگام) سے فوجی گاڑیوں میں روانہ ہوئی۔سڑکیں برف سے ڈھکی ہوئی تھیں اور یہ ایک روشن چاندنی رات تھی۔انہیں مضافات تک پہنچنے میں ایک گھنٹہ لگا، اور گاؤں کے اندرونی حصوں تک پہنچنے میں تھوڑا زیادہ وقت لگا۔فرار ہونے کے تمام ممکنہ راستوں کو بند کر دیا گیا اور گاؤں میں گھروں اور گوداموں (کتھاروں) میں تین 'تفتیشی مراکز' قائم کیے گئے۔

فوج کے بیانات اور تفتیشی افسر کی جانب سے فوج کو لکھے گئے خط جس میں کنن پوش پورہ آپریشن میں ملوث جوانوں کے نام کی فہرست مانگی گئی تھی، کے مطابق بیرونی محاصرے اور گھر گھر تلاشی کے لیے چار کمپنیاں قائم کی گئی تھیں۔چار کمپنیوں میں مجموعی طور پر 236 فوجی شامل تھے۔ان کمپنیوں کی کمان کرنل کے ایس دلال نے کی تھی۔الفا اور ڈیلٹا کمپنیوں کو بیرونی محاصرے میں تعینات کیا گیا تھا، جبکہ براوو اور چارلی کمپنیاں تلاشی اور پوچھ گچھ کی ذمہ دار تھیں۔فوجیوں کی فہرست سے پتہ چلتا ہے کہ الفا کمپنی میں 32 فوجی، بیٹا کمپنی میں 56، چارلی میں 44 اور ڈیلٹا میں 64 فوجی تھے۔مزید 32 افراد کو ہیڈ کوارٹرز کے سپاہیوں کے طور پر درج کیا گیا ہے۔فہرست میں ایک کوڈ ورڈ بھی استعمال کیا گیا ہے: الفا کے لئے اے، براوو کے لئے بی، چارلی کے لئے سی، ڈیلٹا کے لئے ڈی اور ہیڈ کوارٹر

کے لئے ایچ کیو۔کرنل کے علاوہ چار میجر، دو لیفٹیننٹ اور دو کیپٹن ان کمپنیوں کا حصہ تھے۔ان کمپنیوں کے سربراہ میجر مہیش کمار ماتھر، میجر ہوشیار سنگھ، لیفٹیننٹ رگھوراج اور میجر آر کھلر تھے۔اس طرح کل 236 نامزد اہلکار تعینات کیے گئے جن میں 8 افسر اور ایک ڈاکٹر شامل تھا تاہم گاؤں والوں نے ہمیں بار بار بتایا ہے کہ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ گاؤں میں ایک بٹالین سے زیادہ سپاہی ہیں۔غیر سرکاری ذرائع کے مطابق اس دن کنن پوش پورہ میں آپریشن کے لیے بھارتی فوج کی ایک بٹالین آئی تھی جس میں فوجیوں کی تعداد 600 تا 900 کے درمیان تھی اور کرنل سطح کا افسران کی کمان کر رہا تھا۔دو دو میجروں کو ایک ایک گاؤں میں تعینات کیا گیا۔ایک میجر کی نگرانی میں 200 سپاہیوں نے یہ کارروائی کی۔گویا چار چار سو سپاہی ایک ایک گاؤں میں داخل ہوئے۔

گاؤں جاتے ہوئے نائب صوبیدار مول چند کی قیادت میں فوج کے جوانوں کا ایک گروپ ترہ گام پولیس اسٹیشن پہنچا۔یہاں اسسٹنٹ سب انسپکٹر (اے ایس آئی) محمد سلطان کو نائب صوبیدار مول چند نے ''کنن اور پوش پورہ'' میں محاصرے اور تلاشی کی کارروائی کے بارے میں مطلع کیا۔اے ایس آئی نے ہدایت کی کہ دو پولیس اہلکار عبدالغنی (بیلٹ نمبر 244 ایس جی، ہیڈ کانسٹیبل) اور بشیر احمد (بیلٹ نمبر 389) مطلوبہ طریقہ کار کے مطابق 4 راجپوتانہ رائفلز، 68 ماؤنٹین بریگیڈ کے جوانوں کے ساتھ جائیں گے۔متعلقہ رجسٹروں میں اندراج ہونے کے بعد دونوں پولیس افسران فوج کے جوانوں کے ساتھ وردی میں تھانے سے چلے گئے۔مقامی پولیس نائب صوبیدار مول چند کی قیادت میں ٹیم کے ساتھ رات 11 بجے گاؤں پہنچی جبکہ باقی فوجی ان سے ایک گھنٹہ پہلے پہنچ چکے تھے۔مقامی پولیس سے توقع کی جاتی ہے کہ وہ اس طرح کی تلاشی کی کارروائیوں میں فوج کی حفاظت اور مدد کرے۔دونوں کانسٹیبلوں نے اپنے بیانات میں کہا ہے کہ گاؤں پہنچنے پر نمبردار (مقامی گاؤں کے ریونیو ہیڈ مین) سے نہ تو انہوں نے اور نہ ہی فوج نے کوئی رابطہ

کیا۔ جو کہ روایات و دستور کے مطابق ہے کہ فوج اور پولیس کسی گاؤں میں کوئی آپریشن کرتی ہے تو گواہ کے طور پر اس گاؤں کے نمبردار کو اعتماد میں لیتی اور ساتھ رکھتی ہے جو دراصل سرکار کا نمائندہ اور عوام اور سرکار کے درمیان پل کا کام بھی کرتا ہے نمبر دار آپریشن کے دوران بطور گواہ بھی موجود رہتا ہے کہ فورسز نے کوئی غیر قانونی یا غیر اخلاقی اقدام نہیں کیا۔ جب فورسز گاؤں سے واپس جاتی ہیں تو نمبردار ایک سٹرٹیفکیٹ جاری کرتا ہے لیکن اس مقدمہ میں نمبر دار کو معلوم ہی نہیں ہوا کہ کیا ہو رہا ہے۔

☆......☆

جڑواں دیہات پر فوج کا دھاوا

متاثرین/ واقعہ میں زندہ بچ جانے والے مردوں اور خواتین دونوں کے پولیس بیانات اور ایس جی کے پی اور جے کے سی سی ایس کے ارکان کے ساتھ بات چیت کے مطابق، فوج نے رات 11 بجے ان کے گھروں پر دستک دی یا دروازوں کو لاتیں مار کر توڑ دیا۔ حریت پسندوں کو تلاش کرنے کے بجائے فوج نے زبردستی مردوں اور عورتوں کو الگ کر دیا۔ 1990ء کی دہائی میں وادی بھر میں محاصرے اور تلاشی کی کارروائیوں کے دوران معمول کے طریقہ کار کے تحت، مردوں کو چند گھنٹوں کے لیے ان کے اہل خانہ سے الگ کر دیا جاتا تھا۔ بعض صورتوں میں انہیں لے جایا جاتا تھا اور وہ کبھی واپس نہیں آتے تھے۔ فوج مساجد کے لاؤڈ اسپیکروں پر اعلانات کرتی تھی اور مردوں کو کھیل کے میدان یا علاقے کے کسی ایسی ہی جگہ جمع ہونے کا حکم دیتی تھی۔ عورتوں کو ان کے گھروں میں تنہا اور لاچار چھوڑ دیا جاتا تھا اور پھر فوج گھر گھر جا کر حریت پسندوں اور ہتھیاروں کے لئے تلاشی لیتی تھی۔

محاصرے اور تلاشی کا یہ آپریشن مختلف نوعیت کا تھا۔ لاؤڈ اسپیکر پر آپریشن کے بارے میں اعلان کرنے کے بجائے، پانچ سے دس فوجی جتھوں کی شکل میں انہوں نے گاؤں کے مردوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا، انہیں زبردستی ان کے گھروں سے باہر نکالا اور خواتین کو اندر رہنے پر مجبور کیا۔ لائٹ بلب اور لالٹین کو توڑ دیا گیا اور موم بتیاں بجھا دی گئیں۔ وہ سفید رات ''کنن پوش پورہ'' کے عوام اور خاص طور پر عورتوں کے لیے سیاہ رات میں بدل گئی۔ ایسی سیاہ رات جہاں قیامت تک روشنی کی امید نہیں، سب مردوں کو گھروں

سے باہر نکال دیا گیا۔ ان کو یہ معلوم نہ ہوا کہ ان کے اہل خانہ کے ساتھ کیا سلوک ہوگا اور ان کو کہاں لے جایا جائے گا۔ بے سہارا اور بے آسرا ''کنن پوش پورہ'' کے عوام کو نا کردہ گناہوں کی سزا ملنی شروع ہوئی، ہر فرد اپنے ہی مسائل میں گرفتار ہو گیا اور ہر کسی نے اپنے حصے کی سزا پائی جو ناگفتہ بہ بھی ہے اور شرمناک بھی۔

سرد مگر چاندنی بھری اس سفید رات میں ریاستی سطح پر جو سیاہ کارنامہ ہوا اس کی جموں وکشمیر کی تاریخ کیا آج کی دنیا میں دوسری مثال شاید ہی ملے جہاں ریاست اپنے ہی نہتے عوام پر ٹوٹ پڑے وہ بھی خواتین و بچوں پر اور اس بربریت میں 70 سال کی خاتون اور 8 سال کی بچی کو بھی معافی نہ ملی ہو۔ بلا شبہ بھارتی فوج کا یہ ایک ایسا سوچا سمجھا جرم ہے جو قابل معافی نہیں لیکن ریاست خود اگر ایسا چاہ رہی ہو تو لاکھ کوشش کے باوجود مجرموں کو کٹھرے میں نہیں لایا جا سکتا۔ سو جموں وکشمیر کے عوام پر بھی ہونے والے مظالم پر مجرموں کو کبھی سزا نہیں دی گئی اور اس طرح ''کنن پوش پورہ'' کے مجرموں کو بھی شانتی کا سرٹیفکیٹ دیا گیا۔

☆......☆

جسمانی اذیت اور جنسی تشدد کا نشانہ بننے والے مرد

مردوں کو 'تفتیشی مراکز' میں لے جایا گیا۔ یہ عارضی ٹارچر چیمبرز تھے، جو عام طور پر کریک ڈاؤن کے دوران 'مشتبہ افراد' کے بارے میں تھرڈ ڈگری پوچھ گچھ کے لیے قائم کیے جاتے تھے۔ یہ مراکز گاؤں کے مزار کے قریب واقع ابلی ڈار کے گھر اور اسی طرح غنی ڈار اور اسد ڈار کے کوتھار (مویشیوں کے باڑے اور چاول/ چارے کے گودام) میں قائم کیے گئے تھے۔ یہ کوتھار لکڑی اور مٹی سے بنے ہوئے تھے جن کی چھتیں کچی تھیں۔ ابلی ڈار کا گھر مکمل طور پر لکڑی اور مٹی سے بنی دو منزلہ عمارت تھی۔ مختلف بیانات کے مطابق کمانڈنگ آفیسر کے ایس دلال کو فوجی ڈاکٹر شیام سندر کے ساتھ اس تفتیشی مرکز کے باہر بیٹھے دیکھا گیا۔ یہ گھر کنن گاؤں کے مضافات میں مزار کے بغل میں واقع ہے۔ فوج کے بیان میں درج ہے کہ تفتیشی مراکز میں فوجیوں میں کیپٹن راجن مہاجن، نائب صوبیدار حقیقت رائے، صوبیدار دیا رام، حوالدار مانسا رام اور رائفل مین اجمیر سنگھ شامل تھے۔

پولیس کو دیئے گئے مردوں کے بیانات ہمیں اس رات کی ایک واضح اور خوفناک تفصیل فراہم کرتے ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ گاؤں کے سبھی مردوں کو آہستہ آہستہ پوچھ گچھ مراکز کے باہر جمع کیا گیا۔ انہیں برف میں ننگے پاؤں بٹھایا گیا۔ یہ سخت سردی کی رات تھی۔ فروری کے مہینے میں کشمیر میں ہوا اس قدر ٹھنڈی ہوتی ہے کہ جسم کو کاٹ کر رکھ دیتی ہے۔ ساری رات گاؤں والوں (مردوں) کو برف پر ننگے پاؤں بٹھایا گیا۔ بعد میں، جب انہیں فوج نے منتشر ہونے کے لیے کہا، تو انہیں احساس ہوا کہ وہ مشکل سے چل سکتے ہیں کیونکہ برف اور صفر سے کم درجہ حرارت نے ان کی ٹانگوں کو بے حس کر دیا تھا۔ ان کی ٹانگوں کو حرکت

حاصل کرنے میں کئی گھنٹے لگے اور ان میں بعض کو اس کے نتیجے میں طویل مدتی بیماریوں کا سامنا کرنا پڑا۔

جے کے سی سی ایس کے ساتھ اپنی بات چیت میں اور اپنے پولیس بیانات میں مردوں نے ان کے ساتھ ہونے والے تشدد کے بارے میں بات کی۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے ایک نے بتایا، 'رات کے تقریباً 11 بج رہے تھے جب میں نے دروازے پر دستک کی آواز سنی اور فوری طور پر لائٹ آن کر دی۔ پھر دروازہ دوبارہ پیٹا گیا۔ میں نے جلدی سے اپنے کپڑے پہننے کی کوشش کی۔ اس سے پہلے کہ وہ دروازہ کھول پاتا، دروازہ ٹوٹ گیا اور فوج کے 10 سے 12 جوان زبردستی اس کے دومنزلہ گھر میں داخل ہو گئے۔ انہوں نے اسے گھسیٹ کر گھر سے باہر نکالا اور اس کی بیوی، سوتیلی ماں اور تین بیٹیوں کو اپنے ساتھیوں کے ساتھ اکیلا چھوڑ دیا۔ ان کی دو بیٹیاں نابالغ تھیں اور ایک حاملہ تھی، جو اپنے ننھیال آئی ہوئی تھی۔

''جب وہ مجھے کچھ گز تک گھسیٹ کر تفتیشی مرکز لے گئے، تو میرا سر بے رحمی سے پانی سے بھری بالٹی میں ڈبویا گیا یہاں تک کہ میں نے زیادہ مقدار میں پانی پی لیا۔ بات یہیں نہیں رکی، میرے اوپری جسم (گردن، کندھے اور پیٹھ) کو لاٹھیوں سے پیٹا گیا۔ چونکہ میرا گھر تفتیشی مرکز سے زیادہ دور نہیں تھا، اس لیے میں رات بھر اپنے گھر والوں کی چیخیں سن سکتا تھا۔ اس دوران وہ کچھ وقت کے لئے رک جاتے اور پھر پورے عمل کو دوبارہ دہراتے۔ یہ سلسلہ ساری رات جاری رہا۔ وہ مجھ سے معمول کا سوال پوچھتے رہے: 'بول سالے ہتھیار کدھر ہے، عسکریت پسند کہاں چھپائے ہیں؟''

یہ سلسلہ اس وقت تک جاری رہا جب تک کہ اسے صبح رہا نہیں کر دیا گیا۔ گاؤں والوں نے ہمیں بتایا کہ دوسرے مردوں سے پوچھ گچھ کے طریقے معمولی تبدیلیوں کے ساتھ ایک جیسے تھے۔ عزیز شاہ، گاؤں کے نمبردار نے اپنے بیان میں بتایا کہ وہ اپنی بیوی،

دو بیٹوں اور ان کی بیویوں کے ساتھ اپنے دومنزلہ گھر میں رہتا تھا۔ اس نے اپنے دروازے پر دستک کی آواز سنی تھی۔ "میرے گھر میں بجلی نہیں تھی۔ تو میری بیوی نے موم بتی جلانے کی کوشش کی اور اسی دوران میں نے دروازہ کھول دیا۔ میں نے 10-12 فوجی جوانوں کو وردی میں دیکھا۔ انہوں نے میرے کوائف کی تصدیق کی اور میری موجودگی میں ایک کمرے کی تلاشی لی۔ انہیں کچھ بھی قابل اعتراض نہیں ملا۔ اس نے بتایا کہ گاؤں کے دیگر مردوں کی طرح ان کی فیملی کے مرد ممبروں کو بھی خواتین کو اکیلا چھوڑ کر گھر سے باہر نکال دیا گیا۔ جب اسے اپنے گھر کے پیچھے بہنے والی ندی میں لے جایا جا رہا تھا، تو اسے بیلچے سے مارا گیا۔ اس کا سر بار بار ندی کے ٹھنڈے پانی میں ڈبویا گیا اور اس سے عسکریت پسندوں اور ہتھیاروں کے بارے میں پوچھا گیا۔ جب اس نے کہا کہ اسے اس کے بارے میں کوئی جانکاری نہیں ہے، تو اسے ایک بار پھر بیلچے سے ضربیں لگائی گئیں۔

دیگر مردوں نے جے کے سی سی ایس اور ایس جی کے پی کو بتایا کہ کس طرح وہ اپنی خواتین کی عصمت دری اور ساتھی مردوں کو تشدد کا نشانہ بنائے جانے کی چیخیں سن کر خود کو بے بس محسوس کرتے رہے۔ زندہ بچ جانے والوں میں سے ایک، جس کے چار بیٹے اور دو بیٹیاں تھیں، نے کہا :

''میں نے گاؤں بھر میں چیخیں سنیں۔ میں نے اپنے صحن میں کچھ آوازیں سنی تھیں۔ معلوم کرنے کے لیے میں نے کھڑکی سے باہر دیکھا۔ فوجیوں نے میری اجازت کے بغیر میرے صحن میں لکڑیاں جلائی ہوئی تھیں۔ دوسرے تمام مردوں کی طرح میں بھی اپنے خاندان سے جدا ہو گیا تھا۔ مجھے غنی ڈار کے کوٹھار لے جایا گیا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ کچھ لوگوں کو بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔ ان میں سے کچھ برف پر ننگے سینے کے ساتھ لیٹے تھے''۔

انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ پوچھ گچھ مراکز کے باہر اپنی باری کا انتظار کر رہے تھے

اوراس دوران دیگرلوگوں کوفوجیوں کی طرف سے لاتوں اورتشدد کا نشانہ بنایا جارہا تھا۔'پوچھ گچھ' کے دیگر طریقوں میں جسم کے حساس حصوں پر کرنٹ لگانا اور سروں کو سرخ مرچ ملی پانی کی بالٹیوں میں ڈبونا شامل تھا۔ کرنٹ لگنے کی وجہ سے پوچھ گچھ سے گزرنے والے افراد کو کئی دنوں تک جسمانی طور پر شدید تکلیف کا سامنا کرنا پڑا اور بعض مستقل طور پر مفلوج ہوگئے۔ان میں سے بہت سے لوگ اب بھی مختلف جسمانی امراض کی صعوبتیں جھیل رہے ہیں،مثال کے طور پر ہمیں بتایا گیا کہ ابلی ڈار کی ٹانگ کو'رولر ٹریٹمنٹ' سے نقصان پہنچا،اس کی ٹانگوں پر لکڑی کا بھاری شہتیر رکھا گیا،دوسپاہی اس پر بیٹھ گئے اور زیادہ سے زیادہ تکلیف پہنچانے کے لیے شہتیر کو اسکی ٹانگوں پر گھما کر اس کی ہڈیوں کو کچل دیا گیا۔ڈار، جو اپنی طاقت کی وجہ سے گاؤں میں 'پہلوان' کہلاتا تھا،اس رات کے بعد سے ایک معذور شخص کی زندگی بسر کررہا تھا اور صرف بیساکھیوں پر چل سکتا تھا۔اس کی ٹانگوں کی کئی سرجریاں ہوئی تھیں لیکن مکمل صحت یاب نہ ہوا تو اس کی ٹانگ مکمل طور پر کاٹ دی گئی تھی۔ جون 2014ء میں سرجری کی پیچیدگیوں کی وجہ سے وہ انتقال کرگیا۔

ان میں سے کئی مرد ایسے ہیں کہ جو اپنے اوپر ہونے والے تشدد اور گھر کی عورتوں کے ساتھ ہونے والے سلوک کی وجہ سے ذہنی امراض میں مبتلا ہوکر مضطرب ہوگئے۔ گویا اس واقعہ کے بعد ''کنن پوش پورہ'' کی سماجی زندگی ہی تبدیل ہوگئی۔

☆......☆

متاثرہ/زندہ بچ جانے والی خواتین

خواتین کے مطابق عصمت دری یہ بتانے کیلئے کافی لفظ نہیں کہ ان کے ساتھ کیا کچھ کیا گیا تھا۔ یہ ریپ نہیں تھا، جنگ تھی۔ عورتوں کو کم از کم پانچ سے چھ فوجی جوانوں نے پکڑ کر قابو کررکھا تھا کیونکہ ان کے شوہروں، باپوں اور بیٹوں کو زبردستی ان سے الگ کردیا گیا تھا۔ وہ بے بسی سے مدد، رحم کے لئے چیخیں، روئیں، چلائیں مگر ان کی چیخوں کا جواب نہیں دیا گیا۔ بندوقیں ان کے سینوں اور منہ پر لگی ہوئی تھیں۔ان سے کہا گیا تھا کہ وہ چیخیں نہیں ورنہ انہیں گولی ماردی جائے گی۔فوج کے جوان نشے میں دھت تھے،آپریشن کے دوران انہیں شراب پیتے ہوئے دیکھا گیا تھا۔ان کے پاس سے شراب کی بو آرہی تھی۔انہوں نے عورتوں کے فیرن (کپڑوں کے اوپر پہنے جانے والے لمبے روایتی گاؤن) پھاڑ دیے۔ انہوں نے ان کے پاجامے اتارے اور ان کی عصمت دری کی، اس دوران بھی وہ شراب پیتے رہے۔ وہ باری باری آتے جاتے رہے، اور کبھی کبھی کسی خاص گھر کے دو چکر بھی لگا لیتے تھے۔عورتوں نے مزاحمت کی لیکن کوئی فائدہ نہیں ہوا۔

نابالغ لڑکیوں، گونگی اور بہری، جسمانی طور پر معذور اور حاملہ خواتین کو بھی نہیں بخشا گیا۔ ماؤں کو ان کی بیٹیوں کے سامنے زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔دادی اور ان کی پوتیوں کو ایک ہی کمرے میں زیادتی کا نشانہ بنایا گیا۔زندہ بچ جانے والی عورتوں کا کہنا تھا کہ ان کے سینے پر،جسم پر ہر جگہ، یہاں تک کہ کولہوں پر بھی کاٹنے کے نشانات تھے۔ان میں سے بہت سی خواتین نے دیگر چوٹوں کے علاوہ منہ اور اپنے نجی اعضاء سے خون بہنے کے بارے میں بھی بتایا۔زندہ بچ جانے والی خواتین میں سے ایک نے مارچ 1991ء میں پولیس کو

دیے گئے اپنے بیان میں جے کے سی ایس اور ایس جی کے پی کو بتایا کہ اس نے رات 11 بجے دروازے پر دستک کی آواز سنی۔ جیسے ہی دروازہ کھولا گیا فوج کے جوان اندر گھس آئے اور اس کے شوہر اور دیور کو لے گئے۔ کچھ لوگ پیچھے رہ گئے اور گھر کی تلاشی لی۔ چونکہ انہیں کچھ بھی 'قابل اعتراض' نہیں ملا تو انہوں نے اسے پکڑ لیا اور اس کی عصمت دری کی۔ 'وہ میری عصمت دری کے دوران شراب پی رہے تھے۔ میرے بچے چیخ رہے تھے لیکن میری مدد کرنے والا کوئی نہیں تھا۔ وہ بے ہوش ہوگئی اور صبح ہی ہوش میں آئی۔ اس کا شوہر اور دیور بھی صبح لوٹ آئے۔ اس کے بہنوئی کا خون بہہ رہا تھا اور اس کی حالت نازک تھی۔ کچھ دن بعد پولیس ڈپٹی کمشنر کے ساتھ ان کا بیان ریکارڈ کرنے آئی۔ اس نے ثبوت کے طور پر اپنے کپڑے حوالے کیے۔ اسے طبی امداد فراہم کی گئی۔ اس رات کو یاد کر کے وہ بتاتی ہے کہ اس نے پولیس کانسٹیبلوں کو فوج کے ساتھ دیکھا تھا لیکن 'وہ میری مدد نہیں کر سکے کیونکہ فوج انہیں بھی مار رہی تھی۔

سبھی گھروں میں ایک جیسی کہانیاں تھیں، کچھ ایک یا دو کے بارے میں اور کچھ عورتوں کے پورے گھرانوں کے بارے میں۔ ان میں سے کئی نے بتایا کہ گھر میں موجود نابالغ نوعمر لڑکیوں کے ساتھ بھی عصمت دری کی گئی تھی، لیکن انہوں نے اجتماعی طور پر پولیس کو ان کے نام نہ بتانے کا فیصلہ کیا۔ بہت سے بیانات میں، زندہ بچ جانے والی لڑکی نے صرف اپنے یا شادی شدہ رشتہ داروں کا نام لیا ہے۔ اکثر وہ اس بات کا ذکر کرتی ہیں کہ ان کے علاوہ تمام دیگر 'کمزور' عورتیں شاید اپنی حفاظت کیلئے اس رات گھر سے دور تھیں۔ ایک نے جے کے سی ایس اور ایس جی کے پی کے محققین کی ایک ٹیم کو یاد کرتے ہوئے کہا: 'مجھے یاد ہے کہ رات کے 11:30 بجے ایک دستک ہوئی تھی۔ وہاں 20-21 فوجی تھے، کچھ لوگ گھر میں داخل ہوئے۔' اس کے شوہر کو لے جانے کے آدھے گھنٹے کے بعد، فوج کے کچھ جوان واپس آئے اور اندھیرے میں اس کی عصمت دری کی۔ 'انہوں نے میری

عصمت دری کرتے ہوئے ہتھیار زمین پر رکھے ہوئے تھے۔ میں نے فوجی ڈاکٹر سے جانچ کرانے سے انکار کر دیا اور صرف پولیس کو اپنا بیان دیا، جو سات دن بعد آئی۔ میں نے شراب کی بچ جانے والی بوتلیں بھی انہیں دکھائیں۔ اس نے بتایا کہ اس کے بڑے بیٹے کو بھی بری طرح تشدد کا نشانہ بنایا گیا، اس کے جنسی عضو کے نیچے بجلی کے جھٹکے لگائے گئے اور اس کے مقعد میں مرچ پاؤڈر ڈالا گیا۔ اس کی حالت نازک تھی اور تشدد کے بعد وہ کئی ہفتوں تک بستر پر پڑا رہا۔

نابالغ لڑکیوں کی بھی عصمت دری کی گئی، لیکن ان میں سے صرف تین نے، جن میں سے ایک پولیو کی مریض تھی، اپنا معائنہ کرانے کی ہمت کی۔ یہ ہچکچاہٹ ممکنہ طور پر عصمت دری سے منسلک سماجی بدنامی اور اس خوف کی وجہ سے تھی کہ ان کی شادی مشکل ہو جائے گی، مگر اس کے باوجود نابالغوں کی عصمت دری کو چھپانے کی کوشش انہیں بدنامی سے بچانے میں ناکام رہی۔ عصمت دری کی بدنامی گاؤں کی عورتوں کے ناموں سے جڑی ہوئی تھی، نابالغ، شادی شدہ یا بوڑھی سبھی کے ساتھ، خواہ انہوں نے باضابطہ طور پر اپنی عصمت دری کے بارے میں بات کی ہو یا اسے چھپایا ہو۔

اسی طرح وہاں ایک گونگی اور بہری لڑکی اور ایک حاملہ عورت کی عصمت دری کی دل دہلا دینے والی کہانیاں ہیں۔ تمنا نامی عورت کے حمل کو نواں مہینہ تھا، جب اس کی عصمت دری کی گئی۔ اس نے واقعہ کے کچھ دن بعد ایک بچے کو جنم دیا، اس حالت میں عصمت دری کی وجہ سے جس کا بازو ٹوٹا ہوا تھا۔ ایک اور خاتون سے اس کے بچے کو اس کی ماں سے چھین لیا گیا جب اس نے بچے کو اپنے سینے سے گلے لگانے کی کوشش کی تو اسے گراؤنڈ فلور کی کھڑکی سے باہر برف میں پھینک دیا گیا۔ تمنا کے معاملے میں، اس کے والد نے بتایا کہ کس طرح اس کا نواسہ اس دنیا میں آنے سے قبل ہی جنگ کا نشانہ بنا۔ وہ بتاتے ہیں۔

''میرا خاندان میرے والد، پولیس ڈپارٹمنٹ میں کام کرنے والے بڑے بیٹے،

اس کی بیس سال کی بیوی، میرے دوسرے پندرہ سالہ بیٹے، تیسرے بارہ سالہ بیٹے، تین بیٹیوں، میری بیوی افق اور میری سوتیلی ماں پر مشتمل تھا، ہم ایک ڈھائی منزلہ مکان میں رہتے تھے، دونوں منزلوں پر چار چار کمرے تھے، میری بڑح بیٹی تمنا اس وقت حمل سے تھی اور ہمارے ہاں مطلب اپنے ننھیال میں رہنے آئی ہوئی تھی جب اس کی عصمت دری کی گئی''۔

تمنا کی ماں، افق خود اس واقعے کی متاثرہ خاتون ہیں۔ اسے زیادہ واضح اندازہ تھا کہ کیا ہوا، کیوں کہ جب اس کے ساتھ عصمت دری کی گئی تو وہ تمنا کے ساتھ گھر پر تھی۔ وہ دونوں گراؤنڈ فلور کے ایک کمرے میں تقریباً ایک گھنٹہ قبل سوئی تھیں۔ افق کے سسرا گلے کمرے میں سو رہے تھے جب کہ اس کے شوہر پہلی منزل پر اپنے دو بیٹوں کے ساتھ سو رہے تھے۔ اس واقعہ کے متعلق اس نے بتایا۔

''میں نے کچھ عجیب سی آواز سنی اور سمجھی یہ بلی ہے۔ تھوڑی دیر بعد میں اپنے کمرے سے باہر نکلی اور اپنے سسر کے کمرے کی کھڑکی سے باہر دیکھا تو وہاں تین فوجی نظر آئے۔ میں چاند کی روشنی میں ان کی وردیاں دیکھ سکتی تھی، انہوں نے ہیلمٹ اور جیکٹس بھی پہن رکھی تھیں۔ میرے بوڑھے سسر مفلوج اور بستر پر تھے اور کچھ کرنے کے قابل نہ تھے۔ میں نے لالٹین جلائی، دروازہ کھولا اور اپنی بیٹی کو لے کر تیزی سے دوسری منزل پر چلی گئی۔ میں نے کوئی راستہ نہ دیکھتے ہوئے بالکونی کا دروازہ کھولا اور نیچے کودنے کا سوچا۔ میں نے اپنی بیٹی سے کہا کہ ہمیں نکل جانا چاہئے۔ میری بیٹی جو نو ماہ کی حاملہ تھی، سخت ڈری ہوئی تھی، اس نے میرے بال مضبوطی سے پکڑ لیے اور رونے لگی، 'مجھے ان (فوجیوں) کے رحم و کرم پر اکیلا نہ چھوڑیں'۔ جب فوجی اندر داخل ہوئے تو میں نے دیکھا کہ ان کی پتلون کی زپ پہلے سے کھلی ہوئی تھی، ظاہر ہے وہ ہماری عصمت دری کے ارادے سے ہی آئے تھے''۔

انہوں نے دوسرے کمروں کی چابیاں مانگیں۔ اس کے شوہر کو پہلے ہی فوج اپنے ساتھ لے جا چکی تھی۔ اس کی بیٹی تمنا کو اس سے الگ کیا جا چکا تھا۔ تمنا کو دوسرے کمرے میں

لے جایا گیا اور وہاں عصمت دری کی گئی، افق کے مطابق:

''تین فوجیوں نے مجھے جکڑ رکھا تھا اور 8 سے 10 فوجیوں نے باری باری میری عصمت دری کی، ان کے بڑی بیٹری کی ٹارچیں تھیں، وہ انہیں مجھے برہنہ دیکھنے کے لئے استعمال کرتے تھے اور اس دوران نازیبا جملے کستے تھے۔ انہوں نے کئی گھنٹوں تک میری عصمت دری کی۔ کچھ دیر بعد میں درد کی وجہ سے بے ہوش ہوگئی''۔

تمنا نے اس واقعے کے تین دن بعد اپنے بچے کو جنم دیا۔ تمنا کے بیٹے کا میڈیکولیگل سرٹیفکیٹ مورخہ 12 مارچ 2014ء اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ اس کی پیدائش ہوئی ہے اور 'فوجیوں کی جانب سے بدسلوکی کے باعث' اس کے بازو پر چوٹ لگی ہے۔

زندہ بچ جانے والوں میں سے ایک کی عمر (ایس ایچ آر سی کے مطابق) 13 سے 14 سال تھی، اور جے کے سی ایس اور ایس جی کے پی کو دیے گئے اپنے بیانات کے مطابق وہ تقریباً 16 سال کی تھی لیکن اسے پولیس ریکارڈ میں 'نابالغوں' میں شامل نہیں کیا گیا تھا کیوں کہ اس کا پردہ بکارت پھٹ چکا تھا۔ اس کی شادی اس بھیانک رات سے 11 دن پہلے ہوئی تھی۔

23 اور 24 فروری کی رات وہ اپنے سسرال میں تھی جب 4 اور 24 راجپوتانہ رائفلز کے سیکورٹی اہلکارز بردستی گھر میں داخل ہوئے۔ مردوں کو گھر سے باہر جانے کا حکم دیا گیا اور چار سے پانچ فوجی اس کے کمرے میں داخل ہوئے اور اس کی عصمت دری کی۔ صبح فوج کے گاؤں چھوڑنے کے بعد گاؤں والے اس کی مدد کو پہنچے اور علاج اور معائنے کے لئے ڈاکٹر کے پاس لے جایا گیا۔ اپنے پولیس بیان میں اسی زندہ بچ جانے والی خاتون نے بتایا کہ اس نے شور مچایا لیکن کوئی بھی اسے بچانے کے لئے نہیں آیا۔ اس نے سخت مزاحمت کی تھی لیکن فوجیوں پر حاوی ہونے میں ناکام رہی تھی۔

فوجیوں نے ان چھوٹے بچوں کو نظر انداز کر دیا جو اپنی ماؤں، بہنوں اور دادی کی عصمت دری کے بعد رو رہے تھے اور چیخ رہے تھے۔ اس وقت فوج کا کمانڈنگ افسر پوچھ گچھ کے مرکز میں تھا جو بمشکل چند گز کی دوری پر تھا۔ وہ واضح طور پر جانتا تھا کہ گاؤں میں

کچھ 'غیر معمولی' ہو رہا ہے، کیونکہ کئی عینی شاہدین نے بتایا کہ اس نے کھڑکی پر ایک طاقتور مشعل روشن کی اور فوجیوں پر چلا کر بولا کہ وہ ریپ کے دوران اتنا شور نہ کریں۔ خواتین کا کہنا ہے ایسا لگتا تھا کہ فوجیوں کو ان کی عصمت دری کرنے کا حکم دیا گیا تھا۔ فوجیوں نے گھر کی نچلی منزل سے ایک بچے کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا جسے بعد میں 24 فروری کو علی الصبح پولیس کانسٹیبل عبدالغنی نے اس وقت بچایا جب وہ گاؤں کے گھروں کے چکر لگا رہا تھا۔ بچہ کئی گھنٹوں سے برف پر پڑا ہوا تھا۔ کانسٹیبل نے اسے گارڈن کے حصے سے اٹھایا اور گھر کے برآمدے میں رکھا۔ وہ گھر میں داخل ہوا اور، جیسا کہ اس نے دوسرے گھروں میں کیا تھا، جنسی تشدد کا نشانہ بننے والی برہنہ عورت کو وہاں نیم بے ہوشی کی حالت میں پا کر کمبل سے ڈھانپ دیا۔ اس نے اسے بتایا کہ اس کا بچہ برآمدے میں ہے اور اسے تھوڑی چوٹ آئی ہے مگر ویسے ٹھیک ہے۔ لیکن ماں حرکت کرنے سے قاصر تھی اور اپنے بچے کو اس وقت تک گھر میں واپس نہیں لا سکتی تھی جب تک کہ اس کا شوہر واپس نہ آ جائے۔ اس کا شوہر کافی دیر بعد جب گھر پہنچا تو وہ چلنے کے قابل نہیں تھا تاہم رینگتا ہوا گھر کو پہنچا لیکن اس میں اتنی سکت نہیں تھی کہ بچے کو اٹھا کر اندر لاتا۔ بچے کا ایک حصہ برف سے شل ہو چکا تھا، بچے کی ماں کی بھی ہمت نہیں تھی کہ وہ خود اٹھے اور بچے کو لے آئے تاہم کچھ دیر بعد گاؤں کا کوئی دوسرا فرد آیا جو بچے کو اٹھا کر ماں کے پاس لایا تو وہ بے ہوش ہو چکی تھی، اب ان کے پاس گرم کپڑے بھی نہ تھے جو اس بچے کو اس میں لپیٹ لیتے اور اگر تھے بھی تو انہیں تلاش کرنا ایک مسئلہ تھا، بچے کو مکمل ہوش میں آنے میں کچھ دن لگے تاہم مکمل صحت یابی میں کئی سال گزر رے کیونکہ برف میں پڑے رہنے سے ایک حصہ جل چکا تھا اور اس میں خون کے رواں ہونے میں بہت وقت لگا۔ اس طرح ''کنن پوش پورہ'' کے کئی اور بچے بھی مفرور ہو گئے یا موت اور زندگی کی کشمکش میں کئی سال نکالے۔ بھارتی فوج کے یہ مظالم کشمیری کبھی بھول نہیں سکتے۔

☆......☆

دُرّی کے دروازے پر دستک

میری بہن اور میں نے کانگڑی کو اور بھی قریب سے چمٹا لیا۔ ہم اس دستک سے خوفزدہ تھیں۔ جو دروازے پر اچانک دی گئی کیوں کہ یہ زور سے اور خوفناک تھی۔ اچانک کیا آفت آ گئی اس سرد ترین رات میں جہاں ہر چیز منجمد ہے کون آ گیا۔ ایسا لگتا تھا کہ کوئی ہمارے گھر کا دروازہ توڑنا چاہتا ہے۔ میرے دادا جلدی سے اٹھے اور دروازہ کھولا۔ میں نے کچھ الفاظ سنے ' کتنے آدمی ہو گھر میں۔" کوئی نہیں صاحب بس میں ہوں"۔ میں نے کھڑے ہونے کی کوشش کی۔ مجھے کسی نے روکا۔ یہ آمنہ تھی، اس نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا۔ جیسے ہی میں نے اس کی طرف رخ کیا، میں نے اس کے چہرے پر ناپسندیدگی دیکھی۔ اب میں نے مزید واضح طور پر سننے کی کوشش کی، میں نے دیکھا کہ آمنہ اور فاطمہ بھی ایسا ہی کر رہی تھیں۔ اس سب کے درمیان میں ایک عورت کی آواز سن سکتی تھی۔ میری ماں کسی سے التجا کر رہی تھی۔

دفعتاً 'توتھ' (میرے والد) نے 'ٹوتھ' نے چیخ کر ''یا خدایا'' پکارا۔ کچھ ہی دیر میں فوج کا ایک سپاہی ہمارے سامنے نمودار ہوا۔ مجھے اس کے پاس سے ناگوار شے کی بو آ رہی تھی اور پھر میں نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں شراب کی بوتل تھی۔ میرا حلق خشک ہو چکا تھا۔ میں چیخ بھی نہیں سکتی تھی، نہ ہی میں کھڑی ہو سکتی تھی یوں لگا جیسے زمین نے مجھے جکڑ لیا ہو۔ میری بہن فاطمہ اور آمنہ نے مجھے دونوں طرف سے مضبوطی سے تھام لیا۔ میں نے ان کی انگلیاں اپنے بازوؤں میں چبھتی محسوس کیں۔ ایک سے چھ فوجی ہو گئے اور دوسرے بھی ان میں آن ملے۔ میں چیخنا چاہتی تھی، میں اپنے دادا کی بات نہیں سن سکی۔ مجھے نہیں معلوم

تھا کہ وہ میری ماں کو کہاں لے گئے۔ان میں سے ایک نے میرے بالوں کو پکڑ لیا۔ میں نے اس کے پاؤں پکڑ لیے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے ان سے بھیک مانگی تھی، 'خدا کے لیے ہمیں چھوڑ دو، ہم نے کچھ نہیں کیا'۔ یہاں تک کہ میں نے اپنی پیشانی اس کے جوتوں پر جھکا دی۔ وہ مجھے گھسیٹ کر باورچی خانے میں لے گیا۔ میری ماں پہلے سے ہی وہاں موجود تھی، میں نے اپنی پوری توانائی کے ساتھ چیخ کر کہا، 'ماں، مجھے بچا لو، مگر وہ کیسے مجھے بچا سکتی تھی، وہ خود بھی ظالموں کے شکنجے میں تھی۔ میں وہ سب نہیں بتانا چاہتی جو میں نے اس کے ساتھ ہوتے دیکھا اور یاد کیا۔ میرا فیرن چیر دیا گیا تھا اور اس کے ساتھ میری پوری زندگی بھی۔

جب مجھے ہوش آیا تو میرا سر خالی تھا اور میں بے حس محسوس کر رہی تھی۔ میرا چہرہ گیلا تھا۔ مجھے لگا کہ میں رو رہی ہوں، میں برہنہ تھی، نہ صرف میرا جسم بلکہ میری روح بھی۔ میری والدہ اس کمرے میں میرے ساتھ تھیں۔ وہ بے ہوش تھیں یا ایسا ظاہر کر رہی تھیں۔ انہوں نے مجھے دیکھ کر منہ موڑ لیا تھا۔ میں نے کسی کے رونے کی آواز سنی۔ یہ میرا بھائی تھا، اس نے مجھے کسی چیز سے ڈھانپ دیا۔ مجھے واضح طور پر یاد نہیں ہے کہ یہ کیا تھا، میں نے ابھی تک اس سے نہیں پوچھا، ہم نے اس رات کے بارے میں پھر کبھی بات نہیں کی۔لیکن مجھے یاد ہے کہ میں اپنے نچلے جسم کو محسوس نہیں کر سکتی تھی۔

وہ ایک رات میری زندگی بن گئی۔اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں کیا کرتی ہوں، کہاں جاتی ہوں یا کیا سوچتی ہوں، اس رات کی یاد مجھے کبھی نہیں چھوڑتی۔ یہ ہر وقت میرے ساتھ ہوتی ہے، جب میں نماز پڑھتی ہوں، جب میں کھانا پکاتی ہوں، جب میں خود کو صاف کرتی ہوں۔ میں ہر وقت ان (فوجیوں) پر لعنت کرتی ہوں اور زندگی بھر ان پر لعنت کرتی رہوں گی۔لوگ مجھے تسلی دیتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ تمہیں بھول جانا چاہئے اور آگے کی طرف دیکھنا چاہئے لیکن یہ کہنا آسان مگر کرنا کہیں زیادہ مشکل ہے۔ یہ اپنی آنکھیں کھونے اور یہ یقین کرنے کی طرح ہے کہ آپ کے پاس وہ کبھی نہیں تھیں۔

میں نے پولیس کو کوئی بیان نہیں دیا۔ میرے گھر والوں کو ڈر تھا کہ کوئی مجھ سے شادی نہیں کرے گا۔ میں نے شادی نہیں کی، ایسا نہیں ہے کہ میں یہ نہیں چاہتی تھی مگر میری صحت مجھے اجازت نہیں دیتی ہے۔ میں شادی کرنے کے لائق نہیں ہوں۔ میں کسی مرد کی زندگی برباد نہیں کرنا چاہتی، میں کسی خاندان پر سماجی بوجھ بننا نہیں چاہتی۔ پھر جب میں نے دیکھا کہ میرے گاؤں کی لڑکیوں کے ساتھ ان کے سسرال والے کیسا برتاؤ کر رہے ہیں، تو میں نے شادی نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ ہم نے اپنی دوست آمنہ کے ریپ کے بارے میں کبھی کسی سے بات نہیں کی۔اس رات کے بعد جب ہم ملے، تو ہم مسلسل روتے رہے۔ ہم اب بھی دوست ہیں لیکن ہمارے درمیان اس بات پر اتفاق ہے کہ اس رات کے بارے میں کبھی بات نہ کریں۔ نہ کسی سے نہ آپس میں یہ کیا بات ہے جو کی جائے۔ میں ''کنن اور پوش پورہ'' میں عصمت دری کے واقعے میں زندہ بچ جانے والی عورت ہوں— میں سانس ضرور لے رہی ہوں لیکن زندگی سے محروم ہوں۔ایک زندہ لاش جس میں سانسیں تو ہیں مگر روح نہیں۔

☆.....☆

کانسٹیبل عبدالغنی کی کہانی

ان واقعات کی پریس کونسل آف انڈیا کی تحقیقات مرتب کرنے والے بی جی ورگیس نے ہیڈ کانسٹیبل عبدالغنی ڈار پر بزدلی کا الزام لگایا کیوں کہ وہ فوجیوں کی درندگی کے دوران ان کے ساتھ تھا اور اگلے دن اس نے این اوسی پر دستخط کرتے ہوئے کہا کہ کسی کو نقصان نہیں پہنچا ہے۔ عبدالغنی ڈار اب اپنے اعمال کی وضاحت کرنے یا عین ان حالات کو بیان کرنے کے لئے زندہ نہیں ہے۔ بے شک اس نے این اوسی پر دستخط کئے اور سب صحیح ہے کہ سٹیفکیٹ بھی جاری کیا مگر وہ اس حکم کو بجالانے کے علاوہ کر بھی کیا سکتا تھا۔ وہ یہ کرتا یا اپنے اور اپنے خاندان کو ''کنن پوش پورہ'' کی طرح نشان عزت بناتا۔ مگر اس نے دوسرے روز صبح سویرے ہی ''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں کی مدد اور بحالی کے لیے کام شروع کر دیا تھا بغیر کسی سرکاری احکامات یا اپنی سرکاری ذمہ داری کے۔ اسے عورتوں کی مدد کرنے کے لئے 24 فروری کو صبح سویرے ہی وہاں جانا پڑا تھا، لیکن بیانات کا گہرائی سے مطالعہ کرنے سے یہ واضح ہو جاتا ہے کہ عبدالغنی سخت موسم اور خوف ناک حالات میں اپنے لوگوں کی غیر معمولی خدمت کر رہا تھا۔ اس نے خوف زدہ خاندانوں کو قریبی رشتہ داروں کے گھروں میں منتقل کیا، بچھڑے ہوئے خاندانوں کے ممبروں کے درمیان پیغامات پہنچائے، اور اگلی صبح پوچھ گچھ کے دروان سخت زخمی ہونے والے افراد کو اپنی پیٹھ پر اٹھا کر ان کے متعلقہ گھروں تک پہنچایا۔ ننگی عورتوں پر کمبل اور کپڑے ڈالتا رہا اور برف میں پڑے معصوم بچوں کو ان کے گودوں تک پہنچا کر گرم کپڑے ڈالے۔ عبدالغنی کو بھی اس رات فوج کی طرف سے تشدد کا سامنا کرنا پڑا کیونکہ وہ لوگوں کی مدد کرنے اور فوج کو روکنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب اس کی

مداخلت بہت زیادہ ہوگئی، تو اسے ایک گئوشالہ میں بند کر دیا گیا اور صبح وہاں سے رہائی ملی۔ کچھ خواتین کو یاد ہے کہ جب عبدالغنی اس رات یا اگلی صبح ان کے گھروں میں داخل ہوا تو اس نے ان کے جسموں کو ڈھانپنے کی کوشش کی، انہیں پینے کے لیے پانی دیا، اور جہاں بھی وہ چھپے ہوئے تھے وہاں سے ڈرے ہوئے بچوں کو ان کے گھر واپس لایا۔ برف میں پڑے ہوئے اس بچے کو بھی عبدالغنی ہی اٹھا کر صحن میں لایا تھا جس کو بھارتی فوجیوں نے ماں کے سینے سے چھین کر کھڑکی سے باہر برف میں پھینک دیا تھا۔

ریاستی ہیومن رائٹس کمیشن (ایس ایچ آر سی) نے بھی 5 اپریل 2011ء کے اپنے حکمنامے میں ہیڈ کانسٹیبل عبدالغنی کے غیر معمولی کام کی توثیق کی ہے۔ حکم نامہ کے صفحہ 7 پر لکھا ہے:

''گاؤں کا عبدالغنی نامی ایک پولیس اہلکار تھا جس نے مقامی مسجد کے لاؤڈ اسپیکر سے مدد کے لیے ایس او ایس الارم لگانے کی کوشش کی لیکن بعد میں (1993ء میں) وہ بھی فوجی اہلکاروں کے ہاتھوں مارا گیا تا کہ ان کے خلاف شواہد کو ختم کر دیا جائے''۔

عبدالغنی کی جانب سے پولیس کو دیے گئے بیان میں اس بات کا ذکر کیا گیا ہے کہ وہ محاصرے اور تلاشی کی کارروائی میں فوج کے ساتھ تھا، وہ بتاتا ہے کہ جب وہ رات 11 بجے گاؤں پہنچا تو مقامی افراد پہلے ہی اسکول کی عمارت میں جمع ہو چکے تھے۔ وہ خواتین کے چیخنے کی آوازیں سن سکتا تھا۔ لہٰذا اس نے جا کر چیک کرنے کا فیصلہ کیا، حالاں کہ اس کے لئے یہ آسان نہیں تھا کیوں کہ فوج کو پولیس اہلکاروں سمیت کسی کشمیری پر اعتماد نہیں تھا۔ فوج نے ان دونوں کانسٹیبلوں کو گاؤں کے اندر آزادانہ نقل و حرکت کے لئے پاس کے طور پر رنگین دستانے دیئے تھے۔ اس کے باوجود جب اس نے خواتین کی مدد کرنے کی کوشش کی تو اسے مارا پیٹا گیا دستانے واپس لے لیے گئے۔ وہ مختلف گھروں میں داخل ہوا اور ایک گھر میں عصمت دری کا شکار عورت کو برہنہ حالت میں پایا تو اسے کپڑے سے ڈھانپ دیا اور اس

کے گھر سے نکل گیا۔ اسی طرح کی حالت میں عورتوں کو اس نے ان تمام گھروں میں دیکھا جن میں وہ داخل ہوا تھا۔

وہ بتاتا ہے کہ یہ سب 'اس وقت ہوا جب پوچھ گچھ کے مرکز میں مردوں کو تشدد کا نشانہ بنایا جا رہا تھا'۔ تفتیشی مرکز میں ہونے والی سرگرمیوں کو چیک کرنے کے لیے، وہ اس طرف چل پڑا، اس کا کہنا ہے کہ: 'تفتیشی مرکز کے قریب، مجھے ایک میجر صاحب ملا، جس کا نام " کھلر " تھا، لمبا، مونچھوں والا اور چشمہ دار۔ ایک اور افسر بھی وہاں موجود تھا، جس کی وردی پر دو ستارے اور ایک اشوکا تھا۔ انہوں نے تفتیشی مرکز کے بارے میں کوئی تفصیل نہیں بتائی، جس سے یہ واضح تھا کہ انہیں اندر جانے کی اجازت نہیں تھی۔ کسی بھی پولیس افسر کو، چاہے وہ کسی بھی عہدے پر ہو، فوج کے حوالدار کے ماتحت سمجھا جاتا ہے اور اس کے ساتھ ویسا ہی سلوک کیا جاتا ہے۔ عبدالغنی کا بیانیہ ایسی ہی ایک مجبوری اور بے بسی کی مثال ہے۔ فوج کی موجودگی میں کسی فوج افسر کا ہوسکتا ہے۔ طبی معائنے کی دستاویزات میں یہ واضح طور پر ذکر کیا گیا ہے کہ جن خواتین کو فوری طبی امداد کی ضرورت تھی انہیں عبدالغنی کے ذریعہ 15 مارچ اور 21 مارچ 1991ء کو کرال پورہ کے پرائمری ہیلتھ سینٹر لے جایا گیا تھا۔

پولیس کو دیے گئے اپنے بیان میں عصمت دری کا نشانہ بننے والی عورتوں نے بتایا کہ اگلے دن انہیں فوج کے ایک ڈاکٹر نے درد کش ادویات جیسی ابتدائی امداد دی اور اس بات کی تصدیق ڈاکٹر نے اپنے بیان میں کی ہے۔ یہ فوج کی طرف سے ایک غیر معمولی عمل تھا، اور شاید اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ' کریک ڈاؤن ' کس قدر شدید تھا۔ چونکہ بظاہر انہوں نے اس جرم کی پہلے سے منصوبہ بندی کر رکھی تھی، لہذا ایسا لگتا ہے کہ طبی امداد خوف ناک زخموں کو چھپانے کیلئے اٹھایا گیا قدم تھا۔ کیپٹن ڈاکٹر شیام سندر کے پولیس بیان کے مطابق، جنہیں ایک سال پہلے 4 راجپوتانہ رائفلز میں تعینات کیا گیا تھا، اور اس آپریشن میں فوج کی مدد کی تھی، وہ گاؤں کے باہر کمانڈنگ آفیسر (سی او) کے ساتھ تھا اور کسی تلاشی یا پوچھ گچھ میں

شامل نہیں تھا۔

اس کے مطابق صبح مقامی لوگوں سے کہا گیا کہ وہ کسی بھی مریض کو وہاں لے آئیں۔ انہوں نے 30-40 افراد کا معائنہ کیا اور معمولی بیماریوں کی دوائیں دیں۔ صبح 9 بجے، سی او نے گاؤں والوں سے بات کی۔ کوئی شکایت نہیں ملی اور وہ چلے گئے۔ تاہم، وہ اس بات کی وضاحت نہیں کرتے کہ وہ کن سادہ بیماریوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔ اگر ہم وادی میں محاصرے اور تلاشی کی کارروائیوں کی تاریخ کا جائزہ لیں تو ہمیں کبھی بھی ایسا کوئی فوجی ڈاکٹر نہیں ملے گا جو علاقے سے محاصرہ ہٹائے جانے کے بعد عام شہریوں کو بخار، کھانسی، زکام یا سوجن وغیرہ کے سلسلے میں طبی امداد مہیا کر رہا ہو۔

وہ ایسا کیوں کرے گا؟ ''کریک ڈاؤن'' اور ان بیماریوں کا آپس میں کیا تعلق؟ ظاہر ہے اس کریک ڈاؤن کے نگراں افسر نے پہلے ہی ڈاکٹر اور درد کش ادویات کا بندوبست کر رکھا تھا، اس کو یہ معلوم تھا کہ رات کے اس کریک ڈاؤن کے دوران مجھے کیا کرنا ہے اور اس کے اثرات کیا ہوں گے۔ اس لئے ڈاکٹر کا انتظام پہلے ہی کر لیا گیا تھا جو جموں و کشمیر میں ملٹری کریک ڈاؤن کے دوران ڈاکٹر کی موجودگی کی پہلی مثال ہے۔ انچارج افسر کا یہ اقدام دراصل فوری طور پر شور کو روکنے کے لیے تھا کہ مریضوں کو درد میں افاقہ ہو گا تو گاؤں میں شور چیخ و پکار اور شور و غوغا نہیں ہو گا اور کچھ دن گزرنے کے بعد واقعہ پرانا ہونے کے بعد لوگ بھول جائیں گے کہ ''کنن پوش پورہ'' کے عوام کو ہندوستانی فوج نے کشمیری ہونے کی کیا سزا دی۔ آرمی ڈاکٹر کی درد کش ادویات نے ممکن ہے وقتی طور پر جسموں میں اٹھنے والی ٹیسوں کو مدہم کیا ہو لیکن اس واقعہ سے کشمیریوں کے دلوں میں لگنے والی ٹھیس کبھی مدہم نہیں ہو سکتی۔ جب کنن پوش پورہ کی یاد آئے گی تو یہ زخم تازہ ہو جائیں گے۔ یہ زخم اس زخم کی طرح ہیں جو وقتی طور پر مندمل ہو جاتا ہے لیکن ذرا سا بھی کریدنے سے خون بہنے لگتا ہے جبکہ ''کنن پوش پورہ'' کا زخم کریدنے کی بھی ضرورت نہیں، ہم ''کنن پوش پورہ'' کبھی

نہیں بھولیں گے۔کشمیر کب آزاد ہوتا ہے کیسے آزاد ہوتا ہے یہ ایک بحث ہے اور کشمیری خود اس پر متفق نہیں لیکن اس پر کشمیری متفق ہے کہ ”کنن پوش پورہ“ میں بھارتی فوج نے جو بھی کیا وہ کسی بھی لحاظ سے درست نہیں تھا۔ وہ ایسا واقعہ تھا کہ اس کو کوئی بھی کشمیری بھول نہیں سکتا۔ اور تاریخ کشمیر کا یہ سیاہ ترین باب ہے۔آزادی کی تاریخ سیکھنے والا مورخ یا منصف ”کنن پوش پورہ“ کو بھول کر آگے بڑھتا ہے تو وہ تاریخ مکمل نہیں۔آزادی کی تحریک میں ”کنن پوش پورہ“ کے مرد و زن، بچوں اور بھوڑوں کی لا زوال قربانیاں ہیں جو باعث شرمندگی نہیں بلکہ باعث فخر ہیں کہ اس آزادی کے لیے ہماری خواتین نے اعلیٰ چیز کی بھی قربانی دی اور وہ ہے عصمت۔

☆......☆

اگلے دن

گاؤں کے اندرونی علاقوں میں محاصرہ 24 فروری کی صبح 9 بجے اٹھالیا گیا تھا تاہم بیرونی محاصرہ جاری رہا۔ ایسا جان بوجھ کر کیا گیا تا کہ گاؤں والوں کو پڑوسی گاؤں سے کسی بھی طرح کی مدد حاصل کرنے سے روکا جا سکے یا رات کو ہونے والی خبر کو پھیلنے سے روکا جا سکے۔ یا رات کو ہونے والی خبر کو پھیلنے سے روکا جا سکے۔ گاؤں کے زیادہ تر مردوں کو صبح سویرے مختلف تفتیشی مراکز کے احاطے سے اسلامک اسکول کے کھیل کے میدان میں لے جایا گیا، اور ایک افسر نے ان سے بات کی اور ان سے گاؤں میں موجود کسی عسکریت پسند یا دیگر ہتھیاروں کی نشاندہی کرنے کے لیے کہا گیا۔ گویا آرمی افسر ابھی بھی مطمئن نہیں تھا یا وہ خوف وحراس پھیلانے کے لیے ایسا کر رہا تھا۔فوجی افسر یہاں یہ ظاہر کر رہا تھا کہ رات کو جو ہوا وہ کچھ بھی نہیں معمول کی کارروائی ہے جو بھارتی فوج آتنگ بادیوں کے خلاف کسی بھی وقت کر سکتی ہے۔ آتنگ بادی کے لیے کسی ثبوت کا ہونا ضروری نہیں۔ لوگوں نے جب کہا کہ ہمیں اس حوالے سے کوئی معلومات نہیں تو پھر فوجی افسر نے وارننگ دی کہ کسی بھی آتنگ بادی کو گھروں میں پناہ دینے اور اسلحہ رکھنے کی غلطی نہیں کرنا بلکہ آتنگ بادی نظر آئیں تو قریبی آرمی آفس میں اطلاع دیں۔

جن لوگوں کو سب سے زیادہ تشدد کا نشانہ بنایا گیا وہ اپنے بیانات کے مطابق کھیل کے میدان تک نہیں پہنچ سکے اور جہاں تھے وہیں رہے۔ سبھی مرد 24 فروری کی صبح 9 بجے اپنے گھروں کو لوٹ آئے۔ ان میں سے کچھ پر اس قدر ظلم کیا گیا کہ وہ رینگتے ہوئے گھر گئے۔

اس کے بعد فوج نے جیسا کہ طریقہ کار کے مطابق ضروری تھا، یونٹ کے ساتھ موجود دو کانسٹیبلوں کا دستخط شدہ این او سی حاصل کیا۔ دونوں کانسٹیبل رات بھر گاؤں والوں کی مدد کرتے

رہے تھے، لیکن جیسا کہ وہ اپنے پولیس بیانات میں کہتے ہیں، ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین کی رپورٹ میں، انہیں این او سی پر دستخط کرنے پر مجبور کیا گیا۔ اس پر دو دیہاتیوں نے بھی دستخط کیے تھے جنہیں شدید تشدد کا نشانہ نہیں بنایا گیا تھا۔ این او سی اس بات کی تصدیق کرتا ہے کہ 24 فروری 1991ء کو، ''کنن پوش پورہ'' گاؤں میں تلاشی کے دوران کسی بھی املاک، مکانات، افراد یا سامان کو کوئی نقصان نہیں پہنچا۔ کوئی جائیداد (بشمول پیسہ، قیمتی سامان وغیرہ) نہیں چھینی گئی تھی اور نہ ہی کسی خاتون کے ساتھ بدسلوکی کی گئی تھی۔

جب وہ اپنے گھروں کو لوٹے، تو مرد یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ ان کی خواتین خون آلود، برہنہ ہیں، حرکت کرنے سے قاصر ہیں اور بمشکل ہوش میں ہیں۔ گاؤں میں جنون والم کی کیفیت تھی، کیوں کہ انہیں آہستہ آہستہ اس رات کی ہولناکیوں کی شدت کا احساس ہوا۔ پورا گاؤں سوگ میں تھا۔ ان کے پاس صرف ان کی اپنی خون آلود لاشیں رہ گئی تھیں۔ کنن پوش پورہ کے لوگ اپنی دھندلی یادوں میں یاد کرتے ہیں کہ گاؤں کا چوکیدار جمعہ شیخ اگلے ہی دن 25 فروری کو متعلقہ تحصیلدار سکندر ملک سے ملنے گیا اور اسے اس واقعہ کے بارے میں بتایا تھا۔ تحصیلدار نے اس کی تصدیق کی۔ جمعہ شیخ اپنے ساتھ اردو میں لکھا ہوا ایک خط لے کر گیا جس پر خواتین سمیت تقریباً تیس دیہاتیوں کے دستخط اور انگوٹھے کے نشان تھے۔ تفصیلی اور رسمی زبان میں لکھے گئے اس خط میں تنازعہ کشمیر، عسکریت پسندی اور عام لوگوں پر مظالم کے بارے میں بات کی گئی ہے۔ اس میں لکھا ہے:

''ایک سال سے کشمیر یہاں تعینات فوجی دستوں کی وجہ سے مظالم کا شکار ہے اور یہی مظالم عسکریت پسندی کا سبب بنے ہوئے ہیں۔ حکومت اپنے ہی غریب اور 'مظلوم' بے سہارا لوگوں کی حفاظت کرنے میں ناکام رہی ہے اور وہ عام طور پر ظلم کا نشانہ بنتے ہیں''۔

23-24 فروری کی رات کے واقعات کے بارے میں، اس میں کہا گیا ہے: ''23-24 فروری 1991ء کو ہفتہ اور اتوار کی درمیانی شب 11 بجے فوج نے کنن گاؤں

کا محاصرہ کیا اور فوج کے جوان گاؤں میں عسکریت پسندوں کی تلاش کے لیے داخل ہوئے لیکن بکتر بند فوج نے عسکریت پسندوں کو تلاش کرنے کے بجائے مردوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا اور انہیں اپنے گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا گیا اور خواتین کو زبردستی گھروں کے اندر رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ فوجی جوانوں نے خواتین پر درندوں کی طرح حملہ کیا، ان کے کپڑے پھاڑ دیے گئے۔ بہت سی خواتین نے شور مچانے کی کوشش کی لیکن ان کا گلا گھونٹ کر ان کے منہ بند کر دیے گئے اور ان کے سینے پر بندوقیں تان لی گئیں اور فوجی جوانوں نے جو چاہا کیا''۔ یہ سب رات بھر جاری رہا۔ یہی الفاظ، 'درندوں کی طرح برتاؤ کرنا' اور خواتین کے درمیان کوئی فرق نہ کرنا، بعد میں ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین نے اپنی رپورٹ میں استعمال کیے تھے۔

خط میں کہا گیا ہے کہ اس کارروائی کا عسکریت پسندی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ 'انہوں نے ان گھروں میں کوئی فرق نہیں کیا جن کے خاندان کے مرد ارکان پاکستانی تربیت یافتہ عسکریت پسند تھے یا ایسے گھر جو عسکریت پسندوں سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ یہ 'عسکریت پسند' یا 'عسکریت پسند ہمدرد' کہلانے پر دہشت کی بے بس حالت کو ظاہر کرتا ہے۔ یہ خط 25 یا 26 فروری کو جمع نہیں کرایا گیا تھا، حالاں کہ اسے 25 فروری کو انتظامیہ کے حوالے کر دیا گیا تھا۔ یہ 4 مارچ 1991ء کو جمع کیا گیا تھا، خط داخل کرنے میں تاخیر اور اسے تحقیقات اور ریکارڈ کا حصہ بنانا خود ہی چھپانے کی کوشش کو ثابت کرتا ہے۔ اور اس کا مقصد یہ بھی ہے کہ تحقیقات میں یہ ثابت کیا جائے کہ اگر اس رات یہ واقعہ ہوا تھا تو مقامی افراد نے شکایات درج کرانے میں یا رپورٹ کرنے میں اتنی تاخیر کیوں کی، اس تاخیر سے یہ مطلب لیا جائے کہ گاؤں کے لوگ آتنک وادیوں کے دباؤ میں آکر فوج کو بدنام کرنے کے لیے یہ درخواست دے رہے ہیں جس کی منصوبہ بندی کریک ڈاؤن کے کئی دن بعد کی گئی۔

☆......☆

مزید تحقیقات

گاؤں والوں نے اپنی شکایات درج کرائیں حالانکہ سخت سردی کی وجہ سے یہ انتہائی مشکل تھا۔ کشمیر ڈویژن کے اس وقت کے ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کی جانب سے پیش کی گئی رپورٹ سے موسمی حالات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ تقریباً ایک ماہ بعد 18 مارچ 1991ء کو وہ لکھتے ہیں:

''کنن ترہ گام سے تقریباً 4 کلومیٹر دور واقع ہے۔ گاؤں جانے والی سڑک اب بھی برف سے ڈھکی ہوئی ہے اور گاڑی چلانے کے قابل نہیں ہے۔ لیکن قدرت کی بے رحمی کا موازنہ انسانوں سے نہیں کیا جا سکتا تھا۔ فوج کے محافظوں کا یہ دعویٰ بالکل غلط ہے کہ واقعہ دیر سے رپورٹ ہوا۔ اس واقعہ کی اطلاع اگلے ہی دن متعلقہ حکام کو دی گئی، جیسا کہ گاؤں والوں کے ذریعے لکھے گئے خط سے پتہ چلتا ہے، جس پر 30 دیہاتی مردوں اور عورتوں کے انگوٹھے کے نشانات تھے۔ یہ خط کپواڑہ کے چیف جوڈیشل مجسٹریٹ کے سامنے پیش کیا گیا کیس ڈائری میں دیکھا جا سکتا ہے۔ 25 فروری 1991ء کا خط پولیس اور ممکنہ طور پر تمام تحقیقاتی ٹیموں کو ان کی تحقیقات کے دوران فراہم کیا گیا تھا۔ لیکن ایسا لگتا ہے کہ انہوں نے اس اہم حقیقت کو چھپا لیا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ موسم کا بہانہ فوج اور اس کے محافظوں کی طرف سے استعمال کی جانے والی ایک اور ڈھال ہے۔ انہی موسمی حالات میں اور برف سے ڈھکی سڑکوں پر پورے ضلع کپواڑہ کے لوگ ڈپٹی کمشنر/ضلع مجسٹریٹ ایس ایم یاسین (سید محمد یاسین اندرابی) کے دفتر کے باہر جمع ہوئے اور اس بات کو یقینی بنایا کہ مارچ 1991ء کے اوائل میں ایف آئی آر درج کی گئی، جیسا کہ گاؤں والوں نے بتایا تھا''۔

ترہ گام کے مقامی لوگوں نے اس بات کی تصدیق کی ہے، جنہیں یاد ہے کہ اس وقت پورے ضلع میں غیر سرکاری کرفیو نافذ تھا۔ احتجاج اور بدامنی کا حوالہ ایس ایم یاسین نے اپنی رپورٹ میں بھی دیا تھا، وہ کہتے ہیں:۔

''یہ خبر پورے ضلع میں پھیلنا شروع ہو گئی ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ اس کا انتظامیہ پر منفی اثر پڑ سکتا ہے''۔

جب پولیس کو احساس ہوا کہ معاملے کو چھپانا مشکل ہوتا جا رہا ہے تو اس نے فوج سے رابطہ کیا۔ جیسا کہ کشمیر کے اس وقت کے ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ لکھتے ہیں۔

''جموں و کشمیر کے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے کور کمانڈر سے رابطہ کیا اور انہوں نے بریگیڈیئر ایچ کے شرما، کمانڈر 19 آر ٹی بی ڈی کو گاؤں کا دورہ کرنے اور رپورٹ کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ بریگیڈیئر نے 10 مارچ 1991ء کو گاؤں کا دورہ کیا۔ ان کی رپورٹ معاملے پر پردہ ڈالنے کے ارادے کو مزید ثابت کرتی ہے''۔

شریف الدین شیخ کا اردو میں لکھا گیا خط درج ہونے کے بعد بھی، یعنی 4 مارچ 1991ء کو ریکارڈ پر تسلیم کیے جانے کے بعد بھی ایف آئی آر درج نہیں کی گئی۔ ۴ سے ۷ مارچ کے درمیان، جب تک ضلع کے مختلف دیہات کے لوگوں نے ڈپٹی کمشنر/ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ ایس ایم یاسین کے دفتر کے باہر زبردست احتجاج نہیں کیا، تب تک کوئی قدم نہیں اٹھایا گیا۔ انتظامیہ کے خلاف ناراضگی اور غصے کی بگڑتی ہوئی صورتحال کی وجہ سے ہی انتظامیہ کو اس معاملے پر پردہ ڈالنا ناممکن لگ رہا تھا، جس کی وجہ سے حکام نے گاؤں کا دورہ کیا۔

ضلع مجسٹریٹ/ ڈپٹی کمشنر نے ترہ گام کے پولیس اسٹیشن سے ایک پولیس پارٹی کے ساتھ دورہ کیا۔ انہوں نے مختلف متاثرین کے بیانات قلم بند کیے۔ ان کے بقول انہوں نے 5 مارچ 1991ء کو گاؤں کا 'موقع پر' دورہ کیا اور 7 مارچ 1991ء کو اس وقت کے ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کو ایک خفیہ رپورٹ لکھی۔ وہ لکھتے ہیں کہ:

''انہیں اس واقعے کے بارے میں پتہ چلا اور انہوں نے جائے وقوعہ کا دورہ کیا۔ لوگ مشتعل تھے جس پر انہوں نے گاؤں والوں کے بیانات ریکارڈ کیے، جن میں وہ خواتین بھی شامل تھیں جن پر یہ مظالم ڈھائے گئے تھے۔ انہیں وہ کمرے دکھائے گئے جہاں خواتین کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی۔ پھٹے ہوئے کپڑے اور شراب کی خالی بوتلیں ان کے سامنے پیش کی گئیں۔فوج نے گاؤں والوں سے زبردستی این او سی لیا تھا۔ یہ خبر پورے ضلع میں پھیلنے لگی تھی، جس سے انتظامیہ کو مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا۔'' مجھے یہ سب کچھ بتاتے ہوئے شرم آتی ہے کہ کس طرح کے مظالم اور کس شدت کی زیادتی اس موقع پر میرے علم میں لائی گئی''۔

انہوں نے مزید تجویز دی کہ واقعے کے منفی اثرات کو روکنے کے لیے فوری اقدامات کیے جائیں اور مجرموں کو سزا دینے کے لیے اقدامات کیے جائیں۔اس خط کی بنیاد پر، جسے انہوں نے کپواڑہ کے سپرنٹنڈنٹ آف پولیس اور دیگر حکام کو بھیجا تھا، ایف آئی آر نمبر 10 / 1991ء جرم کے 13 دن بعد، ترہ گام پولیس اسٹیشن میں 8 مارچ 1991ء کو درج کی گئی تھی جس میں ڈپٹی کمشنر/ضلع مجسٹریٹ کے ذریعہ لکھے گئے خط کو شکایت کے طور پر لیا گیا تھا۔

8 مارچ 1991ء کو ایف آئی آر درج ہونے کے ساتھ ہی تحقیقات کا آغاز ہوا۔ شروعات سست اور کسی حد تک بدحال تھی۔تحقیقات شروع ہونے کے ایک دن بعد پولیس عہدیداروں نے گاؤں کا دورہ کیا اور مختلف اہم مقامات کی نشاندہی کرتے ہوئے اس جگہ کا خاکہ تیار کیا۔خواتین کے پھٹے ہوئے اور خون آلود کپڑے پولیس کے حوالے کر دیئے گئے۔ انہیں شراب کی خالی بوتلوں کے ساتھ ضبط شدہ شواہد میں شامل کیا گیا تھا۔

18 مارچ کو، گاؤں والے اکٹھے ہوئے اور پولیس نے ان کے بیانات درج کیے۔ بہت سے متاثرین نے بتایا کہ ان کے ساتھ کتنا بے رحمانہ برتاؤ کیا گیا اور کھلے کوٹھر میں کمزوری کے سبب ان کے لئے بولنا تک مشکل تھا۔تقریباً پورا گاؤں وہاں تھا، اور درحقیقت آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی مدد کرنے اور اپنی ہمدردی کا اظہار کرنے آئے

تھے۔عورتوں کو کھڑا کیا گیا اور ان کے ساتھ جو کچھ ہوا اس کی پوری کہانی سنی گئی حالاں کہ یہ ان کے لئے بہت مشکل تھا، پولیس کے بیانات ریکارڈ کرنے اور عصمت دری کے متاثرین کی رازداری سے متعلق قواعد اور ہدایات کو مکمل طور پر نظرانداز کر دیا گیا تھا۔اگرچہ بہت سی خواتین سب کے سامنے تفصیل بیان کرنے سے قاصر تھیں کہ ان کے ساتھ کیا ہوا تھا، لیکن پھر بھی بہت سارے مفید ثبوت ریکارڈ کیے گئے تھے جو واضح طور پر ثابت کرتے ہیں کہ اجتماعی جبری جنسی تشدد، دوسرے لفظوں میں گینگ ریپ، ان میں سے ہر ایک کے ساتھ ہوا تھا۔

مثال کے طور پر، اس واقعہ میں درندگی کا نشانہ بننے کے باوجود زندہ بچ جانے والی خاتون افق نے اگست 2013ء میں جے کے سی ایس ایس اور ایس جی کے پی کی ایک تحقیقی ٹیم کو بتایا کہ اس نے 1991ء میں پورے گاؤں اور 10-8 پولیس اہلکاروں کی موجودگی میں پولیس کو ایک بیان دیا تھا۔ یہ بیان غلام احمد ڈار کے گھر کے کوٹھر کے اوپر دیا گیا تھا۔ رائس اسٹور سبھی کے لئے کھلا ہوا تھا اور جب وہ گواہی دے رہی تھی تو گاؤں والے سن رہے تھے اور بات کر رہے تھے جس کی وجہ سے وہ بہت پریشان تھی۔اس نے تقریباً دس منٹ تک بات کی اور اسے یاد نہیں کہ اس نے اپنے بیان پر دستخط کیا تھا یا انگوٹھے کا نشان لگایا تھا، نہ ہی اسے یاد ہے کہ بیان کا آخری ورژن (جو انگریزی میں ریکارڈ کیا گیا تھا) تفصیلات کی تصدیق کے لیے اس کے سامنے ترجمہ کر کے یا پڑھ کر سنایا گیا تھا۔افق کی بیٹی تمنا، جو خود بھی اس المیے کی متاثرہ ہے اس نے بھی کسی اور وقت پر اپنا بیان دیا کیوں کہ اس نے حال ہی میں ایک بچے کو جنم دیا تھا اور وہ کھلی جگہ نہیں جا سکتی تھی لہٰذا اس کا بیان گھر پر لیا گیا۔ بیان ریکارڈ کیے جانے کے دوران ایک بار پھر پولیس کے ساتھ کئی دیگر لوگ بھی موجود تھے۔

اس واقعہ کی شکایت درج کرانے کیلئے گاؤں والوں کے لکھے گئے اصل خط کو ڈپٹی کمشنر/ضلع مجسٹریٹ کو سونپا گیا تھا جسے جانچ فائل کا حصہ بنایا گیا تھا۔ کپواڑہ کے ایس پی کو ابتدائی طور پر معاملے کی جانچ کے دوران فوج سے کسی بھی طرح کا تعاون نہیں ملا۔اس کے

بعد 125 فوجیوں کا ایک برائے نام رول فراہم کیا گیا جو سرکاری طور پر محاصرے اور تلاشی کی کارروائی میں تعینات تھے۔ 125 میں سے تقریباً 19 فوجی اہلکاروں کو بیان ریکارڈ کرنے کے لئے پیش کیا گیا تھا۔ گویا ایک کمپنی فوج جو اس رات کنن پوش پورہ میں کریک ڈاؤن میں موجود تھی جس میں 600 تا 900 فوجی اہلکار تھے، ان میں سے 125 افراد کے نام دیے گئے جن میں سے صرف 9 نے بیان ریکارڈ کرایا کہ اس رات ایسا کوئی واقعہ ہوا ہی نہیں جیسا کہ گاؤں والوں کے بیانات یا ابتدائی درخواست میں درج ہے۔ یہ دراصل حکومت بھارت کی پشت پناہی پر فوجیوں کی دیدہ دلیری تھی کہ جو جرم انہوں نے کیا اس کو وہ جرم ہی نہیں سمجھتے تھے اور ان کو یہ بھی نداز ہ تھا کہ انہوں نے وہ ہی کہا کہ جو ان سے کہا گیا۔ یعنی کے پالیسی کے مطابق لہٰذا ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں ہونا اس لیے مجرم بیان دینے کے لیے طلبی کے باوجود حاضر نہیں ہوتے اور جو آتے بھی انہوں کا انداز تکبرانا تھا اور انہوں نے اس طرح کے واقعہ سے انکار ہی کر دیا۔ اس سے قبل بریگیڈیئر نے علاقے کا دورہ کرنے کے بعد جو رپورٹ دی تھی اس میں بھی الٹا گاؤں والوں پر ہی جھوٹ بولنے کا الزام لگایا گیا تھا گویا ڈپٹی کمشنر کپواڑہ کی رپورٹ سمیت میڈیکل رپورٹ اور سینکڑوں دیہاتیوں نے بیان، گواہی، فوجی اہلکاروں کے نزدیک سب غلط اور جھوٹ تھی اور جو بھی بیانیہ فوج کا تھا وہی درست تھا۔ سب ہی مائنڈ سیٹ سرکار کا تھا جس میں جنسی تشدد جنگی ہتھیار اور فوجی پالیسی معلوم ہوتی ہے۔

☆.....☆

کنن پوش پورہ،
مصنف۔ بشیر سرور زوی

متاثرین/ زندہ بچ جانے والوں کا طبی معائنہ

اس واقعہ کی تحقیقات کے دوران سرکاری طور پر محفوظ کیے گئے تمام سامان اور بیانات کے علاوہ، پولیس فائل میں دستیاب سب سے اہم ثبوت متاثرین کی طبی جانچ کی رپورٹ ہے۔ 8 مارچ 1991ء کو ایف آئی آر درج کرنے کے بعد کانسٹیبل عبدالغنی نے کراپلورہ کے بی ایم او (بلاک میڈیکل آفیسر) ڈاکٹر محمد یعقوب مخدومی سے سرکاری خط کے ساتھ رابطہ کیا تھا۔ بی ایم او کراپلورہ نے ایک انٹرویو کے دوران بتایا:

''مجھے یاد ہے کہ پولیس میں سے کسی نے ایک سرکاری خط کے ساتھ مجھ سے رابطہ کیا۔ مجھے عبدالغنی نامی ایک کانسٹیبل یاد ہے، وہ کنن گاؤں کا رہنے والا تھا، جو ترہگام پولیس اسٹیشن میں تعینات تھا۔ چوں کہ انہوں نے تمام متعلقہ دستاویزات مہیا کی تھیں، میں نے فوری طور پر خود سمیت چار لوگوں کا ایک گروپ تشکیل دیا۔ اس گروپ میں ایک نرس جواہرہ نامی ساکن ترہ گام شامل تھی، جو کراپلورہ میں تعینات تھی، وہ ایک میڈیکل اسسٹنٹ اور فارماسسٹ تھی۔ ہم ایمبولینس میں گاؤں پہنچے۔ وہاں برف باری اور بارش دونوں ہوئی تھیں۔ طبی معائنہ دو ہفتے یا اس سے زیادہ کی تاخیر کے بعد کیا گیا تھا، حالاں کہ یہ 72 گھنٹوں کے اندر کرنا ہوتا ہے۔ گاؤں کا ماحول اداس و غمزدہ تھا۔ عورتیں خوفزدہ اور ذہنی طور پر پریشان تھیں۔ ہم گھر گھر علاج کرنے گئے۔ کچھ گھروں میں ہم نے عورتوں کا اجتماعی علاج کیا۔ میں نے انہیں سب سینٹر کپواڑہ سے ایک لیڈی ڈاکٹر لانے کے لئے کہا تھا لیکن وہ نہیں لا سکے چوں کہ کوئی لیڈی ڈاکٹر دستیاب نہیں تھی، اس لیے پی وی یعنی عورتوں کے مخصوص حصے کا معائنہ ایک نرس کے ذریعے کیا گیا''۔

کمشنر کشمیر وجاہت حبیب اللہ نے اپنی رپورٹ میں تاخیر اور متاثرین کی کہانی کی صداقت کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے میں اس کے کردار کا بھی ذکر کیا ہے۔ ان کا کہنا ہے کہ:۔

''ایک مقدمہ پہلے ہی درج کیا جا چکا ہے اور تفتیش شروع کر دی گئی ہے۔ طبی معائنے کے اصل حقیقت کو عیاں کرنے کا امکان نہیں ہے کیونکہ یہ واقعہ کے اتنے عرصے بعد ہوا ہے''۔

یہ واضح ہے کہ انتظامیہ کو اگلے ہی دن مطلع کر دیا گیا تھا۔ پھر تحقیقات شروع کرنے میں اتنا وقت کیوں لگا؟ اس نتیجے کو جھٹلانا مشکل ہے کہ حکام کے کہنے پر پردہ پوشی کی کوششیں کی جا رہی ہیں۔ ایف آئی آر درج کرنے میں جان بوجھ کر تاخیر کی وجہ سے طبی جانچ کرنے میں تاخیر ہوئی تاہم اجتماعی عصمت دری کا تشدد اور بربریت اس قدر خوفناک تھا کہ ڈاکٹروں کے خطوط زبردستی عصمت دری کا ثبوت فراہم کرتے ہیں۔ ڈاکٹر کے مطابق، 8 یا 9 مارچ 1991ء کو گاؤں میں ایک میڈیکل ٹیم کے ذریعہ خواتین کا طبی معائنہ کیا گیا تھا اور ریپ کے معاملوں میں قانون کے مطابق میڈیکولیگل سرٹیفکیٹ (ایم ایل سی) داخل کیے گئے تھے۔ 8-9 مارچ کے یہ ایم ایل سی، جن کا ڈاکٹر حوالہ دیتے ہیں، پولیس فائل کا حصہ نہیں ہیں۔ یہ اس نظریے کی تائید کرتا ہے کہ طبی دستاویزات کا ایک اور سابقہ سیٹ موجود تھا، جو یا تو تباہ کر دیا گیا تھا یا پولیس ریکارڈ میں کبھی درج نہیں کیا گیا تھا۔ تشدد کا نشانہ بننے والے مردوں کے معائنے کا میڈیکل ریکارڈ 10 مارچ 1991ء کا ہے، چوٹ کے سرٹیفکیٹ کی شکل میں۔ خواتین کے لئے اسی طرح کی دستاویزات کیوں تیار نہیں کی گئیں اور اگر وہ تھیں، تو اب کہاں ہیں؟ یہ ایسے سوالات ہیں کہ اس مقدمے کو خراب کرنے اور عدم تعاون کے حوالے سے حکومت کی نیت کو ظاہر کرتے ہیں اس صورت حال میں یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ حکومت اس کو دبانے یا خراب کرنا چاہتی ہے۔

☆......☆

پولیس ریکارڈ/ثبوت

اسٹیشن ہاؤس آفیسر (ایس ایچ او) کے ذریعے لکھے گئے خطوط اور بی ایم او کے جوابات کے ذریعے پولیس فائل ہمیں بتاتی ہے کہ 23 عورتوں سے دو الگ الگ گروپوں میں جانچ کی گئی۔ خطوط سے پتہ چلتا ہے کہ ہر عورت نے عصمت دری کی تصدیق کی تھی۔ 15 مارچ 1991ء کوترہ گام پولیس اسٹیشن کے ایس ایچ او کی طرف سے لکھے گئے ایک خط میں خواتین سے مندرجہ ذیل سوالات پوچھے گئے تھے: کیا متاثرہ خواتین کی عصمت دری کی گئی تھی یا نہیں؟ اگر ہاں، تو کتنے دن پہلے اور کیا مزاحمت کے کوئی نشان تھے؟ کیا پردہ بکارت پھٹا ہوا تھا یا برقرار تھا اور جنسی اعضاء کے آس پاس دیگر زخم یا نشانات تھے؟ ان تمام سوالوں کا جواب ہاں میں دیا گیا تھا۔

سب سے پہلے، ایک گروپ میں 13 خواتین کا معائنہ کیا گیا تھا۔ ان میں سے تین نابالغ تھیں اور ایک پولیو کا شکار۔ تمام خواتین نے عصمت دری کی تصدیق کی ہے۔ ان متاثرین کی عمریں 15 سے 70 سال کے درمیان تھیں۔ بی ایم او ڈاکٹر محمد یعقوب مخدومی کی جانب سے ایس ایچ او ترہ گام کو دیے گئے جواب میں کہا گیا ہے کہ تمام خواتین چاہے وہ شادی شدہ ہوں یا غیر شادی شدہ، ان کا کہنا ہے کہ 15 دن قبل متعدد افراد نے ان کی مرضی کے خلاف ان کے ساتھ متعدد بار ریپ کیا تھا۔ ان کے سینے اور اعضاء سمیت ان کے پورے جسم پر چوٹ کے نشان تھے۔ ایک عورت کے چہرے پر کاٹنے کے نشان تھے۔ دوسروں کے نچلے جسم، رانوں، پیٹ، کولہوں اور سینے پر کئی خراشیں اور چوٹیں تھیں۔

خواتین کے دوسرے گروپ کا اس واقعے کے 26 دن بعد 21 مارچ 1991ء

کومعائنہ کیا گیا۔اس معاملے میں بھی اسی طرح کی کہانیاں موجود ہیں۔اگرچہ طبی معائنے میں 15 سے 26 دن کی تاخیر ہوئی تھی،لیکن طبی شواہد سے واضح طور پر پتہ چلتا ہے کہ خواتین کے ساتھ پرتشدد عصمت دری کی گئی تھی۔چونکہ زخم شدید اور سنگین نوعیت کے تھے لہٰذا بہت سی خواتین کوطویل مدتی طبی پیچیدگیوں کا سامنا کرنا پڑا۔ان میں سے کئی کو ریپ سے ہونے والے نقصان کی وجہ سے اپنی بیضہ دانی اور بچہ دانی کو نکلوانا پڑا۔خواتین کو اب بھی اپنا علاج کروانا پڑتا ہے اور بڑے پیمانے پر طبی اخراجات برداشت کرنے پڑتے ہیں۔

مردوں کی طبی حالت بھی عورتوں سے بہتر نہیں تھی۔اگر ریپ کے بعد بھی خواتین کا خون بہنا جاری رہا تو مردوں کے لیے کھڑے ہونا ناممکن تھا۔ جے کے سی سی ایس اور ایس جی کے پی کو دیے گئے ان کے بیانات کے مطابق، کچھ لوگوں کو اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں تقریباً 20 دن لگے۔ بی ایم او کراپورہ کے ذریعے جانچ کیے گئے ایک زندہ بچ جانے والے شخص کے ایم ایل سی میں کہا گیا ہے کہ 15 دن پہلے اس کے عضو کو کاٹے جانے کی وجہ سے زخم کا نشان تھا۔اس کے خیال میں یہ چوٹ ' کرنٹ کے گزرنے کی وجہ سے ہونے والی شدید نوعیت کی ہے اور مندمل ہو رہی ہے۔اس سے مردوں پر جنسی تشدد کی تصدیق ہوتی ہے، جیسا کہ تشدد سے بچ جانے والوں کی طرف سے بتایا گیا، یہاں تک کہ بچوں کو بھی تشدد سے نہیں بخشا گیا۔طبی شواہد سے اس بات کی تصدیق ہوتی ہے کہ نوزائیدہ بچے کے بازو میں فریکچر ہوا ہے جو 'فوجیوں کی جانب سے بدسلوکی' کی وجہ سے ہوا تھا۔زندہ بچ جانے والوں کے مطابق بعض بچوں کو بوٹوں تلے کچل دیا گیا اور کچھ کو کھڑکی سے باہر پھینک دیا گیا۔

☆......☆

ملزمان کے ساتھ کیا ہوا؟

یہ تمام پولیس ثبوت جن میں بیانات، ضبط شدہ کپڑے، شراب کی بوتلیں، طبی ثبوت، اس رات کریک ڈاؤن کی فوج کی تصدیق وغیرہ شامل ہیں، ملزمان کے خلاف فوجداری مقدمہ چلانے کے لئے کافی ہیں، یہاں تک کہ انفرادی عصمت دری کرنے والوں کی مثبت شناخت کے بغیر بھی (جس کے لئے فوج کی طرف سے کبھی موقع فراہم نہیں کیا گیا تھا) کوتاہی اور عدم تعاون فوج کی طرف سے تھا نہ کہ متاثرین کی طرف سے۔ایف آئی آر درج کرنے میں جان بوجھ کر تاخیر اور معاملے کو چھپانے کی کوششوں کی وجہ سے،طبی جانچ، جو عصمت دری کی کسی بھی جانچ کا ایک اہم حصہ ہے، وقت پر نہیں کیا گیا تھا۔سیمین اور دیگر جسمانی شواہد کی بازیابی کے لئے 72 گھنٹوں کے اندر طبی معائنہ کیا جانا چاہئے،اسی طرح فوجیوں کے خون یا پیشاب کے نمونے لے کران کا معائنہ کیا جانا تھا اور ان کے جسم پر زخم کے نشان دیکھے جاتے جو مزاحمت کے دوران خراشیں لگنے سے آ سکتے تھے، یہ معلوم کیا جانا تھا کہ آیا انہوں نے شراب پی تھی مگر یہ کبھی نہیں کیا گیا۔کیوں کہ فوجیوں کے پیشاب اور خون کے نمونے حاصل کئے گئے نہ ہی اس کی اجازت تھی۔

تفتیشی افسران کے بار بار تبادلوں کی وجہ سے اس معاملے کی تحقیقات کو مزید غلط طریقے سے ہینڈل کیا گیا،جس کی وجہ سے تحقیقات کو بہت نقصان پہنچا اور تاخیر ہوئی۔ابتدائی تفتیش ہیڈ کانسٹیبل لال میر نے کی۔ بعدازاں جب خواتین کے پہلے گروپ کو طبی معائنے کے لیے بھیجا گیا تو کیس اے ایس آئی فاروق شاہ کے حوالے کر دیا گیا۔ فاروق شاہ نے تحقیقات کے حصے کے طور پر متاثرین کا معائنہ کیا اور رپورٹ تیار کی۔اپنی تحقیقات کے آخری مرحلے میں انہوں نے فوج اور اپنے اعلیٰ حکام کو خط لکھ کر سی او کا تعاون مانگا۔انہوں نے

کمانڈنٹ اور ایڈ جوٹنٹ آر کلر کی سربراہی میں 4 راجپوتانہ رائفلز، 68 ماؤنٹین بریگیڈ کو نامزد کیا۔ ایف آئی آر میں ملزم کے طور پر متاثرین کے سامنے ملزمان کی شناختی پریڈ کا مطالبہ کیا۔

اس اہم مرحلے پر، ہیڈ کوارٹر کے اے ایس پی دل باغ سنگھ نے کپواڑہ کے چیف جوڈیشل مجسٹریٹ کے 18 جون 2014 ء کے فیصلے کے مطابق متاثرین کے بیانات ریکارڈ کرنا شروع کیے۔ اس کے فوری بعد ڈائریکٹر جنرل آف پولیس نے دل باغ سنگھ کی سربراہی میں ایک نئی اسپیشل انویسٹی گیشن ٹیم (ایس آئی ٹی) تشکیل دی جس میں سی پی او محمد شفیع اور سب انسپکٹر بشیر احمد ڈار شامل تھے۔ اس دوران ایس آئی ٹی کو آپریشن میں شریک یونٹ کے اراکین کے ناموں کی ایک فہرست ملی جس میں 125 فوجی اہلکاروں کے نام شامل تھے۔ ایس آئی ٹی نے کچھ فوجی جوانوں کے بیانات قلم بند کیے۔ فوج کے مطابق بقیہ افراد کا تبادلہ کر دیا گیا ہے۔ ایس ایس پی کپواڑہ ایس پی مشرا نے تجویز دی کہ ان کے بیانات 12 جولائی 1991 ء کو ریکارڈ کیے جائیں، لیکن ایسا کبھی نہیں کیا گیا۔ ایس آئی ٹی نے یہ بھی الزام لگایا کہ متاثرین نے ان سے ملنے سے انکار کر دیا، لیکن انہوں نے متاثرین کے اپنے بیانات ریکارڈ نہ کرانے کی کوئی وجہ نہیں بتائی جبکہ وہ پہلے ہی تفصیلی بیانات دے چکے تھے اور طبی معائنے کے لئے رضامند ہو گئے تھے۔ یہ سب بتاتے ہوئے ایس آئی ٹی کے ذریعہ ڈائریکٹر آف پراسیکیوشن کو ایک خط بھیجا گیا تھا۔

عصمت دری کی اطلاع دینے اور اس کی تفتیش کرانے کے لئے گاؤں والوں کی جدوجہد کو ڈائریکٹر آف پراسیکیوشن کی طرف سے لکھے گئے ایک خط کے ذریعے زندہ دفن کر دیا گیا تھا جس میں انہوں نے متاثرین کے بیانات، میڈیکل ریکارڈ اور ضبط کئے گئے سامان کی رپورٹ سمیت تمام دستیاب ثبوتوں کو یکسر مسترد کر دیا تھا۔ ستمبر 1991 ء کے اپنے خط میں وہ لکھتے ہیں کہ 'یہ کیس مختلف نقائص کا شکار ہے اور خواتین کے بیانات دقیانوسی ہیں اور تضادات کا شکار ہیں۔ اس کے علاوہ، وہ حیران دکھائی دیتے ہیں کہ اس نوعیت کے

واقعے کو فوری طور پر رپورٹ نہیں کیا گیا اور پوچھتے ہیں کہ گاؤں والوں کی طرف سے 25/26 فروری 1991ء کو لکھا گیا خط صرف 4 مارچ 1991ء کو ہی کیوں دائر کیا گیا تھا۔

ان بنیادوں پر ڈائریکٹر پراسیکیوشن نے دعویٰ کیا، 'یہ معاملہ عدالت میں پیش کرنے کے لائق نہیں ہے۔ 10 ثبوتوں کا مطالعہ کرنے میں اس کی محنت اور اسے دفن کرنے کے لئے اس کی لگن پر حیرت ہوتی ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ وہ اس حقیقت کا فائدہ اٹھاتے نظر آتے ہیں، جیسا کہ متاثرین نے اپنے بیانات میں بیان کیا ہے، کہ انہیں اندھیرے میں فوجی اہلکاروں نے ریپ کیا تھا اور اس وجہ سے وہ حتمی طور پر ان کی شناخت نہیں کر سکے۔ ایسا لگتا ہے کہ اندھیرا ہونے کے باوجود خواتین سے فوجیوں کی شناخت کرنے کی توقع کر کے وہ عام فہم سے مکمل طور پر محروم ہو گئے ہیں، اس بات کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے کہ ملزمان فوجی وردی میں ملبوس تھے اور انفرادی طور پر شناخت نہیں کیے جا سکتے تھے۔ جب کسی خاتون کو تین مرد پکڑ کر پانچ لوگ ریپ کا نشانہ بناتے ہیں تو ڈائریکٹر پراسیکیوشن یہ بھی چاہتے ہیں کہ وہ ان کے چہروں کو دیکھنے اور ان کی شناخت کرنے کے لیے اپنی آنکھیں کھلی رکھے۔ وہ اس حقیقت کو مکمل طور پر نظر انداز کر دیتے ہیں کہ بہت سے مرد گواہ کچھ افسران اور دیگر کی شناخت کرنے کی پوزیشن میں تھے، جن میں پولیس کانسٹیبل عبدالغنی بھی شامل تھا، جنہوں نے خاص طور پر مخصوص مقامات پر کچھ فوجی جوانوں کے عہدوں کا ذکر کیا تھا۔ ملزمان پر فرد جرم عائد کرنے کے لئے کافی سے زیادہ ثبوت موجود تھے۔ ایس ایچ آر سی نے اس خط کو تنقید کا نشانہ بنایا جس میں ڈائریکٹر پراسیکیوشن کی رائے شامل تھی، اور تحقیقات کو 'روکنے' میں ان کے کردار پر ان کے خلاف مقدمہ چلانے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔

پولیس نے اکتوبر 1991ء میں اختتامی رپورٹ (کیس بند کرنے کے لیے حتمی رپورٹ) تیار کرنے میں ڈائریکٹر آف پراسیکیوشن کے خط پر بھروسہ کیا، اور اپنی فائل میں

کیس کو 'غیر سراغ شدہ' قرار دے کر بند کر دیا۔عوام کو بھی یہ یقین دلایا گیا کہ یہ کیس سرکاری طور پر بند کر دیا گیا ہے۔ ایس ایچ آر سی کو بھی پولیس نے گمراہ کیا اور کہا، 'اس معاملے میں کلوزر رپورٹ 1991 ء میں درج کی گئی تھی لیکن حقیقت یہ ہے کہ 3 مارچ 2013ء تک تفتیش کو باضابطہ طور پر بند کرنے سے پہلے قانون کے مطابق مجسٹریٹ کے سامنے اختتامی رپورٹ کو کبھی پیش نہیں کیا گیا تھا۔اور یہ کیا بھی گیا تو بہت دیر بعد 3 مارچ 2013ءکو۔

آخر انھوں نے سرکاری طور پر کیس بند کرنے کی زحمت ہی کیوں اٹھائی؟ اس دوران، ایک پی آئی ایل تیار کی جا رہی تھی اور سرینگر میں مقیم نوجوان خواتین کے ایک گروپ نے 2 اپریل 2014ءکو دائر کی تھی جس کے ذریعے ہائی کورٹ سے کیس کی جانچ دوبارہ شروع کرنے کا مطالبہ کیا۔اس پی آئی ایل کے ذریعے ہی یہ انکشاف ہوا تھا کہ اس واقعہ کے 22 سال بعد 3 مارچ 2013ءکو پراسرار طور پر ایک کلوزر رپورٹ دائر کی گئی تھی، شاید یہ اس وقت ہوا جب ریاست کو اپنے نگرانی کے طریقہ کار کے ذریعے پتہ چلا کہ پی آئی ایل دائر کرنے کے لئے تیاری کی جا رہی ہے اور اس سلسلے میں دستاویزات جمع کی جا رہی ہیں۔دلچسپ بات یہ ہے کہ اس کیس میں قانونی طور پر کچھ بھی غائب نہیں تھا۔ملزم فوجی اہلکاروں کے خلاف مقدمہ چلانے کے لئے ہر ثبوت دستیاب تھا۔جس چیز کی کمی تھی وہ حکام کی طرف سے مجرموں کو ان کے جرم کے لئے جوابدہ بنانے کا عزم تھا چوں کہ حکام کی یہ نیت ہی نہیں تھی اور جو بھی واقعہ ہوا تھا وہ اعلیٰ حکام کی رضامندی اور اجازت سے ریاستی جنگی پالیسی کے تحت ہوا تھا تو پھر مجرم فوجیوں کو احتساب کے کٹہرے میں کیسے کھڑا کیا جا سکتا تھا؟

اس لیے ''کنن پوش پورہ'' کے مظلوم خواتین وحضرات پر ظلم ڈھانے والے یہ بھارتی فوج کے درندے کبھی بھی انصاف کے کٹہرے میں نہیں لائے جا سکے لیکن سری نگر کی پانچ بہادر خواتین نے وہ ہمت ضرور کی جو آل پارٹیز حریت کانفرنس آزاد کشمیر حکومت اور

پاکستان کی ریاست بھی ان مظلوموں کے لیے نہیں کر سکی۔مقبوضہ کشمیر میں اس طرح کے ہونے والے مظالم بین الاقوامی عدالت انصاف میں چلائے جاتے تو بھارتی فوج کو تھوڑا بہت خوف ضرور ہوتا مگر ایسا بھی نہیں ہوا۔

یہ ''کنن پوش پورہ'' اور اس کے متاثرین کی کہانی ہے۔اب آپ کو پتہ چل گیا ہوگا کہ لوگ صرف 1991ء کی اس رات کے بارے میں جاننے کے لئے اس جگہ کا دورہ کیوں کرتے ہیں۔اس رات کے حقائق بہت طویل عرصے تک دفن رہے جس کے نتیجے میں لوگوں کے ایک گروہ کے خلاف ایک منصوبہ بند کارروائی کو 'عسکریت پسند سازش' کے بارے میں ایک عمدہ تیار کردہ افسانے میں تبدیل کر دیا گیا۔

☆......☆

چھٹا حصہ

''کنن پوش پورہ'' میں بعد کی زندگی

متاثرین اوران کے بچوں کے نام اورتمام شناختی معلومات کوان کی حفاظت اور راز داری کے پیش نظر تبدیل کر دیا گیا ہے۔اس تحریر میں جوبھی نام ہیں وہ فرضی ہیں تاہم واقعات سچے اورحقیقت پرمبنی ہیں جواس علاقے کا دورہ کرنے والی سری نگر کی ایک خاتون نے تحریر کیےاورمیڈیا رپورٹ اورتحریر کی صورت میں ہمارے پاس پہنچے۔

جڑواں گاؤں کا دورہ :

میں ثمرینہ ہوں، میں مئی 2013ء میں پہلی بار''کنن پوش پورہ'' گئی،ہم سری نگر کی پانچ خواتین اس سے پہلے ہی ہائی کورٹ میں مفاد عامہ کی عرضی (پی آئی ایل) دائرکر چکی تھیں،اور میں گاؤں والوں سے ملنا چاہتی تھی اور دیکھنا چاہتی تھی کہ وہ اس بارے میں کیسا محسوس کرتے ہیں۔تب سے،جسٹس فار کنن پوش پورہ معاونتی گروپ (ایس جی کے پی) کے ایک اہم رکن اور پی آئی ایل کی درخواست گزاروں میں سے ایک کےطور پر، میں ''کنن پوش پورہ'' معاملے سے قریبی طور پر جڑی رہی ہوں اور سری نگر اور کپواڑہ کی عدالتوں میں تقریباہر سماعت میں موجودرہی ہوں۔

پچھلے ایک سال کے دوران، میں کئی بار گاؤں کا دورہ کرچکی ہوں اور گاؤں کے بزرگوں،نوجوانوں اورعصمت دری کے متاثرین کےساتھ ان کےگھروں میں اور کپواڑہ کی عدالت میں سماعت کے وقت غیررسمی بات چیت اور ملاقاتیں کی ہیں۔ میں نے ان میں

سے بہت سے لوگوں کے ساتھ اچھے، اعتماد پرمبنی تعلقات استوار کیے ہیں اوران کی روزمرہ کی زندگی اور 1991ء کے بعد سے ان کے مصائب کے بارے میں بہت کچھ جانا ہے ،میں نے کئی فیلڈ دورے بھی کیے جہاں میں نے ان کے ساتھ کم آرام دہ انداز میں انٹرویو طرز پر بات چیت کی، میں نے یہ سمجھنا شروع کیا کہ'' کنن پوش پورہ'' کی خواتین اپنی عصمت دری پر بات کرنا اوراپنے صدمے کو دوبارہ یاد کرنا پسند نہیں کرتی ہیں، خاص طور پر اس لیے کہ وہ خود کو میڈیا تنظیموں اور دیگر لوگوں کی طرف سے 'استعمال' کرنا محسوس کرتی ہیں،ان کا کہنا ہے کہ،"ہمیں بار بار ایک ہی کہانی سنانے پر مجبور کیا جاتا ہے،اس سے شہرت اور پیسہ کمایا جاتا ہے جبکہ ہمیں آج تک انصاف نہیں ملا۔ ہمارے پاس بدنامی کے سوا کچھ نہیں ہے۔ میں نے ان سے اس بدقسمت رات کے واقعات کے بارے میں براہ راست سوال نہیں کیا،لیکن اکثر، خاص طور پر جب آس پاس کوئی مرد نہیں ہوتا تھا،تو وہ مجھ سے اپنی عصمت دری کے بارے میں بہت کھل کر بات کرتی تھیں۔

اس بات چیت کے دوران، میں نے سیکھا کہ کس طرح خوف کی ایک رات لوگوں کی زندگیوں پر اتنا گہرا اثر ڈال سکتی ہے۔''کنن پوش پورہ'' کےلوگوں کے لیے،اور درحقیقت اگلی نسلوں کے لیے،اس کے مضمرات نہ صرف سماجی بلکہ معاشی ،سیاسی اور جسمانی بھی رہے ہیں۔

کشمیر کے زندہ شہید

اجتماعی عصمت دری نے خاص طور پر نو جوان لڑکیوں اور لڑکوں کی تعلیم پر تباہ کن اثر ڈالا ہے جو اس وقت بچے تھے، تعلیم حاصل کرنا ان کے لئے ایک مہنگا معاملہ بن گیا ہے کیونکہ اس کے لئے انہیں اکثر دوسرے شہروں کا سفر کرنا پڑتا ہے تا کہ انہیں پہچانا نہ جائے اس لئے کہ ان کے اپنے علاقوں میں ہر کوئی انہیں جانتا ہے۔ طالب علموں، خاص طور پر ان خاندانوں کے بچوں کے ساتھ دشمنی عروج پر تھی جہاں خواتین کی عصمت دری کی گئی تھی، اور چھیڑ چھاڑ، طعنوں، غنڈہ گردی اور ذلت روز کا معمول تھا۔ غیر دوستانہ تعلیمی ماحول نے بہت سے بچوں کو اسکول چھوڑنے پر مجبور کیا، اس طرح ''کنن پوش پورہ'' کا مستقبل مجموعی طور پر خطرے میں پڑ گیا جس پر پرانی نسل کے بہت سے لوگوں نے افسوس کا اظہار کیا۔

''کنن پوش پورہ'' میں صرف آٹھویں جماعت تک کے اسکول ہیں اور جو بچے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا ارادہ رکھتے ہیں انہیں ترہ گام اور کپواڑہ جیسے قریبی ٹاؤن میں جانا پڑتا ہے، جہاں ہائی اسکول ہیں مگر ان ٹاؤن کی حالت اس سے بھی بدتر تھی، شاید اس لیے کہ بچے بڑے تھے، یا ایک ہی گاؤں سے نہیں تھے۔ ان اسکولوں میں ''کنن پوش پورہ'' کے بچوں کو مسلسل یاد دلایا جاتا تھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں سے آئے ہیں۔ بھلے ہی وہ خود اپنی تاریخ سے تعلق نہ رکھتے ہوں۔ ان کے ساتھ دشمنی انتہائی زیادہ تھی، اور ہر روز طالب علم شکایتوں کی بھرمار کے ساتھ اپنے گھروں کو واپس آتے تھے، اور یہاں تک کہ باہمی جھگڑے میں چوٹیں بھی لگا کرتی تھیں جس سے اسکول اور ان کی پڑھائی میں ان کی دلچسپی عام طور پر کم ہو جاتی اور گاؤں میں اپنی پڑھائی چھوڑنے والوں کی تعداد بڑھتی گئی، ان میں سے بہت سے تو کبھی ہائی اسکول گئے ہی نہیں۔

گاؤں کے دورے کے دوران، جب میں متاثرہ خواتین میں شامل روفیدہ اور چسفیدا کے ساتھ بات چیت میں مشغول تھی، گھر کے سامنے ایک اچھی طرح سے پینٹ کیے گئے بڑے کمرے میں، میں نے دو نوجوان لڑکیوں کو دیکھا، جن کی عمریں 17 سے 20 سال کے درمیان تھیں اور وہ ادھ کھلے دروازے سے اندر جھانکنے کی کوشش کر رہی تھیں۔ میں نے انہیں اندر آنے کے لیے کہا، اور پھر رفیدہ اور چسفیدہ نے بھی انہیں بلا لیا۔ لڑکیوں نے اپنا تعارف صائمہ اور عاطفہ کے طور پر کرایا اور ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں۔ انہوں نے دلچسپی سے ہماری گفتگو سنی۔ ہم جو کہہ رہے تھے اس پر وہ اتنی محتاط تھیں کہ ایسا لگ رہا تھا جیسے وہ یہ کہانیاں پہلی بار سن رہی ہوں۔ وہ ہماری ہر بات توجہ سے سننا چاہتی تھیں۔

ہم ان خواتین کے بارے میں بات کر رہے تھے جنہوں نے عصمت دری کے نتیجے میں بچہ دانی کی سرجری یا دیگر تولیدی سرجری کروائی تھی۔ چونکہ کچھ خواتین کو صحیح طبی طریقہ کار کا علم نہیں تھا، اور مجھے بھی اعضاء کے ناموں کے صحیح ترجمہ کے بارے میں یقین نہیں تھا اس لئے میں کچھ وضاحت کرنے کی کوشش کر رہی تھی کہ اچانک گفتگو کے درمیان میں صائمہ نے مداخلت کی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے اور وہ واضح طور پر غصے میں تھی۔ ''ہم نے اس کے بعد بہت تکلیف اٹھائی ہے''۔ ایک لمحے کے لیے سب کچھ رک گیا اور ایک عجیب سی خاموشی نے کمرے کو بھر دیا۔ میں خاموشی سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی، ایک لفظ بھی نہیں بولا جا رہا تھا یہاں تک کہ ہمدردی کا ایک لفظ بھی نہیں۔ اس نے بولنا شروع کر دیا اور اس غصے کا اظہار کر دیا جو اس کے دل میں کافی عرصے سے سلگ رہا تھا۔

اس نے کہا: ''میں گریجویٹ ہوں اور میں اپنی تعلیم جاری رکھنا چاہتی ہوں لیکن میں ہر ایک کے لئے بس ایک مذاق اور مضحکہ خیز چیز بن گئی ہوں۔ وہ کہتے ہیں کہ میرا تعلق ایک ریپ شدہ گاؤں سے ہے، جہاں لوگوں کو فوج سے پیسے ملتے ہیں۔ مجھے ہائی اسکول میں بھی طنز کا نشانہ بنایا جاتا تھا لیکن تعلیم حاصل کرنے کا میرا عزم اتنا مضبوط تھا کہ میں نے

ان حالات سے سمجھوتہ کرنے کا عزم کیا اور تمام طعنوں اور الزامات کو قبول کرنے پر مجبور ہوگئی۔کئی دہائیاں گزر جانے کے بعد بھی ہمارے لئے کوئی راحت نہیں ہے۔حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں۔لوگ اب کہتے ہیں کہ ہمارے گاؤں کی ریپ شدہ خواتین کی تصاویر انٹرنیٹ پر آسانی سے دیکھی جاسکتی ہیں۔

اپنے بچپن کے تجربات کو یاد کرتے ہوئے اس نے کہا: ''جب میں آٹھ سال کی تھی، تو میں اپنے گاؤں کے باہر ایک قریبی ندی میں تیراکی کے لیے جاتی تھی۔ایک دن، جب میں ندی کے قریب پہنچی تو پڑوس کے گاؤں کی کچھ عورتوں نے مجھ پر طنز کیا اور مجھے فوج کا ناجائز بچہ کہا۔انہوں نے ہمارے پورے گاؤں کے ساتھ بدسلوکی کی۔میں بہت ناراض تھی، مجھے سمجھ میں نہیں آیا کہ ان کا کیا مطلب ہے، لیکن میں نے رونا شروع کر دیا، جب میں گھر واپس آئی تو میں نے اپنی ماں سے پوچھا کہ وہ مجھے بتائیں کہ وہ مجھے کس بارے میں طعنہ دے رہی ہیں، یہ کون سی کہانی تھی جس کے بارے میں کہا گیا تھا کہ اس نے ہمارے گاؤں کو شرمندہ کیا ہے۔انہوں نے انتہائی تذبذب کے ساتھ، مجھے اس رات کی ہولناکیوں کے بارے میں بتایا کہ کس طرح 1991ء میں عورتوں کی عصمت دری کی گئی اور مردوں کو الگ کر کے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔میری بہن کی شادی قریبی گاؤں میں کسی سے ہوئی تھی، اس کے سسرال والوں نے اسے بہت پریشان اور ہراساں کیا اور اسے ریپ شدہ گاؤں کی بیٹی کہا''۔

میں بہت متذبذب تھی اور سوچ رہی تھی اسے کس طرح باور کراؤں کہ کم از کم میں اس نکتہ نظر سے اتفاق نہیں کرتی۔چناں چہ میں نے کسی طرح کچھ ناکافی الفاظ جمع کیے اور اسے بتایا کہ میں عصمت دری سے بچ جانے والوں کا احترام کرتی ہوں جو کشمیر کے زندہ شہید ہیں۔دریں اثنا سبز آنکھوں والی گلابی رنگ کے فران میں ملبوس خوب صورت لڑکی عاطفہ بھی سر کو گلابی اسکارف سے ڈھانپتے ہوئے بولنے لگی۔

اس نے کہا: ''میں نے قریبی گاؤں کے ایک پرائیویٹ اسکول سن شائن اسکول

میں تعلیم حاصل کی ہے۔میں نے اپنی ہم جماعت لڑکیوں کی طرف سے مجھ پر ہونے والی تمام بدسلوکی کو برداشت کیا لیکن آخر کار 10 ویں کلاس تک پہنچنے تک میں نے صبر کھو دیا۔میں نے اپنی اسکول کی تعلیم چھوڑنے کا فیصلہ کیا، ان کے طنز ہر وقت میرے کانوں میں گونجتے تھے اور اسکول جانا ایک خوفناک بات تھی۔سیما اور میں اچھے دوست تھے۔ہم سب کچھ شیئر کرتے تھے۔ہم ایک ساتھ دوپہر کا کھانا کھاتے تھے اور ایک دوسرے کو اپنے نوٹس دیتے تھے۔ایک دن، ہم کچھ نوٹس کے بارے میں ایک معمولی معاملے پر بحث کر رہے تھے کہ اچانک اس نے غصے میں آ کر مجھے ایک ریپ شدہ گاؤں کی بیٹی کہا اور زور زور سے چیخی کہ میری ماں کو فوج نے ریپ کیا ہے۔کہ وہ ہندوستانیوں کے ساتھ سوئی تھی۔اس کے بعد میں نے اس اسکول میں نہ جانے کا مکمل ارادہ کر لیا۔

کچھ سال بعد، میں نے ایک پرائیویٹ امیدوار کے طور پر میٹرک میں کوالیفائی کرنے کے لئے خود کو آمادہ کیا، اب میں گیارہویں جماعت میں پڑھ رہی ہوں لیکن ایسا لگتا ہے کہ میں اپنی پڑھائی جاری نہیں رکھ سکتی۔لوگ ہمارا احترام نہیں کرتے۔ہمیں اچھوت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔دوسرے گاؤں کے لوگ ہمیں اپنے ساتھ بیٹھنے یا قریب آنے کی بھی اجازت نہیں دیتے۔یہ صرف اسکولوں یا کالجوں تک محدود نہیں ہے، ہمیں ہر جگہ لوگ نیچا دیکھتے ہیں اور جہاں بھی کوئی مسئلہ ہوتا ہے، لوگ ہماری تذلیل کرتے ہیں۔وہ ہمیں بتاتے ہیں، تمہاری ماؤں اور بہنوں کی عصمت دری کی گئی ہے''۔

یہاں، رفیدہ نے اپنی کہانی وہیں سے شروع کی اور ہمیں بتایا کہ اس کے بیٹے ضمیر نے بھی نویں کلاس میں اسکول چھوڑ دیا تھا، کیوں کہ وہ روزانہ کی ذلت برداشت نہیں کر سکتا تھا۔جڑواں گاؤں کے ہر طالب علم کے پاس اس طرح کی کہانیاں ہیں۔

گاؤں کے نوجوان لڑکوں میں سے ایک معظم، جسے میں اچھی طرح جانتی ہوں اس لئے کہ وہ اب فعال طور پر عدالتی کارروائی پر نظر رکھے ہوئے ہے، ان ہولناکیوں کے

بارے میں بات کرنے سے ہچکچا رہا تھا جن سے وہ گزر رہا ہے۔ وہ ''کنن پوش پورہ'' سپورٹ گروپ فار جسٹس کو اچھی طرح سمجھتا ہے۔ اس نے ہمیں جو بتایا وہ اس طرح ہے:

''میں اس وقت (1991ء میں) صرف تین سال کا تھا۔ مجھے اندازہ نہیں تھا کہ ہمارے گاؤں میں کیا ہوا تھا۔ کپواڑہ کے اسکول میں میرے دوستوں اور اساتذہ کے ذریعہ ہی مجھے اس واقعہ کے بارے میں پتہ چلا۔ ایک بچہ ہونے کے باوجود، مجھے اکثر اساتذہ کی طرف سے اس واقعے پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے منتخب کیا جاتا تھا جس کے بارے میں مجھے کوئی علم نہیں تھا، ان کا مقصد صرف مجھے بے دخل کرنا اور ذلیل کرنا تھا۔ اس رویے نے مجھے بے چین کر دیا اور میرے لئے اسکول میں آگے بڑھنا مشکل بنا دیا۔ یہ میرے والدین کی مسلسل ترغیب تھی جس نے مجھے اپنی تعلیم جاری رکھنے کا حوصلہ دیا۔ پھر میں نے واقعات کے بارے میں پوچھنا شروع کیا۔ میں یہ سمجھنا چاہتا تھا کہ ہمارے گاؤں کے ساتھ ایسا کیا ہوا ہے۔ اب میں اجتماعی عصمت دری اور تشدد اور ہائی کورٹ اور کپواڑہ عدالت میں چل رہے معاملے سے بخوبی واقف ہوں۔ میں اس کیس کی باریک بینی سے پیروی کرتا ہوں اور دوسروں کو اس کے بارے میں بتاتا ہوں۔ میں چاہتا ہوں کہ انصاف ہو۔ میں چاہتا ہوں کہ مجرموں کے خلاف مقدمہ چلایا جائے۔

ایک اور نوجوان لڑکا ضمیر معمول کی ذلت کے خلاف اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا۔ ایک دن غصے اور مایوسی میں اس نے اپنی اسکول کی کتابیں جلا دیں۔ ضمیر نے بتایا کہ

''وہ نویں جماعت میں تھا جب اس کا اپنے ہم جماعت کے ساتھ سنگین جھگڑا ہو گیا کیونکہ 'میں اپنے ہم جماعتوں کی جانب سے مسلسل بدسلوکی کو برداشت نہیں کر سکتا تھا، جنہوں نے مجھے ذلیل کرنے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیا۔ میں نے اسکول چھوڑنے کا فیصلہ کیا اور اس دشمنی پر مبنی رویے سے جان چھڑانے کا فیصلہ کیا جس کا مجھے اسکول میں سامنا کرنا پڑتا تھا۔ میں نے اپنی کتابوں کو آگ لگا دی اور پھر کبھی اسکول نہیں گیا۔

ضمیر اب ایک مزدور کے طور پر کام کر رہا ہے اور اسے اپنی تعلیم جاری نہ رکھنے کا شدید افسوس ہے۔ اس کا ماننا ہے کہ اگر اسے مناسب تعلیم مل جاتی تو اس کے اور اس کی فیملی کے لیے حالات بہتر ہوتے۔

اجتماعی عصمت دری کے اس واقعہ نے کسی کو نہیں چھوڑا ہے۔ جڑواں گاؤں کی نوجوان اور غیر شادی شدہ خواتین کو زندگی بھر اس واقعے کا 'دھبہ' برداشت کرنا پڑتا ہے۔ شادی کرنا، جو عام طور پر گاؤں میں ایک آسان معاملہ ہوتا ہے، یہاں کی لڑکیوں کے لیے سب سے مشکل کام بن گیا ہے، کیوں کہ گاؤں کی لڑکیوں کے رشتے آنا بند ہو گئے ہیں۔ ایسا نہ صرف پچھلی نسل کی نوجوان خواتین کے ساتھ ہوا، جو عصمت دری سے بچ گئیں، بلکہ موجودہ نسل کے ساتھ بھی ہوا۔ انہیں مسلسل بے دخل کیا جاتا ہے اور انہیں 'ریپ شدہ خاندانوں کی لڑکیوں'، 'برے شگون'، 'شرم' کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس طرح کے گھٹیا تبصروں کا سامنا کرنا ان کی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ ایک بار جب لڑکیاں شادی کی عمر تک پہنچ جاتی ہیں، تو ان کے گھر والے انہیں بوجھ کے طور پر دیکھنا شروع کر دیتے ہیں اور ان کی حفاظت اور ان کے مستقبل کے بارے میں فکرمند ہوتے ہیں۔ ان میں سے زیادہ تر کو اس بات کا اندازہ ہی نہیں ہے کہ 1991ء کے موسم سرما میں ان کے گاؤں میں کیا ہوا تھا۔ جتنا کچھ بھی وہ جانتی ہیں، انہوں نے لوگوں کی باتیں سن کر سیکھا ہے۔ ان میں سے بہت سی تو 1991ء میں پیدا بھی نہیں ہوئی تھیں۔

یہاں تک کہ جن کی شادی ہو جاتی ہے وہ بھی بدنامی سے چھٹکارا حاصل نہیں کر سکتیں۔ ہر بحث میں، چاہے وہ چھوٹی ہو یا بڑی، 'ریپ شدہ خواتین' کے طور پر ان کی تاریخ کو سامنے لایا جاتا ہے۔ انہیں صرف شادی کے بعد باعزت مقام حاصل کرنے کے قابل ہونے کے لئے بڑے سمجھوتے کرنے پڑے ہیں۔ اس وجہ سے، زندہ بچ جانے والی بہت سی نوجوان لڑکیوں کی شادی ان سے کہیں زیادہ عمر کے مردوں سے کی گئی تھی۔ اپنے

شوہروں کے گھروں میں، انہیں اپنے سسرال والوں کی طرف سے ایک عجیب قسم کی دشمنی کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ وہ رات جس کا انہیں سامنا کرنا پڑا، اس نے نہ صرف ان کی اپنی زندگیوں پر بلکہ ان کی بیٹیوں کی زندگیوں پر بھی نحوست کے لمبے سائے ڈالے ہیں۔ وہ مجھے اکثر بتاتی تھیں کہ وہ کس طرح ان لوگوں کی نظروں میں گر چکی ہیں۔ کئی لڑکیوں نے شادی کرنے سے ہی توبہ کر لی ہے۔ وہ اپنی ذلت میں اضافہ نہیں کرنا چاہتیں یا ناخوش گوار سمجھوتے کرنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ کوئی بھی ان کی حمایت کرنے یا انہیں اپنا کر اور عزت دے کر مثال قائم کرنے والا وہاں موجود نہیں تھا۔

عصمت دری کا شکار ہونے والی 55 سالہ رفیدہ کی دو بیٹیاں ہیں، جن میں سے ایک 23 فروری کی رات بچپن میں گرنے کی وجہ سے معذور ہوگئی۔ اس کی دوسری بیٹی اور اس کے شوہر کو اس کے سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا تھا۔ اپنی کہانی سناتے ہوئے رفیدہ کے لیے اپنے آنسو روکنا مشکل تھا۔ اس کی گفتگو میں وقفے اور بار بار آہوں کا غلبہ تھا۔ فروری 1991ء میں، وہ اپنے شوہر کے ساتھ اپنے گھر پر تھی، اپنی تین سالہ بیٹی مہر کو گود میں لئے ہوئے تھی جب فوجی اس کے کمرے میں گھس آئے۔ اس سے پہلے کہ وہ سمجھ پاتی کہ کیا ہو رہا ہے، اس کے شوہر کو گھسیٹ کر گھر سے باہر نکال دیا گیا۔ اس نے اپنے بچے کے ساتھ کسی محفوظ مقام پر بھاگنے کی کوشش کی، لیکن فوجیوں نے اس کے بازو پکڑ لئے۔ اس کی بیٹی زمین پر گر گئی اور اس کی دائیں ٹانگ بری طرح زخمی ہوگئی۔ بچہ رونے لگا۔

اس کے تین دیگر بچے کمرے میں موجود تھے اور وہ سبھی رونے لگے۔ شور سے ناراض فوجیوں نے اپنی بندوقیں ان پر برسائیں۔ انہوں نے ان سے کہا کہ وہ اپنا منہ بند کر لیں ورنہ گولی ماردیں گے۔ سپاہیوں میں سے ایک نے رفیدہ کے منہ پر اپنا ہاتھ رکھ دیا تا کہ اسے خطرے کی گھنٹی بجانے سے روکا جا سکے۔ وہ باہر سے بھی رونے اور چیخنے کی آوازیں سن سکتی تھی۔ پانچ فوجیوں نے اسے پکڑ لیا اور ایک ایک کر کے اس کی عصمت دری کی۔ اس

کے بچوں نے اس پورے واقعے کا مشاہدہ کیا۔ ایک گھنٹے کے بعد تمام سپاہی چلے گئے۔ تھوڑی دیر بعد علاقے میں تعینات ایک پولیس اہلکار عبدالغنی کمرے میں داخل ہوا اور رفیدہ کی حالت دیکھ کر حیران رہ گیا۔ اس نے رفیدہ کو بتایا کہ اس کی بیٹی مہر کی ٹانگ میں چوٹ لگی ہے لیکن وہ محفوظ ہے کیونکہ اس نے اسے گھر کے برآمدے میں رکھ دیا ہے۔ تب سے مہر، جس کی عمر اب 27 سال ہے سہارے کے بغیر چلنے پھرنے کے قابل نہیں ہے۔ اس نے شادی کا خیال چھوڑ دیا ہے۔ اس کے والدین مسلسل فکرمند رہتے ہیں کہ وہ اپنی زندگی کے ساتھ کیا کرنے جا رہی ہے اور ان کے جانے کے بعد اس کی دیکھ بھال کون کرے گا۔

رفیدہ کی دوسری بیٹی فریزہ، جو اب 38 سال کی ہو چکی ہے، اور اس کے شوہر اور دو بچوں کو سسرال والوں نے گھر سے نکال دیا ہے۔ فریزہ نے اپنی عمر سے تقریبا دوگنی عمر کے شخص سے شادی کر کے سمجھوتہ کیا مگر وہ خوش قسمت تھی کہ اسے ایک مددگار آدمی مل گیا، اس نے اپنے سسرال میں جو تین سال گزارے، وہ ان کے لیے نہایت اذیت ناک تھے۔ اسے ایک سال تک اپنے شوہر کے بغیر رہنا پڑا، کیونکہ وہ اپنے خاندان کے ساتھ نباہ کی کوشش کر رہے تھے، اور رفیدہ اور ان کے شوہر نے اپنی بیٹی کی دیکھ بھال کی۔ بعد میں، تقریبا دس سال تک، وہ اور اس کا شوہر رفیدہ کے ساتھ رہے۔ اپنے بھائی کی شادی کے بعد، فریزہ کی فیملی کنن کے ایک چھوٹے سے مٹی کے شیڈ میں چلی گئی۔

ان برسوں میں، وہ غربت کا شکار رہی کیوں کہ اس کے شوہر کی آمدنی فیملی کے لیے ناکافی تھی۔ مسلسل تناؤ اور مالی بے یقینی نے فریزہ کی صحت پر اثر ڈالا اور اسے دل کی بیماری ہوگئی۔ رفیدہ نے شکایت کی کہ ان کی بہو، جو پڑوسی گاؤں سے تعلق رکھتی ہے، فریزہ کے ساتھ بدتمیزی کرتی ہے، اور بحث کے دوران صرف اسے تکلیف پہنچانے کے لیے اکثر رفیدہ کی عصمت دری کو سامنے لاتی ہے۔

متاثرہ خواتین میں سے ایک اور نوجوان حدیقہ، جس کی شادی اپنے گاؤں سے

باہر کسی سے ہوئی تھی، کے پاس بھی اپنی دردناک کہانی بیان کرنے کے لیے تھی۔ حدیقہ نے کہا کہ شادی کے وقت اس کے سسرال والوں کو اجتماعی عصمت دری کے بارے میں کوئی علم نہیں تھا، ورنہ وہ کبھی بھی اس رشتے کے لئے راضی نہیں ہوتے لیکن جیسے ہی انہیں پتہ چلا کہ ان عورتوں کے علاوہ جن کے نام منظر عام پر آئے تھے اور بھی بہت سی عورتیں تھیں جن کی عصمت دری کی گئی تھی، ان کی مشکلات شروع ہوگئیں۔ انہیں بھی باقاعدگی سے ہراسانی اور طعنوں کا سامنا کرنا پڑا۔ جب بدسلوکی اور ذلت ناقابل برداشت ہوگئی تو وہ اپنے والدین کے گھر واپس چلی گئی۔ اس کے شوہر نے کبھی بھی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش نہیں کی اور نہ ہی اسے واپس آنے کے لئے کہا۔

گاؤں کی ایک اور نوجوان لڑکی نے بتایا کہ اس کی بہن کی شادی پڑوسی گاؤں میں ہوئی تھی۔ "اس کے سسرال والے اسے ہم سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے اور ہم بھی اس سے ملنے نہیں جاتے، یہاں تک کہ تہواروں کے موقع پر بھی نہیں۔ ہمیں پتہ چلا کہ وہ اپنے گھر میں بہت ساری پریشانیوں اور ذلت کا سامنا کر رہی ہے۔ "ریپ شدہ گاؤں کی بیٹی" اس کے خلاف استعمال ہونے والی سب سے عام تنقید ہے۔ پھر ہم بہن کو واپس لے آئے۔

☆......☆

ذہنی اور جسمانی صحت

''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین کو جو سماجی صدمہ پہنچا ہے اس کے علاوہ، جنسی حملے نے ان کی جسمانی اور ذہنی صحت پر تباہ کن اثرات مرتب کیے ہیں۔ اس واقعہ کا بچوں کی صحت پر بھی اثر پڑا ہے۔ گاؤں میں ریپ سے بچ جانے والوں سے بات کرتے ہوئے، میں نے دیکھا کہ ان میں سے تقریباً سبھی پوسٹ ٹرومیٹک اسٹریس ڈس آرڈر (پی ٹی ایس ڈی) کی مخصوص علامات میں مبتلا ہیں جیسے بار بار مائیگرین، آنکھوں کے سامنے اندھیرا آنا، چکر آنا، بھول جانا اور قلیل مدتی یادداشت میں کمی، ہائی بلڈ پریشر وغیرہ۔

بہت سی خواتین نے مجھے بتایا کہ انہیں ڈپریشن کی علامات کا سامنا کرنا پڑتا ہے اور انہیں اینٹی ڈپریشن ادویات تجویز کی گئی ہیں۔ خواتین کے ساتھ بات چیت شروع کرنا اکثر مشکل ہوتا تھا، کیونکہ بات چیت کا رخ اس رات کی طرف مڑتے ہی یہ علامات انہیں بے چین کرنے لگتی ہیں۔ ایک موقع پر میں نے راحت، رفیدہ، پیرسہ اور انصاف سے بات کرنا شروع کی۔ گفتگو کے دوران جب ہم بات کر رہے تھے تو میں نے محسوس کیا کہ انصاف قدرے بے چین دکھائی دے رہی تھی، اس کا چہرہ زرد تھا اور وہ پریشان تھی۔ اس کے ہاتھ کانپ رہے تھے اور جب میں نے انہیں چھوا تو پسینہ آ رہا تھا۔ انہوں نے اپنی تکلیف کو اس واقعے سے منسوب کیا۔ انہوں نے کہا کہ پورا گاؤں 1991ء سے اور اس سے پہلے بھی فوج کی موجودگی کی وجہ سے خوف کی کیفیت میں جی رہا ہے۔ اس نے کہا:

''ہماری زندگی اجیرن ہو چکی ہے۔ جب بھی ہم کسی فوجی کو دیکھتے ہیں یا کسی کو اجتماعی عصمت دری کے بارے میں بات کرتے سنتے ہیں، تو ہم میں سے بہت سے لوگ

خوفزدہ ہو جاتے ہیں اور ہم کانپنے لگتے ہیں۔ پورا گاؤں غمزدہ ہے۔ یہاں تک کہ شادی کی تقریبات بھی اپنی شان کھو چکی ہیں۔ اس رات نے ہمارے بچوں کی زندگیاں بھی برباد کر دی ہیں۔ وہ گاؤں سے باہر نہیں جانا چاہتے، اور وہ خود کو گھر کی چار دیواری تک محدود رکھتے ہیں۔ جب انہیں گاؤں کے باہر ذلت کا سامنا کرنا پڑتا ہے تو وہ ذہنی تناؤ اور پریشانی محسوس کرتے ہیں یہاں تک کہ گاؤں کے وہ کنبے بھی جو اس رات غیر محفوظ تھے، ہمیں ذلیل و رسوا کرتے ہیں''۔

مجھے بھی یہ تب پتہ چلا جب میں نے گاؤں کے دیگر کنبوں کے کچھ نوجوانوں اور بالغ افراد سے بات کرنے کی کوشش کی۔ وہ اس رات سے وابستہ کسی بھی چیز کے بارے میں بات کرنے سے ہچکچا رہے تھے۔ انہوں نے کہا کہ جب بھی اخبارات میں خبریں شائع ہوتی ہیں تو انہیں جموں وکشمیر پولیس (ترہ گام پولیس اسٹیشن)، ہندوستانی فوج (خاص طور پر ترہ گام میں واقع 24 راشٹریہ رائفلز) اور دیگر ایجنسیوں کی طرف سے ہراساں کیا جاتا ہے۔ یہ حکام گاؤں میں جاتے ہیں، کیس کے بارے میں سوالوں کے جواب مانگتے ہیں اور بار بار فون کالز کے ذریعے انہیں ڈرانے دھمکانے کی کوشش کرتے ہیں۔ ایک لمحے کے لئے کمرے میں خاموشی چھا گئی۔ پھر راحت نے بولنا شروع کیا اور انہی جذبات کا اظہار کیا :

''ہم اب بھی اس ڈراؤنے خواب کے آسیب میں مبتلا ہیں۔ ہم اپنی عزت نفس کا احساس کھو چکے ہیں۔ ہمیں اپنی زندگیاں تاحیات مایوسی کی خندقوں کی طرح محسوس ہوتی ہیں۔ اس سے ہمارے خاندانوں میں بھی تناؤ پیدا ہوا ہے۔ ہم خود کو بیکار محسوس کرتے ہیں، اکثر روتے ہیں اور ٹوٹ جاتے ہیں۔ ہمارے پاس اچھی یادیں نہیں ہیں، ہمارے ذہن بند ہیں''۔

سبھی عورتوں نے اتفاق میں سر ہلایا۔ وہ نفسیاتی الجھنوں کا شکار ہیں لیکن ان میں سے کسی کو بھی ان پوشیدہ زخموں کے لئے کوئی مناسب تشخیص یا علاج نہیں ملا ہے، حالانکہ ان

میں سے بہت سوں کو باقاعدگی سے بے خوابی، اور اینٹی ڈپریشن کے لئے نیند کی دوائیں تجویز کی جاتی ہیں۔ اس رات نے ان کی جسمانی صحت کو بھی نقصان پہنچایا ہے۔ تمام خواتین کو جسم میں درد، سر درد، نیند کی خرابی، کمر درد، گائناکولوجیکل مسائل کی شکایت ہوتی ہے۔ ان میں سے زیادہ تر خراب تولیدی صحت کا شکار ہیں۔

عصمت دری کے بعد کم از کم دو خواتین کا کئی بار اسقاط حمل ہوا، اور دیگر کو شادی کے بعد حاملہ ہونے میں دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔ 40 متاثرہ خواتین میں سے (جنہوں نے 2004ء میں جے کے ایس ایچ آر سی سے رابطہ کیا تھا)، تقریباً 15 خواتین کا بچہ دانی کا آپریشن یا دیگر گائنیکولوجیکل سرجری ہوئی ہے جس کی درست نوعیت واضح نہیں تھی۔ گاؤں میں عصمت دری سے بچ جانے والی زیادہ تر خواتین کسی نہ کسی صحت کے مسئلے سے دوچار ہیں۔

40 خواتین میں سے پانچ عصمت دری کا شکار خواتین پہلے ہی مر چکی ہیں۔ ان میں سے دو کو ریپ کے بعد مسلسل خون بہہ رہا تھا، جو علاج کے باوجود نہیں رکا، اور آخر کار ان کی موت کا سبب بنا۔ ان میں سے بعض کی کئی سرجریاں ہو چکی ہیں اور ان میں سے کچھ اب بستر پر ہیں۔ ایک عورت کی ریکٹل سرجری ہوئی ہے — اسے تقریباً سترہ سال بعد یہ سرجری کرانی پڑی کیوں کہ اس کے ساتھ جنسی زیادتی کی گئی تھی۔ رفع حاجت کے دوران اسے مسلسل خون بہہ رہا تھا اور مشکلات کا سامنا کرنا پڑا تھا، لیکن وہ کئی سالوں تک کسی کو اس کے بارے میں بتانے میں شرم محسوس کرتی تھی حالاں کہ اس کے شوہر کو معلوم تھا کہ اس کے ساتھ ریپ کیا گیا تھا۔ آخر کار اس کی بہو کو احساس ہوا کہ کچھ غلط ہے جب اسے بیت الخلا میں خون ملا، اور اس نے اسے علاج کرانے کے لئے راضی کیا۔ اس کا آپریشن کیا گیا اور آخر کار اس کا خون بہنا بند ہو گیا۔

ان میں سے کچھ عورتوں کے جسم پر اس رات لگنے والی چوٹوں کے نشانات بھی ہیں۔ اگست 2013ء میں جے کے سی سی ایس (جموں کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی) اور

ایس جی کے پی ریپ متاثرین کے بیانات ریکارڈ کر رہے تھے۔ بیان ریکارڈ کرتے ہوئے، زندہ بچ جانے والوں میں سے ایک نے ہمیں اپنے پیٹ پر زخم دکھائے، یہ زخم اسے اس رات لگے تھے جب فوجی اہلکاروں نے اسے بندوقوں کے بٹوں سے پیٹا تھا۔ ''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں کو جن کی مالی حالت اچھی نہیں تھی، اپنی صحت برباد ہونے کی وجہ سے بھاری معاشی بوجھ برداشت کرنا پڑا ہے، متاثرین میں سے کچھ نے اپنے اور اپنے شوہروں یا بیٹوں کے مناسب علاج پر جنہیں شدید تشدد کا نشانہ بنایا گیا تھا لاکھوں روپے خرچ کیے، بہت سے مرد بھی جنسی زیادتی کا شکار ہوئے تھے۔

تشدد کی وجہ سے کمزوری اور بے بسی کی کیفیت نے ان کی زندگیوں کو گہرا متاثر کیا، متاثرین میں سے ایک مرد کے ذریعے ہمیں پتہ چلا کہ اس نے چنڈی گڑھ اور دہلی میں بھی علاج کرایا تھا۔ اس رات بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بننے والے مردوں میں سے ایک کو تشدد کی وجہ سے پیدا ہونے والی 23 سال کی طبی پیچیدگیوں کے بعد اپنی دائیں ٹانگ کٹوانا پڑی۔ اس کے نتیجے میں پیدا ہونے والی پیچیدگیاں آخر کار جون 2014ء میں اس کی موت کا سبب بنیں۔ اس رات ریپ کا نشانہ بننے والی زیادہ تر خواتین کسی نہ کسی طرح کی طویل مدتی ادویات لے رہی ہیں۔ انہیں علاج کے لیے اکثر سرینگر کے اسپتالوں کا رخ کرنا پڑتا ہے، جس سے فیملی کی مالی حالت پر مزید اثر پڑتا ہے۔

☆......☆

مزاحمت اور غیر متزلزل جذبہ

اہم بات یہ ہے کہ تمام تر مصائب کے باوجود ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین نے ہنسنے مسکرانے کی صلاحیت نہیں کھوئی ہے۔ خاص طور پر جب مرد آس پاس نہیں ہوتے تو وہ کھل کر بولتی ہیں اور آپس میں خوب گپ شپ لگاتی ہیں۔ وہ ایک دوسرے سے چھیڑ چھاڑ کرتیں اور جب میں وہاں ہوتی تو مجھے اکثر ان کے لطیفے سننے پڑتے تھے۔ وہ میرے لہجے پر ہنستی تھیں مگر پھر وقت گزرنے کے ساتھ، وہ مجھے یوں دیکھنے کی عادی ہوگئیں اور ہمیشہ مجھے دیکھ کر خوش ہوا کرتیں، جب میں وہاں جاتی ہوں تو وہ گرم جوشی سے گلے لگ کر مجھے خوش آمدید کہتی ہیں اور دونوں گالوں پر بوسہ دیتی ہیں، مجھے کھانے پر گھر بلاتی ہیں، حالاں کہ میں جانتی ہوں کہ ان کے بچوں میں سے بعض کو وہ توجہ پسند نہیں ہے جو باہر والے اس گاؤں پر دیتے ہیں۔ ''کنن پوش پورہ'' کے لوگ خاموش متاثرین نہیں رہے ہیں۔ زیادہ تر لوگ اس غلط فہمی میں ہیں کہ ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری اور تشدد کا معاملہ 2013ء میں دوبارہ کھولا گیا تھا، جب 50 خواتین درخواست گزاروں نے ہائی کورٹ میں ایک پی آئی ایل دائر کی تھی۔ ایسا لگتا ہے کہ اجتماعی عصمت دری اور کیس کے دوبارہ کھلنے کے درمیان، ان تمام سالوں میں گاؤں والوں کی طرف سے صرف خاموشی تھی۔ لیکن انصاف کے لئے ان متاثرین کی جرات مندانہ لڑائی کوئی نئی بات نہیں ہے۔

انہوں نے اس واقعہ کے بعد سے مسلسل احتجاج کیا ہے۔ انہیں ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین کی شکل میں ایک ہمدرد افسر ملا۔ جب میں ان سے بات کرتی ہوں، تو ایسا لگتا ہے

کہ کسی بھی افسر کی مدد سے قطع نظر انہوں نے اس بات کو یقینی بنایا ہوگا کہ جرم کو دستاویزی شکل دی جائے۔ دراصل فرسٹ انفارمیشن رپورٹ (ایف آئی آر) صرف اس لئے درج کی گئی اور تحقیقات شروع کی گئیں کہ انہوں نے خاموش رہنے سے انکار کر دیا تھا۔ جیسا کہ اس واقعے کے ایک متاثرہ عورت نے مجھے بتایا، 'ہم مقدمہ درج کرانا چاہتے تھے کیونکہ ہم نہیں چاہتے تھے کہ وہ دوبارہ ایسا کریں۔ ہم جانتے تھے کہ اگر ہم خاموش رہے، تو وہ دوبارہ ایسا کریں گے، اگر ہمارے گاؤں میں نہیں تو کہیں اور۔ انہوں نے مختلف فورمز کے ذریعے ریاستی تشدد اور جرم پر پردہ پوشی دونوں کا مقابلہ کیا ہے۔ انہوں نے اپنی آواز اتنی بلند کی ہے کہ محققین، صحافیوں، مصنفین اور مورخین تک پہنچ سکیں، باوجود اس کے کہ ریاستی مشینری اس جرم کو دفن کرنے کی پوری کوشش کر رہی ہے۔ انہوں نے تفتیش کے دوران پولیس کو بیان دیا ہے اور وہ سبھی آج بھی دوبارہ اپنا بیان ریکارڈ کرانے کے لئے تیار ہیں۔ یہاں تک کہ کچھ نوجوان خواتین جو ابتدائی دنوں میں آگے نہیں آئیں وہ بھی اب بولنے کے لئے تیار ہیں۔

☆......☆

ساتواں حصہ

پوچھ گچھ اور استثنیٰ

صدمے کی حالت میں ہونے کے باوجود، گاؤں والوں نے واقعہ کے ایک دن بعد ریکارڈ پر اس مجرمانہ فعل کے بارے میں شکایت کرنے کا عمل شروع کر دیا تھا۔ ان کی بار بار کی جانے والی کوششیں، اور ان کے نتیجے میں ہونے والی بے شمار تحقیقات اور پردہ پوشی، ایک طرف انصاف سے انکار اور دوسری طرف ہمت اور استقامت کی ایک دل دہلا دینے والی کہانی ہے۔ ایسے ماحول میں جہاں فوج اور ریاستی اداروں کی جانب سے ایسے افراد کو بغاوت اور آتنک وادیوں کا سرپرست کہہ کر مزید مظالم کرنے کا خوف بھی موجود تھا لیکن پوش پورہ کے شہریوں نے بڑی بہادری اور دلیری کا مظاہرہ کیا اور واقعے کے دوسرے ہی دن اس اندوھناک واقعے کو ریکارڈ پر لانے کے لیے کمربستہ ہوگئے۔

سچ کو جھٹلانا 1991ء میں عام بات تھی، جب ہندوستانی فوج مبینہ طور پر ایک 'جنگ' میں مصروف تھی، اس وقت میڈیا اتنا تیز تھا نہ ذرائع نقل وحمل لیکن اس سے بھی کچھ فرق نہیں پڑتا، بھارتی فوج کا کشمیریوں کے ساتھ آج بھی یہی رویہ ہے۔ 25 سال بعد جب بہت سے مجرم ریٹائر ہو چکے ہیں اور پنشنر بن چکے ہیں ''کنن پوش پورہ'' کے عوام انصاف کے انتظار میں ہیں جوان کو کبھی نہیں ملے گا۔ دریں اثناء فوج کے وکلاء اور سرکاری و غیر سرکاری ترجمان، متاثرین اور زندہ بچ جانے والوں کو 'عسکریت پسندوں کے ہمدرد' کے طور پر نشانہ بنا رہے ہیں تاکہ وہ خوفزدہ ہو کر مقدمے سے دستبردار ہو جائیں۔

اس واقعہ کے بعد، گاؤں کے چوکیدار اور دیگر نے ایک تفصیلی اعلامیہ تیار کیا اور

اگلے ہی دن اس پر انگوٹھے کی چھپائی اور 30 سے زیادہ متاثرین کے دستخط کروائے۔ ڈپٹی کمشنر کو لکھے گئے خط میں انہوں نے فوج کی جانب سے ان کی ماؤں، بہنوں، بیٹیوں اور مردوں پر ڈھائی گئی بربریت کا ذکر کیا۔ یہ الگ بات ہے کہ اس خط کو سرکاری ریکارڈ پر لانے میں تقریباً ایک ہفتہ لگ گیا، حالانکہ لوگوں نے ترہ گام کے فوجی کیمپ اور پولیس اسٹیشن کے بار بار دورے کیے تھے۔ ''کنن پوش پورہ'' کے عوام کے اس خط نے اس مقدمے کو سر عام کیا ورنہ فوج نے تو اسے اسی روز بند کر دیا تھا جب پولیس اور چند افراد سے زبردستی لکھوالیا تھا کہ سرچ آپریشن کے دوران کوئی ناخوشگوار واقعہ نہیں ہوا۔

بعض افراد کا خیال ہے کہ اس واقعہ پر لب کشائی کے بجائے زبان بندی زیادہ بہتر تھی تا کہ علاقے کے لوگوں خاص طور پر خواتین کو عصمت دری جیسی بدنامی سے بچایا جاتا جو کسی بھی معاشرے میں انتہائی معیوب ہے۔ جس کا خمیازہ یہاں کی خواتین خاص طور پر نوجوان لڑکیوں کو بھی بھگتنا پڑا اور آج تک یہ طعنہ ان نوجوان لڑکیوں یا اس گاؤں کی دوسری اور تیسری نسل کا بھی پیچھا کر رہا ہے لیکن یہاں کے لوگوں نے ہمت اور استقامت کی اعلی مثال قائم کی جنہوں نے ان سخت مصائب میں مزاحمت کا فیصلہ کیا۔ اگر گاؤں والے اس واقعہ کو عام نہ کرتے تو بھارتی فورسز کسی دوسرے گاؤں میں ایسا واقعہ دہراتے اور یہ سلسلہ عام ہو جاتا۔ ''کنن پوش پورہ'' کے عوام نے یہ ہمت کر کے دنیا بھر میں بھارتی فورسز کے جرائم کو عیاں کیا اور فوج کی یہ کارستانی دنیا بھر کے میڈیا اور سوشل پلیٹ فارم تک پہنچی اس سے بھارت کا دنیا سے خاصی لعن طعن ہوئی اور اس طرح کا دوسرا واقعہ نہیں ہوا گو کہ عصمت دری جو جنگی ہتھیار کے طور پر مقبوضہ کشمیر میں استعمال ہوتا رہا ہے لیکن اس طرح گاؤں کے گاؤں میں مورچہ بند عصمت دری کے واقعات میں رکاوٹ آئی۔

☆......☆

ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین کی انکوائری

اس درخواست پر مزید انکوائری اور غور کرنے اور صورتحال کے جائزہ لینے کے لئے ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین نے 5 مارچ 1991ء کو گاؤں کا دورہ کیا۔ اپنی تفتیش کی بنیاد پر انہوں نے 7 مارچ کو سرینگر میں کشمیر کے ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کو ایک خفیہ رپورٹ بھیجی جس کی عکسی نقول جموں و کشمیر حکومت کے ڈائریکٹر جنرل آف پولیس، ڈپٹی انسپکٹر جنرل آف پولیس (ڈی آئی جی) پولیس، سرینگر۔ اسپیشل کمشنر، بارہ مولہ، بارہ مولا پولیس رینج کے ڈی آئی جی اور کپواڑہ کے ایس پی کو برائے 'معلومات اور ضروری کارروائی ارسال کی گئیں'۔ اس میں انہوں نے کہا:

''مسلح افواج نے پر تشدد درندوں کی طرح برتاؤ کیا ... بڑی تعداد میں مسلح اہلکار گاؤں والوں کے گھروں میں گھس گئے اور بندوق کی نوک پر شادی شدہ، غیر شادی شدہ اور عمر اور حمل وغیرہ کا خیال رکھے بغیر 23 خواتین کو اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا جس پر پورے گاؤں میں شور مچ گیا''۔

8 مارچ 1991ء کو ایس ایم یاسین کے خفیہ خط کو سرکاری منظوری کے بعد آخر کار ترہگام پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر کے طور پر درج کیا گیا۔ یہ خط پریس میں لیک ہو گیا اور صحافیوں نے کنن پوش پورہ واقعہ پر رپورٹنگ شروع کر دی۔

پہلی خبر کشمیری صحافی یوسف جمیل نے 12 مارچ 1991ء کو ٹیلی گراف (کولکتہ) کے لیے شائع کی تھی۔ یہ واقعہ بین الاقوامی اخبارات میں بھی شائع ہوا۔ برطانوی اخبار دی انڈیپنڈنٹ نے "Indian Village's Tale of Mass Rape

by Soldiers" کے عنوان سے ایک رپورٹ شائع کی۔

اس بے ثبات دنیا میں بھی ''کنن پوش پورہ'' کے عوام کے لیے ڈپٹی کمشنر کپواڑہ ایس ایم یاسین فرشتہ صفت انسان ثابت ہوا جس نے کم از کم حقیقت کو عیاں کیا اور وہ تمام سچ ریکارڈ پر لے آیا جو 23۔24 فروری 1991ء کو ''کنن پوش پورہ'' کے عوام کے ساتھ ہوا۔ اس رپورٹ پر پولیس مجبور ہوگئی کہ واقعے کی ایف آئی آر درج ہو ورنہ متاثرین کے لیے ایف آئی آر درج کرانا بھی مشکل تھا۔

سری نگر کے معروف صحافی یوسف جمیل نے بھی بہادری کا کام کیا کہ وقت پر خبر کو شائع کر دیا۔ روزنامہ ٹیلی گراف کی خبر نے یوں سمجھیں کہ آگ لگا دی، آناً فاناً یہ خبر بین الاقوامی میڈیا کی شہ سرخی بن گئی۔ اس سے بھارت پر انسانی حقوق کے اداروں کی جانب سے شدید دباؤ پڑا اور بظاہر غیر جانبدار انکوائری کے اعلانات اور مجرموں کو سزائیں دینے کی باتیں ہونے لگیں لیکن یہ محض وقت گزارنے کے بہانے اور دباؤ کو کم کرنے کے حربے تھے، سو ایسا ہی ہوا، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ دنیا ''کنن پوش پورہ'' کو بھولنے لگی اور بھارتی فوج نے مقدمہ بند کرنے کے لیے دباؤ ڈالنا شروع کیا اور بالآخر یہ کیس منطقی انجام تک پہنچنے سے پہلے ہی خراب کر دیا گیا۔ اس کے باوجود دنیا حقیقت سے واقف ہوگئی انسانی حقوق کے بین الاقوامی اداروں نے رپورٹس شائع کیں جن میں ''کنن پوش پورہ'' مظالم کا تذکرہ کیا گیا جب کہ عدالتوں میں مقدمات کی کارروائی اور رپورٹس شائع ہونے پر بھارت بھر کے عوام کو اس کا اندازہ ہوگیا کہ بھارتی فورسز کشمیر میں انسانی حقوق کی خلاف ورزی میں کیا کارنامے انجام دے رہی ہے بدقسمتی سے آزاد کشمیر کے عوام اور حکمران جو پاکستانی سیاسی پارٹیوں کے زیر اثر ہیں ایسے واقعات سے لاتعلق ہیں۔ لیکن دنیا بھر کی جانب سے بھارت کے خلاف رپورٹ اور یورپی اقوام کی جانب سے متعدد موقعوں پر بھارت کی مذمت کشمیریوں کی تحریک آزادی کے لیے بہتر ہیں۔

☆......☆

فوجی بریگیڈیئر کی رپورٹ

لیکن پریس کو اس کے بارے میں معلوم ہونے سے پہلے ہی پوری وادی میں افواہیں پھیل رہی تھیں، جیسا کہ ایس ایم یاسین نے بھی اپنی رپورٹ میں ذکر کیا ہے۔ فوج نے اپنی تحقیقات دباؤ کے تحت اس وقت شروع کیں جب پولیس نے ان سے رابطہ کیا کیوں کہ انہیں لوگوں کے غیض و غضب کو قابو کرنا ناممکن لگا اور ایک اور بریگیڈ کے سربراہ بریگیڈیئر ایچ کے شرما کو تحقیقات کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ بریگیڈیئر شرما نے 10 مارچ کو گاؤں کا دورہ کیا اور اپنی تفتیش کے دوران انہوں نے گاؤں کے سردار عبدالعزیز شاہ اور ریپ متاثرین سے بات کی۔

رپورٹ کے مطابق جب ان سے خصوصی طور پر پوچھا گیا کہ کیا خواتین کے ساتھ کوئی بدسلوکی یا چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے تو گاؤں کے سردار نے اس کا دوسروں سے ذکر کیا اور تقریباً 30 خواتین کو اپنی شکایات درج کرانے کے لئے جمع کیا گیا۔ زیادہ تر خواتین کی عمریں 40 سے 50 سال کے درمیان تھیں اور کچھ کی عمر 30 سال کے قریب تھی۔ ان خواتین کو الگ کیا گیا اور پولیس اہلکاروں، گاؤں کے سردار اور اسکول ٹیچر کی موجودگی میں مردوں سے دور انہیں اپنی شکایات کی وضاحت کرنے کے لئے کہا گیا۔ 13 عورتوں نے بتایا کہ ان کے ساتھ عصمت دری کی گئی ہے۔ پہلی دو خواتین نے بتایا کہ دو سے تین افراد نے عصمت دری کی ہے۔ بعد میں شکایت کنندگان نے ایک خاتون پر حملہ کرنے والے اہلکاروں کی تعداد بڑھا کر 6 سے 8 کر دی۔ مبینہ بدسلوکی آدھی رات کے قریب ہوئی۔

پچھلے ایک سال سے، میں باقاعدگی سے ریپ متاثرین سے مل رہی ہوں اور وہ

اب بھی اس رات کے بارے میں بات کرنے سے ہچکچا رہی ہیں۔ گاؤں والوں نے ہمیں بتایا کہ بریگیڈیئر جو ہندوستانی فوج کا حصہ تھا، صرف ان کے پاس جا کر اور کریک ڈاؤن جیسی صورتحال میں ان سے پوچھ گچھ کر کے انہیں ڈرا دھمکا رہا، بریگیڈیئر نے انکوائری رپورٹ میں سچ کو مکمل دبا کر خالصتاً فوج کے نکتہ نظر کو بیان کیا بلکہ الٹا ''کنن پوش پورہ'' کے عوام پر ہی الزامات لگائے۔ بریگیڈیئر نے رپورٹ میں بتایا کہ 'جب خواتین اپنی شکایات بتا رہی تھیں تو دوسری خواتین ہنس رہی تھیں'۔ ایسا لگتا ہے کہ بریگیڈیئر متاثرین کو مسترد کرنے اور ان کی تردید کرنے کے ارادے سے گاؤں میں آیا تھا۔ حیرت کی بات نہیں کہ بریگیڈیئر نے یہ کہتے ہوئے رپورٹ کا اختتام کیا کہ 'الزامات بے بنیاد، شرارتی اور بدنیتی کے محرکات پر مبنی ہیں'۔ رپورٹ میں تلاشی کے دوران گاؤں سے برآمد ہونے والے ہتھیاروں کا بھی ذکر کیا گیا ہے، جیسے کہ یہ اکیلے ہی عصمت دری کا جواز فراہم کرتا ہے، لیکن ضرورت کے مطابق انہیں کبھی بھی پولیس کے حوالے نہیں کیا گیا۔ بریگیڈیئر نے اپنی واضح طور پر متعصّبانہ اور نامناسب 'انکوائری' کی بنیاد پر دعویٰ کیا کہ 'فوج کو بدنام کرنے، مزید تلاشی اور محاصرے کو روکنے اور مشتبہ ملک دشمن عناصر کو تحفظ فراہم کرنے' کے الزامات لگائے گئے ہیں۔ اہم بات یہ ہے کہ اس رات گاؤں سے ایک بھی نام نہاد 'ملک مخالف عناصر' کو گرفتار نہیں کیا گیا تھا بلکہ فوج نے ملزمان کی تلاش کا تو کام ہی نہیں کیا جو کام فوج کرنے آئی تھی اس کو پوری رات جاری رکھا اور وہ تھا اجتماعی عصمت دری۔

☆......☆

وجاہت حبیب اللہ کی رپورٹ

ہمارے خیال میں ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری/ تشدد کو دبانے میں مجرمانہ کردار ادا کرنے والے اگلے سرکاری افسر اس وقت کے ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ تھے۔ وجاہت حبیب اللہ نے 18 مارچ کو گاؤں کا دورہ کیا اور حکومت کو ایک خفیہ رپورٹ پیش کی، جسے بعد میں عوام کے سامنے لایا گیا۔ ان کی رپورٹ اس اعتراف کے ساتھ شروع ہوتی ہے کہ:

''اس مبینہ جرم کی خبر پر مقامی اور قومی پریس کی جانب سے سخت منفی تبصرہ کیا گیا تھا اور جاری کردہ تردیدیں سزا دینے میں ناکام رہی تھیں۔ ڈی جی پی اور کور کمانڈر کے ساتھ بات چیت کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ دستخط کرنے والے گاؤں کا دورہ کر سکتے ہیں اور متعلقہ فوجی افسران سے بھی بات چیت کر سکتے ہیں تا کہ شکوک وشبہات کو دور کرنے اور اعتماد کی بحالی کے لئے ضروری کارروائی کا تعین کیا جا سکے۔ یہ دہرا معیار مقبوضہ جموں کشمیر میں جاری آزادی کی تحریک کے لیے کشمیریوں اور بھارتی فورسز کے درمیان گوریلہ جنگ جیتنے کے لیے بھارتی ریاست کا ہتھیار تھا جس کو وہ سول آبادی پر استعمال کر رہی تھی تا کہ عوام کو خوف زدہ کیا جا سکے تا کہ وہ آزادی تا کہ وہ آزادی ہند سے دور ہو جائیں اور ان کو تنہا کر کے ختم کیا جائے اس زمانے میں مقبوضہ کشمیر میں حیریت پسند اور عوام ایک صفحہ پر تھی۔ کسی بھی حریت پسند کے جنازے میں لاکھوں افراد شامل ہوتے۔ ہڑتالوں اور احتجاج سے بھارت خوف زدہ ہو چکا تھا جس کو روکنے کے لیے ریاست کا ہر پرزہ یکسو تھا کہ عصمت دری سے کشمیریوں کے سماجی ویلیوز کو تباہ کیا جائے بصورت دیگر ان کو میدان میں شکست دینا مشکل

ہے۔کمشنر سرنگر نے بھی اس پالیسی کے تحت رپورٹ تیار کی۔

اس جملے سے واضح ہے کہ ان کی تفتیش کا اصل محرک سچائی کا پتہ لگانا نہیں تھا بلکہ صرف 'شکوک وشبہات کو دور کرنا اور فوج پر اعتماد بحال کرنا' تھا۔ چوں کہ انہوں نے اپنی رپورٹ واقعہ کے ذمہ داروں کے حق میں لکھی تھی ان کی مخصوص درخواست پر۔ لہٰذا یہ ہمارے لئے کوئی تعجب کی بات نہیں ہے کہ انہوں نے حقائق کو توڑ مروڑ کر پیش کرنے اور ڈپٹی کمشنر کی رپورٹ کی ساکھ کے بارے میں شکوک وشبہات پیدا کرنے کی کوشش کی۔ان کی رپورٹ سے پتہ چلتا ہے کہ سویلین انتظامی نظام نے بھی مجرموں کو بری کرنے کے لئے ان کے ساتھ تعاون کیا۔اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ کشمیر میں مسلح افواج کے لئے استثنیٰ کسی خاص قانون پر عمل نہ کرنے یا قانون کے ظالمانہ ہونے کا سوال نہیں ہے، بلکہ ہر سطح پر اور حکومت کے ہر عضو میں موجود ہے حتیٰ کہ عدالتوں میں بھی، یہ سب مل کر اس بات کو یقینی بنانے کے لئے کام کرتے ہیں کہ کسی بھی فوجی اہلکار کو اس کے جرائم کے لئے کبھی سزا نہ دی جا سکے۔ بعض اوقات جب حقائق کو سامنے لانا اس وقت کے ڈویژنل کمشنر کی اخلاقی اور سرکاری ذمہ داری تھی، تو انہوں نے اس کے برعکس کرنے کا انتخاب کیا۔ وجاہت حبیب اللہ کی رپورٹ میں کہا گیا:

’’مبینہ متاثرین کی تعداد میں مسلسل اتار چڑھاؤ ہو رہا ہے۔گاؤں والوں نے مبینہ جرم کے دو دن بعد سی ڈی آر 68 بی ڈی ای کو ایک ہی ریپ کی اطلاع دی تھی، لیکن ڈپٹی کمشنر کو 23 کے اعداد و شمار کی اطلاع دی گئی تھی۔متاثرہ ہونے کا دعویٰ کرنے والی 93 عورتیں میرے سامنے پیش ہوئی ہیں، اور کچھ گاؤں والوں نے بتایا کہ اب بھی ایسی عورتیں ہیں جو کھل کر رپورٹ کرنے سے ہچکچا رہی ہیں۔نجی تفتیش کاروں کو 53 مقدمات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔اگر ہر معاملے میں 5 سے 15 افراد نے مبینہ طور پر عصمت دری کی ہوتی تو گاؤں میں کم از کم 300 مرد اس کے سوا کچھ نہیں کرتے مگر درحقیقت مردوں کی تعداد 150 تھی،

چوں کہ آپریشن کے دوران کسی بھی فورس کو شراب لے جانے کی اجازت نہیں ہے لہٰذا بوتلیں واضح طور پر سازش کا حصہ ہیں‘‘۔

اس سے انہوں نے یہ نتیجہ اخذ کیا کہ اگرچہ شکایت کی صداقت انتہائی مشکوک ہے، لیکن پھر بھی اس بات کا تعین کرنے کی ضرورت ہے کہ اس طرح کی شکایت کیوں کی گئی تھی۔گاؤں کے لوگ سادہ لوح ہیں اور فوج کے اپنے اعتراف کے مطابق وہ عام طور پر فوج کے افسروں کی حفاظت کے بارے میں مددگار اور محتاط رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے عسکریت پسندوں کے دباؤ میں کام کیا ہو اور رپورٹ تیار کرنے میں طویل تاخیر ان کے اس کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہونے کا نتیجہ تھی۔فوج کو سفاکانہ، سویلین انتظامیہ کو غیر موثر اور حکومت ہند کو بدنام کرنے کے خواہاں عناصر نے اس مسئلے پر ایک مہم چلائی ہے۔ یہ عوام میں فوج کے لئے بڑھتی ہوئی خیر سگالی اور بہتر سول ملٹری رابطے کے تناظر میں سامنے آیا ہے۔ لیکن اس مرحلے پر اور جانچ کی موجودہ سطح پر اس امکان سے انکار کرنا ممکن نہیں ہے کہ الگ الگ واقعات پیش آئے ہیں جس نے گاؤں والوں کو ناراض کر دیا ہے۔ بریگیڈیئر شرما کے برعکس میں گاؤں کی بہت سی ایسی عورتوں سے ملی ہوں جن کے ساتھ میں نے کشمیری زبان میں بات کی تھی۔

دلچسپ بات یہ ہے کہ ان بیانات کو ریکارڈ کرنے کے 22 سال بعد وجاہت حبیب اللہ نے عوامی سطح پر بات کرتے ہوئے دعویٰ کیا کہ حکومت نے کنن پوش پورہ اجتماعی عصمت دری معاملے پر ان کی خفیہ رپورٹ کے اہم حصوں کو حذف کر دیا ہے جس میں انہوں نے 'پولیس تحقیقات، تفتیش کی سطح کو بہتر بنانے، معاملے کو گزٹڈ پولیس افسر کے حوالے کرنے اور تحقیقات میں فوج کے تعاون کو یقینی بنانے کے لیے 15 کور کمانڈر سے حکم مانگا تھا۔ انہوں نے مزید کہا کہ انہوں نے کئی اقدامات کی بھی سفارش کی ہے جو فوج کو آپریشن کے دوران کرنے کی ضرورت ہے۔ انہوں نے یہ بھی دعوی کیا کہ جب رپورٹ کو

عام کیا گیا تو انہوں نے حذف کرنے کے بارے میں احتجاج کیا۔ انہوں نے کبھی یہ وضاحت نہیں کی کہ انہوں نے متاثرین کے دعووں کی صداقت کے بارے میں اتنی کمزور بنیادوں پر شکوک وشبہات کیوں ظاہر کیے تھے اور نہ ہی انہوں نے ان پر تاخیر کا الزام لگایا تھا، جب کہ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ انہوں نے کیس خراب کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی ہے۔

حبیب اللہ کے بیان کے جواب میں جموں وکشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی سی ایس) اور سپورٹ گروپ فار جسٹس فار کنن پوشپورہ (ایس جی کے پی) نے ایک پریس بیان جاری کرتے ہوئے کہا کہ 'وجاہت حبیب اللہ کی رپورٹ کے کچھ حصوں کو حذف کرنے کے بعد ان کی خاموشی انہیں مزید اصل حقائق سے پردہ پوشی میں ملوث کرتی ہے۔ 22 سال تک ان کی خاموشی انہیں اس پر پردہ ڈالنے کا مجرم بناتی ہے۔

وجاہت حبیب اللہ کشمیر میں انتظامیہ میں ایک اہم عہدے پر رہتے ہوئے رپورٹ کے کچھ حصوں کو حذف کرنے کے بارے میں مبینہ سچائی کا انکشاف کر سکتے تھے جب ان کی رپورٹ پہلی بار منظر عام پر آئی تھی۔ لیکن انہوں نے متاثرین کی ساکھ کی قیمت پر 22 سال تک خاموش رہنے اور اپنے عہدے کی حفاظت کرنے کا انتخاب کیا۔ اب ان کا انکار صرف ایک آسان اور تاخیری عذر ہے۔ حبیب اللہ نے صرف ڈپٹی کمشنر کی رپورٹ اور متاثرین کی جانب سے فراہم کیے گئے ثبوتوں کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا، لیکن بی جی ورگیس کی قیادت میں پریس کونسل آف انڈیا کی ٹیم کی جانب سے ' آزادانہ تحقیقات' کی اگلی کوشش میں اس سے بھی زیادہ گھناؤنی 'عسکریت پسندوں کی جھوٹی تھیوری' پیش کی گئی اور عصمت دری اور تشدد کے الزامات کو یکسر مسترد کر دیا گیا۔

☆......☆

پریس کونسل آف انڈیا/ بی جی ورگیس کی رپورٹ

پریس کونسل کے بی جی ورگیس نے اپنی رپورٹ "Crisis & Credibility" کے ذریعے کنن پوش پورہ کے لوگوں کو بدنام کرنے کی مہم کا آغاز کیا۔ ورگیس کو فوج کی درخواست پر ان الزامات کی تحقیقات کے لیے مقرر کیا گیا تھا۔ بظاہر تو اس کا یہ تاثر دینے کی کوشش کی گئی کہ اس واقعہ کی غیر جانب دار صحافی سے انکوائری کرائی جا رہی ہے لیکن بی جی ورگیس کی رپورٹ اور تحقیقات سے باخوبی اندازہ ہوتا ہے کہ یہ بھی خانہ پری کی ایک کارروائی تھی۔ ان کے قریبی ساتھی اور اس وقت کے آرمی چیف جنرل ایس ایف روڈریگز کے والد فرانسس روڈریگز نے ان سے انکوائری کرنے کی درخواست کی تھی۔ انکوائری شروع کرنے، فنڈنگ کرنے اور شواہد تک رسائی اور مہمان نوازی فراہم کرنے میں فوج کی درخواست ان کی تحقیقات کے پورے عمل کو شکوک وشبہات میں ڈال دیتی ہے۔

بی جی ورگیس اور کے وکرم راؤ نے دو بار کشمیر کا دورہ کیا: 21 سے 26 مئی 1991ء کے درمیان (کشمیر میں پریس کے کردار سے متعلق ایک رپورٹ کے لیے) اور 10 سے 12 جون 1991ء کے درمیان (فوج کے خلاف لگائے گئے انسانی حقوق کی پامالی کے بہت سے الزامات کی تحقیقات کرنے کے لیے، جس میں 30 اگست 1991ء کا پازی پورہ، بالی پورہ اجتماعی عصمت دری اور ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری بھی شامل ہے، دونوں کپواڑہ میں ہیں)۔ حقیقت یہ ہے کہ 'جامع تحقیقات'، جس پر رپورٹ مبنی ہے، صرف نو دن کے عرصے میں مکمل ہوئی تھی (جس میں سے صرف ایک دن کپواڑہ میں گزارا گیا تھا) خود اس بات کی نشاندہی کرتا ہے کہ ٹیم واقعہ کی سچائی کی تلاش میں کتنی سنجیدہ تھی۔ اس

بات پر یقین کرنا بہت دور کی بات ہے کہ ورگیس نے اجتماعی عصمت دری اور تشدد کی اپنی تحقیقات مکمل کیں اور متاثرین کی گواہی لی، گواہوں اور عہدیداروں کا انٹرویو کیا، یا طبی دستاویزات اور ریکارڈ سے رجوع کیا جو رپورٹ کا حصہ ہیں، یہ سب تین دن کے اندر مکمل ہوا۔ رپورٹ کی زبان اور لہجے سے یہ واضح طور پر ظاہر ہوتا ہے، جسے 1991ء اور حال ہی میں بڑے پیمانے پر تنقید کا نشانہ بنایا گیا ہے، کہ بنیادی خیال اصل مجرموں کو بری الذمہ قرار دینا اور متاثرین میں سے زندہ بچ جانے والوں پر الزام عائد کرنا تھا۔ گاؤں والوں کو یاد نہیں ہے کہ انہوں نے کبھی کسی قسم کی تحقیقات کے لئے گاؤں کا دورہ کیا تھا۔

رپورٹ میں ہندوستان کی قومی سلامتی، اس کے جمہوری معاشرے اور ہندوستانی فوج کو قومی وقار کا محافظ قرار دیا گیا ہے۔ پریس کونسل آف انڈیا (پی سی آئی) کی ٹیم کے مطابق، فوج 'پریس میں اس کے خلاف لگائے گئے بے بنیاد یا انتہائی مبالغہ آمیز الزامات سے بہت پریشان تھی' اور اس لیے اس نے پریس کی ٹیم سے ان الزامات کی تحقیقات کرنے کی درخواست کی۔

یاد رہے کہ بی جی ورگیس قبل ازیں نیشنل انٹیگ ریشن کونسل، نیشنل سیکیورٹی ایڈوائزری بورڈ، کارگل ریویو کمیٹی اور سیکیورٹی واچ انڈیا کے ایڈوائزری بورڈ کے رکن رہ چکے ہیں۔ انہوں نے وزارت دفاع میں 'انفارمیشن کنسلٹنٹ' کے طور پر بھی خدمات انجام دیں۔ پی سی آئی کی رپورٹ لانسر پبلی کیشنز نے شائع کی تھی۔ لانسر قومی اور بین الاقوامی سلامتی اور دفاع سے متعلق موضوعات پر کتابیں شائع کرتا ہے۔ انڈین ڈیفنس ریویو بھی یہی ادارہ شائع کیا کرتا تھا۔ درحقیقت لانسر، انڈین آرمی آرمرڈ کور کے ایک سابق کیپٹن نے قائم کیا تھا۔

رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ فوج کے خلاف زیادہ تر الزامات افسانوی ہیں اور ان کی تحقیقات نہیں کی گئیں۔ لیکن رپورٹ سے ایسا لگتا ہے کہ پی سی آئی کی ٹیم کی رپورٹ بھی

کنن پوش پورہ

مصنف۔ بشیر سدوزئی

محض فسانہ ہے: انہوں نے صرف ان بہت سے معاملات پر فوج کے ساتھ بات چیت کی جن کی انہوں نے تفتیش کی تھی اور بغیر کسی جرح کے فوج کی سنائی ہوئی کہانیوں پر اندھا دھند یقین کیا۔ رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 4 راجپوتانہ رائفلز عسکریت پسندوں کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کے لئے پوری رات گھروں کی تلاشی لے رہی تھی اور لوگوں سے پوچھ گچھ کر رہی تھی۔ اس میں یہ بھی الزام لگایا گیا ہے کہ گاؤں چھوڑنے سے پہلے فوج نے بچوں میں مٹھائیاں تقسیم کیں! جو کوئی بھی کشمیر میں کریک ڈاؤن سے گزرا ہے وہ جانتا ہے کہ یہ وہ موقع نہیں ہے جب مٹھائیاں تقسیم کی جاتی ہیں۔ بندوق بردار فوجیوں کے ہاتھوں اپنے والدین کو دہشت زدہ اور بے عزت دیکھ کر کوئی بھی بچہ کسی فوجی سے مٹھائی لینے کے بجائے اس سے ڈر کر بھاگ جاتا تھا۔ درحقیقت پی سی آئی کی رپورٹ پڑھتے وقت اکثر ایسا لگتا ہے جیسے یہ فوج کے کہنے پر لکھی گئی ہے۔

پی سی آئی نے رپورٹ کا اختتام یہ کہتے ہوئے کیا: ''کنن ریپ کی کہانی ایک بہت بڑا دھوکہ ثابت ہوئی ہے، جسے کشمیر اور بیرون ملک عسکریت پسند گروہوں اور ان کے ہمدردوں اور سرپرستوں نے نفسیاتی جنگ کی مستقل اور چالاکی سے سوچی سمجھی حکمت عملی کے حصے کے طور پر منظم کیا اور کشمیر کو انسانی حقوق کے مسئلے کے طور پر بین الاقوامی ایجنڈے پر دوبارہ شامل کرنے کے لئے ایک داخلی دروازے کے طور پر تیار کیا۔ کہانی کے ڈھیلے سرے اور تضادات کئی سطحوں پر بہت سے لوگوں کے جھوٹ کو بے نقاب کرتے ہیں''۔

ٹیم نے بلاک میڈیکل آفیسر (بی ایم او) کی رپورٹس کا مذاق اڑایا اور کہا کہ 'مبینہ طور پر عصمت دری کے 32 معاملوں پر بی ایم او کی میڈیکل رپورٹ بے معنی ہے۔ عدالت نے ڈی سی ایس ایم یاسین کی اس رپورٹ کو بھی مسترد کر دیا جس میں دعویٰ کیا گیا تھا کہ اس کی مناسب تحقیقات نہیں کی گئیں۔ بی ایم او نے 15 اور 21 مارچ 1991ء کو 32 خواتین کا طبی معائنہ کیا تھا اور اس میں اجتماعی عصمت دری کی تصدیق ہوئی تھی، جس

میں تین نابالغ بھی شامل تھے۔ میڈیکل رپورٹس میں واضح طور پر بتایا گیا ہے کہ 32 خواتین کے جسم کے نچلے حصے، رانوں، پیٹ، کولہوں اور سینے پر زخم تھے۔ کئی کیسز میں عورتوں کے مخصوص حصے کے زخم کو ٹھیک کرنے کی بھی اطلاع دی گئی تھی۔ بی ایم او کے خطوط کے مطابق جو عورتوں کے طبی معائنے پر مبنی ہیں، تقریباً 26 دن پہلے تمام خواتین کے ساتھ کئی بار جبراً زیادتی کی اطلاع ملی ہے۔

عمومی طور پر کسی اور معلومات کی عدم موجودگی میں، ورگیس رپورٹ کے جھوٹ اور غلط بیانی نے ''کنن پوش پورہ'' کیس کے بارے میں بہت سے عام خرافات کو جنم دیا، کہ 'شکایت کا باضابطہ اندراج تاخیر سے ہوا، یا، 'طبی شواہد سے پتہ چلتا ہے کہ اجتماعی عصمت دری نہیں ہوئی تھی'، اور' گاؤں والوں' اور اس رات کے ابتدائی سرکاری بیانات ابہام اور تضادات سے بھرے ہوئے ہیں۔' انہی غلط بیانیوں کو ڈائریکٹر آف پراسیکیوشن نے 1991ء میں اس بات پر یقین کرنے کی وجوہات کے طور پر (پولیس فائل میں) دہرایا تھا کہ اس کیس کو بند کر دیا جانا چاہیے اور حال ہی میں پچھلے سال کی طرح، جب پولیس نے کپواڑہ مجسٹریٹ کے سامنے دلیل دی کہ کیس کو بند کر دیا جانا چاہیے۔ لہٰذا یہ کہنا سچ نہیں ہے کہ بی جی ورگیس کی رپورٹ محض ایک غیر سرکاری دستاویز تھی جس کا کوئی قانونی جواز نہیں تھا۔ انہوں نے ایک جج اور پراسیکیوٹر کے طور پر کام کیا اور ان کی جھوٹی لیکن بااثر رپورٹ نے نہ صرف اس کیس کے بارے میں عوامی تاثر کو بری طرح متاثر کیا بلکہ متاثرین کے انصاف اور سچائی کے قانونی حقوق کو بھی بری طرح متاثر کیا۔

مسٹر ورگیس کی طرف سے یہ بھی غیر اخلاقی اور بدقسمت، یہاں تک کہ مجرمانہ بات بھی تھی کہ انہوں نے عصمت دری کے متاثرین کی رازداری کو برقرار نہیں رکھا، انہوں نے کھلے عام ان کے حقیقی ناموں کا استعمال کیا اور ایسا لگتا ہے کہ یہ جان بوجھ کر کیا گیا ہے جس کا مقصد بظاہر زندہ بچ جانے والوں کو شرمندہ کرنا تھا۔ یہاں تک کہ اپنے حالیہ مضامین

میں بھی جہاں اگرچہ انہوں نے اصل ناموں کا استعمال نہیں کیا مگر متاثرین کے بارے میں مخصوص شناختی معلومات کا استعمال کیا جو قانون اور صحافتی اخلاقیات کے خلاف ہے۔

مسٹر ورگیس ہمیشہ ایک ویڈیو کیسٹ کا ذکر کرتے ہیں جو انسانی حقوق کے ذرائع کے ذریعے کمیٹی تک پہنچی تھی جو بظاہر 'علیحدگی پسند گروہوں' کی طرف سے پہنچی تھی لیکن ایسا لگتا ہے کہ یہ ان کی بنائی ہوئی ایک اور دھواں دار سکرین ہے، کیونکہ کیسٹ کے بارے میں فراہم کردہ معلومات ان کی مختلف تحریروں میں اتنی مبہم اور متضاد ہیں کہ اس کی تصدیق کرنا ناممکن ہے۔

پی سی آئی کی رپورٹ کی ساکھ پر بہت سے صحافیوں، کارکنوں، بیوروکریٹس اور انسانی حقوق کی تنظیموں نے بڑے پیمانے پر سوالات اٹھائے ہیں۔ یہاں تک کہ بین الاقوامی شہرت یافتہ ہیومن رائٹس واچ نے بھی پی سی آئی کی رپورٹ پر شدید تنقید کی اور کنن پوش پورہ کیس کی تحقیقات کے لئے مضبوط بنیاد تلاش کی۔ ہیومن رائٹس واچ نے مشاہدہ کیا:

''اگرچہ طبی معائنے کے نتائج بذات خود عصمت دری کے الزامات کو ثابت نہیں کر سکے، لیکن انہوں نے کنن پوش پورہ میں فوج کی کارروائیوں کے بارے میں سنگین سوالات اٹھائے۔ ان حالات میں کمیٹی کی جانب سے ایسے کسی بھی ثبوت کو مسترد کرنے کی خواہش انتہائی پریشان کن ہے جو حکومت کے بیان سے متصادم ہو۔ آخر میں، کمیٹی کی رپورٹ حقیقت کو بے نقاب کرنے کے بجائے ملکی اور بین الاقوامی تنقید کا مقابلہ کرنے کے بارے میں کہیں زیادہ فکرمند ہونے کا انکشاف کرتی ہے''۔

ایشیا واچ نے تحقیقات کے درست ہونے پر بھی سوالات اٹھائے ہیں۔ انہوں نے کہا: ''کشمیر میں فوجی اور سرکاری حکام نے جس سنجیدگی کے ساتھ عصمت دری کے الزامات کو مسترد کیا اور اس طریقہ کار پر عمل کرنے میں ان کی ناکامی جس سے کسی بھی مقدمے کے لئے اہم ثبوت فراہم ہوں، خاص طور پر مبینہ عصمت دری کے متاثرین کا فوری

طبی معائنے جیسے معاملات اس حوالے سے تحقیقات کی معتبریت کے متعلق سنگین سوالات کو جنم دیتے ہیں''، ممکنہ پردہ پوشی کے شواہد کو مدنظر رکھتے ہوئے، سرکاری اور پریس کونسل کی تحقیقات دونوں اس واقعے میں حقائق کو ثابت کرنے اور جرم کا تعین کرنے کے لئے ضروری اقدامات سے عاری دکھائی دیتی ہیں''۔

اس رپورٹ کے اقتباسات اس وقت بھارتی پریس میں بڑے پیمانے پر شائع ہوئے تھے اور سری نگر میں قائم جرنلسٹس ایسوسی ایشن نے اس کے مواد کے بارے میں شکوک وشبہات کا اظہار کیا تھا۔ ستمبر 1991ء میں، گروپ نے پی سی آئی کو ایک جوابی خط لکھا۔ اس کے جواب میں انہوں نے رپورٹ کی صداقت اور معروضیت کے بارے میں سنگین شکوک وشبہات کا اظہار کرتے ہوئے کہا ہے کہ:

''پریس کونسل کی رپورٹ پر مسٹر بی جارج ورگیس، جناب کے وکرم راؤ اور مسٹر جمنا داس اختر کے دستخط ہونے تھے۔ ہمارے پاس اس بات پر یقین کرنے کی وجوہات ہیں کہ مسٹر جمنا داس اختر سری نگر آئے ہی نہیں تھے۔ ہمارے پاس یہ یقین کرنے کی وجوہات بھی ہیں کہ دیگر ارکان نے ''کنن پوش پورہ'' کا دورہ ہی نہیں کیا۔ پریس کونسل کی ذیلی کمیٹی کے یہ دونوں ارکان کشمیر میں قیام کے پورے عرصے تک گیسٹ ہاؤس میں رہے، اس سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ وہ موقع پر حقائق جاننے کے بجائے ریاستی مہمان نوازی کے بارے میں زیادہ فکر مند تھے''۔

جون 2013ء میں جے کے سی سی ایس اور ایس جی کے پی کے زیر اہتمام ایک عوامی جلسے میں، تحقیقات دوبارہ شروع ہونے کے فوراً بعد، ''کنن پوشپورہ'' کے متاثرین نے اپنے مصائب، غصے اور انصاف کے لئے لڑنے کے عزم کا اظہار کیا۔ سول سوسائٹی کے مقررین نے بی جی ورگیس پر ''کنن پوش پورہ'' میں تشدد کی سرگرم حوصلہ افزائی کرنے کا الزام عائد کیا۔ جے کے سی ایس اور ایس جی کے پی کی جانب سے جاری بیان میں مزید

کہا گیا ہے کہ ''کنن پوش پورہ'' کیس کو دوبارہ کھولنے کا مطلب یہ بھی ہے کہ ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین کو بدنام کرنے اور چھپانے میں ملوث افراد نے جھوٹ بولا ہے۔ یہ طے کیا گیا کہ بی جی ورگیس کا سماجی اور پیشہ ورانہ بائیکاٹ کیا جائے۔ انہوں نے ہندوستان اور جموں وکشمیر میں سول سوسائٹی گروپوں اور باشعور شہریوں پر بھی زور دیا کہ وہ اس وقت تک بی جی ورگیس کا بائیکاٹ کریں جب تک کہ ''کنن پوش پورہ'' کیس میں ان کے کردار پر ان کے خلاف مقدمہ نہ چلایا جائے۔ بائیکاٹ کی مہم کا مقصد ورگیس اور اس کے جھوٹ کو بے نقاب کرنا تھا''۔

جے کے سی ایس ایس اور ایس جی کے پی نے 23 فروری 2014ء کو اس واقعے کو 23 واں سال مکمل ہونے کو کشمیری خواتین کی مزاحمت کے دن کے طور پر منانے کا فیصلہ کیا۔ یہ کام ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین اور جموں وکشمیر کی دیگر تمام خواتین کے ساتھ غیر مشروط حمایت اور اظہار یکجہتی کے لئے کیا گیا تھا جو قابض افواج کے ہاتھوں متاثر ہوئی ہیں اور لڑنے کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہیں۔

کپواڑہ کے ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین، جو الزامات کی تحقیقات کے لئے جڑواں گاؤں کا دورہ کرنے والے پہلے افسر تھے، کو فوج نے اپنی رپورٹ لکھنے پر دھمکی دی تھی، اور بی جی ورگیس نے ان سے پوچھ گچھ بھی کی تھی۔ کشمیری خواتین کے یوم مزاحمت کے موقع پر اپنی تقریر میں ایس ایم یاسین نے کہا کہ ''بی جی ورگیس وہ پہلے شخص تھے جنہوں نے جرم کے بعد فوجیوں کو کلین چٹ دی۔ انہوں نے مزید کہا کہ کشمیر کے دورے کے دوران ورگیس نے ان سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی جس میں انہوں نے کہا، 'ڈی سی صاحب، یہ کیا آپ نے لکھا ہے۔ کوئی ریپ نہیں ہوا ہے۔ یہ کیا لگا رکھا ہے؟''

ڈپٹی کمشنر کی تقریر کے جواب میں بی جی ورگیس نے 14 مارچ 2014ء کو انڈین ایکسپریس میں شائع ہونے والے ایک مضمون میں لکھا کہ 'یہ شخص فروری 1991ء

میں اپنی سرکاری ذمہ داریوں سے محروم ہو گیا تھا، ممکنہ طور پر عسکریت پسندوں کی انتقامی کارروائیوں کے خوف سے، جو معمول بن چکی تھیں یہ خاموش رہا لیکن اب شیر کی طرح گرجنے لگا ہے''۔ پوری انکوائری کے دوران ڈپٹی کمشنر کپواڑہ کے علاوہ کسی ایک فرد نے بھی مظلوم لوگوں کے حق میں بات نہیں کی بلکہ سب نے فوج کو بے گناہ ثابت کیا اور الٹا ''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین کو ہی مورد الزام ٹھہرایا کہ یہ سب تو ریاست بھارت اور فوج کے ادارے کو بدنام کرنے اور آتنک بادیوں کی سازش کا حصہ ہے تاکہ مقبوضہ جموں و کشمیر میں انسانی حقوق کا مسئلہ کھڑا کیا جاسکے۔ یہ ہے بھارت کا ریاستی انصاف اور مظلوم کشمیریوں کے مسائل جو کبھی حل ہونے والے نہیں۔

☆......☆

ریاست اور عدلیہ کا کردار

قانونی عمل میں تاخیر اور اسے زیادہ تر غیر نتیجہ خیز رکھ کر حکومت نے اس بات کو یقینی بنانے کی کوشش کی کہ انصاف کے متلاشی افراد تھک جائیں اور سچائی دفن ہو جائے۔ گاؤں والوں کی کوششوں اور عوامی ناراضگی کی وجہ سے مارچ 1991ء میں تحقیقات کا آغاز کیا گیا تھا لیکن مقامی تفتیشی افسر فاروق شاہ، جو بیانات ریکارڈ کرکے، کریک ڈاؤن میں تعینات فوجی اہلکاروں کے ناموں سمیت ثبوت جمع کرکے تحقیقات میں دلچسپی لے رہے تھے، کی جگہ انڈین پولیس سروسز کی جانب سے ایک اور افسر دلباغ سنگھ نے لے لی۔ چند مہینوں کے اندر ہی ایک نئی ایس آئی ٹی (اسپیشل انویسٹی گیشن ٹیم) تشکیل دی گئی، جس نے معاملے کی دوبارہ جانچ شروع کر دی۔ اکتوبر 1991ء میں، جب تفتیش تقریباً مکمل ہو چکی تھی، اور ''کنن پوش پورہ'' کے لوگ فوجداری مقدمہ شروع ہونے کا انتظار کر رہے تھے، ڈائریکٹر آف پراسیکیوشن نے ایک خفیہ خط لکھا جس کی بنیاد پر پولیس نے کیس کو 'سراغ نہ ملنے کی بنیاد پر' بند کر دیا۔

ڈائریکٹر پراسیکیوشن نے دعویٰ کیا کہ یہ کیس فوجداری مقدمہ چلانے کی اہلیت سے محروم ہے۔ 22 سال تک عدالت میں کوئی چارج شیٹ، اسٹیٹس رپورٹ یا باضابطہ کیس بندش کی رپورٹ پیش نہیں کی گئی، اس لیے گاؤں والوں کو جان بوجھ کر تفتیش کے مستقبل کے بارے میں اندھیرے میں چھوڑ دیا گیا۔ اس واقعہ کے بعد تقریباً 10 سال تک، گاؤں والوں کو یہ خیال تھا کہ اس معاملے کی جانچ پڑتال ابھی جاری ہے۔ فوج کی طرف سے انتقامی کارروائی کا خوف بھی تھا جس نے گاؤں والوں کو پولیس سے معاملے کی صورتحال کے بارے میں وضاحت یا تازہ ترین معلومات حاصل کرنے سے روکے رکھا۔

سال 2004ء میں عصمت دری کا نشانہ بننے والی ایک خاتون نے ہمت اور وسائل جمع کر کے جموں وکشمیر اسٹیٹ ہیومن رائٹس کمیشن (جے کے ایس ایچ آر سی) کا رخ کیا اور مناسب طریقے سے تفتیش کا مطالبہ کیا۔ اس کی اس کوشش نے دوسروں کے لیے مثال قائم کی۔ اپنی جدوجہد کو زیادہ موثر بنانے کے لئے بہت سے دیگر متاثرین نے ان کا ساتھ دیا۔

گاؤں کے عمائدین شریف الدین شیخ، رحیم ڈار اور 34 زندہ بچ جانے والوں نے انصاف کی جدوجہد کو منظم کرنے کے لئے ایک گاؤں کمیٹی تشکیل دی اور 2007ء میں جے کے ایس ایچ آر سی سے رجوع کیا۔ ان کی مسلسل جدوجہد نے جے کے ایس ایچ آر سی پر دباؤ ڈالنے میں مدد کی اور جسٹس بشیر الدین نے 16 اکتوبر 2011ء کو ان کے حق میں ایک حکم جاری کیا۔ (اتفاق سے اسی دن دفن کیے گئے شواہد کے ایک اور معاملے میں بھی کشمیر میں اجتماعی قبروں کے معاملے کی تحقیقات کا حکم دیا گیا تھا۔ جس وقت یہ حکم جاری ہوا اس وقت تک شریف الدین شیخ فوت ہو چکے تھے۔

تحقیقات کے دوران جے کے ایس ایچ آر سی نے کشمیر زون کے انسپکٹر جنرل آف پولیس سے رپورٹ طلب کی۔ 4 راجپوتانہ رائفلز 68 بریگیڈ کے کمانڈنگ آفیسر۔ ایڈیشنل ڈائریکٹر جنرل آف پولیس (ڈی جی پی)، سی آئی ڈی برانچ۔ شروعات میں ڈی جی پی نے جے کے ایس ایچ آر سی کو ایک رپورٹ پیش کر کے معاملہ ختم کرنے کی کوشش کی جس میں صرف یہ کہا گیا تھا کہ کیس کو سراغ نہ ملنے کی وجہ سے بند کر دیا گیا ہے کیوں کہ یہ ملزمین کے خلاف فوجداری مقدمہ چلانے کے قابل نہیں پایا گیا تھا۔ تاہم مئی 2010ء میں، ڈی جی پی نے آخر کار ایک رپورٹ پیش کی جس میں اس بات کی تصدیق کی گئی کہ 23-24 فروری 1991ء کی درمیانی رات کو فوجی اہلکاروں نے گاؤں کا محاصرہ کیا اور مردوں کو ان کے گھروں سے باہر نکالا گیا اور خواتین سے پوچھ گچھ کی گئی۔ حیران کن طور پر ڈی جی پی نے یہ بھی تسلیم کیا کہ ریپ متاثرین کی میڈیکل رپورٹ (جو اس وقت عوامی طور پر قابل رسائی نہیں تھی) نے

'تشدد اور 'ریپ' کے الزامات کو درست ثابت کیا۔ رپورٹ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ تحقیقات کے دوران کسی بھی فوجی اہلکار کی شناختی پریڈ نہیں کی گئی اور اس کے نتیجے کے طور پر کیس کو سراغ نہ ملنے کا عذر پیش کر کے بند کر دیا گیا۔

جسٹس بشیر الدین کی سربراہی میں جے کے ایس ایچ آر سی اپنی تحقیقات مکمل کرنے، خواتین کے بیانات ریکارڈ کرنے اور ان کی میڈیکل رپورٹس حاصل کرنے کے بعد اس نتیجے پر پہنچی کہ 1991ء میں ''کنن پوش پورہ'' میں 4 راجپوتانا رائفلز کے فوجی اہلکاروں نے کم از کم 36 خواتین کی عصمت دری کی تھی۔ چوں کہ کوئی عسکریت پسند پکڑا نہیں گیا تھا اور گاؤں میں کوئی فائرنگ نہیں ہوئی تھی، اس لیے جے کے ایس ایچ آر سی کے فیصلے میں کہا گیا ہے کہ 'دراصل ریاستی فورسز ''کنن پوش پورہ'' گاؤں کی تمام خواتین کی عصمت دری کے لئے آئی تھیں اور کسی عسکریت پسند کا صفایا کرنے کے لیے گاؤں کا محاصرہ نہیں کیا تھا۔

جے کے ایس ایچ آر سی نے تفتیش میں خلل ڈالنے اور تحقیقات مکمل کیے بغیر کیس بند کرنے پر ڈائریکٹر آف پراسیکیوشن کو بھی ذمہ دار ٹھہرایا۔ جے کے ایس ایچ آر سی کے فیصلے کے احکامات میں عصمت دری کے 40 متاثرین میں سے ہر ایک کو کم از کم دو لاکھ روپے معاوضہ دینا شامل تھا۔ معاوضے کے علاوہ جے کے ایس ایچ آر سی نے سفارش کی ہے کہ سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس (ایس ایس پی) سے کم رینک کے افسر کی سربراہی میں خصوصی تحقیقاتی ٹیم (ایس آئی ٹی) کے ذریعے دوبارہ جانچ کی جائے اور ایک مقررہ مدت کے اندر تحقیقات کو بغیر کسی تاخیر اور رکاوٹ کے منطقی انجام تک پہنچایا جائے۔ حکومت جموں وکشمیر نے جے کے ایس ایچ آر سی کی سفارشات کے سلسلے میں کوئی کارروائی نہیں کی۔ اس کے علاوہ جموں وکشمیر پروٹیکشن آف ہیومن رائٹس ایکٹ، 1997ء کی دفعہ 19(5) کے تحت ایسا کرنے کی ذمہ داری کے باوجود جے کے ایس ایچ آر سی کے سامنے کوئی 'کاروائی رپورٹ' جمع نہیں کرائی گئی۔

☆......☆

معاوضہ/ تلافی کی سیاست

جب ہم مئی 2013ء میں پہلی بار ''کنن پوش پورہ'' گئے تا کہ گاؤں والوں کو ہائی کورٹ میں دائر کی گئی مفاد عامہ کی عرضی (پی آئی ایل) کے بارے میں مطلع کرسکیں، تو گاؤں والوں نے ہمیں بتایا کہ جے کے ایس ایچ آر سی کی سفارش کے مطابق عصمت دری کا شکار 39 متاثرین کو معاوضے کے طور پر ایک لاکھ روپے ملے ہیں۔ ہائی کورٹ میں دائر کی گئی پی آئی ایل کی تیسری سماعت پر وکیل پرویز امروز نے ججوں کو بتایا کہ متاثرین کو معاوضے کے طور پر ایک ایک لاکھ روپے ملے ہیں، حالاں کہ جے کے ایس ایچ آر سی کے فیصلے میں کم از کم دو لاکھ روپے کی سفارش کی گئی تھی۔ ججوں نے اس معاملے پر اگلی سماعت میں ایڈووکیٹ جنرل کو سننا چاہا اور انہیں کیس کے ریکارڈ کے ساتھ آنے کو کہا۔ اہم بات یہ ہے کہ ایڈووکیٹ جنرل نے اس بات سے انکار کیا کہ ریپ متاثرین کو کوئی معاوضہ دیا گیا ہے اور مزید کہا کہ ریاست کی طرف سے معاوضے کے معاملے پر تبادلہ خیال کرنے کے لئے ایک میٹنگ طے کی گئی تھی۔

گاؤں والوں سے معاوضے کے اس الجھن بھرے مسئلے کے بارے میں پوچھنے پر، انہوں نے ہمیں بتایا کہ 24 مئی 2012ء کو 39 ریپ متاثرین کو کپواڑہ کے اس وقت کے ایم ایل اے (سابق وزیر قانون)، میر سیف اللہ نے کپواڑہ کے تحصیل دار کی موجودگی میں اپنی سرکاری رہائش گاہ پر ایک لاکھ روپے نقد دیے تھے۔ اس کے علاوہ اس واقعے میں معذور ہونے والے ایک شخص کو 25 ہزار روپے (نقد) دیے گئے۔ عصمت دری سے بچ جانے والے تمام افراد کی تصاویر لی گئیں اور ان سے کہا گیا کہ وہ خود کو بے نقاب کریں۔ انہیں جو رقم دی گئی تھی وہ معاوضے کے نام پر تھی۔ میر سیف اللہ نے انہیں یہ بھی بتایا کہ یہ رقم

وزیر اعلیٰ عمر عبداللہ کی طرف سے آئی تھی اور باقی رقم حکومت کے پاس تھی۔ گاؤں والوں نے جموں میں عمر عبداللہ سے بھی ملاقات کی تھی۔ 39 متاثرین کو معاوضہ فراہم کیا گیا کیوں کہ جے کے ایس ایچ آر سی کی طرف سے بھیجی گئی اصل فہرست میں غلطی سے 40 ویں متاثرہ کو خارج کر دیا گیا تھا۔ گاؤں والوں کے مطابق، فروری 2012ء میں ریپ متاثرین نے جموں میں میر سیف اللہ سے ملاقات کی اور ان سے جے کے ایس ایچ آر سی کے فیصلے پر عمل درآمد کے بارے میں پوچھا۔ میر سیف اللہ نے ان سے وعدہ کیا کہ کارروائی کی جائے گی۔ اپریل 2012ء میں میر سیف اللہ نے انہیں بتایا کہ انہوں نے متاثرین کے لئے فی کس دو لاکھ روپے کے چیک حاصل کرنے کی کوشش کی تھی، لیکن اس پر عمل درآمد نہیں ہوا، اور اس کے بجائے انہیں صرف ایک لاکھ روپے دیئے جائیں گے۔ مارچ 2014ء میں، ایک آر ٹی آئی درخواست کے جواب میں، جموں وکشمیر حکومت کے محکمہ داخلہ نے کہا کہ عصمت دری کے متاثرین کو کوئی معاوضہ/ ریلیف نہیں دی گئی ہے۔ 1991ء میں جموں وکشمیر میں کسی معاملے کی تلافی کے طور پر کوئی ایسی اسکیم موجود نہیں تھی۔

ریپ متاثرین کو ایک لاکھ روپے کیوں دیے گئے، یہ اب بھی ایک معمہ ہے۔ پیسہ کہاں سے آیا؟ کیا یہ زندہ بچ جانے والوں کو خریدنے اور ان کی زبان بند رکھنے کو یقینی بنانے کے لئے دیا گیا تھا؟ کیا یہ عصمت دری کا نشانہ بننے والوں کے لئے ایک اشارہ تھا کہ انہیں اپنے خون، عزت اور عصمت کی قیمت ملی ہے اور انہیں مزید تحقیقات کا مطالبہ نہیں کرنا چاہئے؟

جنوری 2014ء میں، ہم نے جے کے ایس ایچ آر سی سے ''کنن پوش پورہ'' معاملے سے متعلق دستاویزات تک رسائی کے لیے درخواست دی، جس میں عصمت دری سے متاثرہ عورتوں کی گواہی اور میڈیکل رپورٹس بھی شامل ہیں۔ بار بار ان کے دفاتر جانے اور اپنی درخواست کے پیچھے لگے رہنے کے بعد بھی ہمیں جے کے ایس ایچ آر سی سے

دستاویزات حاصل کرنے میں پانچ مہینے لگے۔ دستاویزات حاصل کرنے کی کوشش میں ہمیں ان گنت بار بتایا گیا کہ اس دفن شدہ کیس کو آگے بڑھانا بیکار ہے۔ جے کے ایس ایچ آر سی کے عہدیداروں نے ایسا کام کیا جیسے وہ اس معاملے میں حتمی اتھارٹی ہوں، متاثرین کے بارے میں انتہائی توہین آمیز الفاظ میں بات کر رہے ہوں، اور ایسا لگتا ہے کہ وہ ہم پر ہنس رہے ہیں کہ وہ 'سادہ لوح' ہیں اور متاثرین پر دل سے یقین کر سکتے ہیں۔ عصمت دری کا شکار 31 خواتین کا معاملہ ابھی بھی جے کے ایس ایچ آر سی میں زیر التوا ہے۔ ایسا لگتا ہے کہ جے کے ایس ایچ آر سی کے عہدیداران ریپ متاثرین اور ان کی شہادتوں پر یقین نہیں کرتے ہیں، اور محسوس کرتے ہیں کہ وہ صرف معاوضے کے طلب گار ہیں۔

ایک دن، ہم میں سے دو اراکین جے کے ایس ایچ آر سی کے دفتر میں تھے اور ہماری ایک افسر کے ساتھ پریشان کن ملاقات ہوئی، جس نے دعویٰ کیا کہ ہماری تحریری درخواست، جو کئی ہفتے پہلے جمع کرائی گئی تھی، کہیں بھی ریکارڈ پر نہیں ہے۔ ہم کوریڈور سے گزر رہے تھے اور بے کار افسروں اور عدالتوں اور ریاستی اداروں کی عمومی نوعیت کے بارے میں اپنی مایوسی کا گلہ کر رہے تھے کہ اچانک ہم نے کوریڈور میں ''کنن پوش پورہ'' کے دو بزرگ متاثرین کو دیکھا۔ وہ اپنے گاؤں سے اکیلے، تین سے چار گھنٹے کے سفر کے بعد، اپنے کیس کی پیروی کے لیے وہاں آئے تھے۔ ہم عاجزی محسوس کر رہے تھے۔ سری نگر سے تعلق رکھنے والی دو تعلیم یافتہ خواتین کو اگر محض پانچ ماہ کے مختصر عرصے کے بعد یہ قانونی عمل اتنا ہی معاندانہ اور مایوس کن لگ رہا تھا تو ان لوگوں کے کیا احساسات ہوں گے جو گزشتہ 23 سال سے اس بدترین سسٹم کو بھگت رہے تھے؟ وہ دیہاتی ہیں سادہ بھی ہیں اور انہیں بہت دور سے آنا پڑتا ہے اور شام کو واپس بھی جانا پڑتا ہے مگر پھر بھی وہ ایسا کرتے ہیں کیوں کہ وہ اس معاملے کو حل کرنا چاہتے ہیں اور گناہ گاروں کو سزا دلانا چاہتے ہیں مگر یہ یہاں ممکن نہیں پھر بھی وہ اپنی سی کوشش کرتے ہیں۔

☆......☆

کنن پوش پورہ

مصنف۔ بشیر سدوزوی

آٹھواں حصہ

''کنن پوش پورہ'' یاد ہے

''یادداشت ظلم کے خلاف ہمارا ہتھیار ہے''

لاعلمی ایسا مزہ ہے جس کا کوئی مظلوم متحمل نہیں ہوسکتا، پھر بھی میں (افراح بٹ) یہ باب تحریر کرنے کے دوران ایسے لوگوں سے ملی ہوں جن کا کہنا تھا کہ وہ اسے بھولنا چاہتے ہیں کیونکہ یاد رکھنے سے انہیں مزید تکلیف کے سوا کچھ نہیں ملے گا۔ کشمیر کے لوگ برسوں سے اذیت اور غفلت کا شکار ہیں، جس کی وجہ سے وہ خود کو نا قابل سماعت متاثرین کے طور پر دیکھتے ہیں۔ کشمیری عوام کو جس غیر انسانی سلوک اور جبر کا نشانہ بنایا گیا ہے اس نے ان کے مزاج میں تلخی اور بدگمانی گھول دی ہے۔ ہر موت، گمشدگی، عصمت دری یا ظلم ہماری مایوسی کو مزید بڑھاوا دینے کا محرک بنتا ہے۔ ہمارے ماضی کی تمام یادیں عکس کی صورت میں ہماری نظروں کے سامنے گھومتی محسوس ہوتی ہیں۔ جبر کے خلاف یادیں مزاحمت کا ایک اہم حصہ ہیں۔ آزادی کا خواب اس دن دم توڑ جائے گا جب لوگ اپنے تکلیف دہ ماضی کو یاد کرنا چھوڑ دیں گے۔

لوگ کہتے ہیں کہ وقت تمام زخموں کو بھر دیتا ہے۔ میں اس سے متفق نہیں ہوں، زخموں سے بہتا خون منجمد ہوسکتا ہے مگر اس کے نشان کبھی نہیں مٹتے، بے شک وقت کے ساتھ درد میں کمی آ جاتی ہے لیکن یہ زخم نشان زدہ خلیوں سے ڈھکے اپنی جگہ باقی رہتے ہیں اور جب لوگ ان زخموں کو کریدتے ہیں تو ان سے دوبارہ خون بہنے لگتا ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ دبی ہوئی یادیں درست ہیں یا نہیں کیوں کہ ایسی یادوں کو یاد کرنا اکثر تکلیف کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ کبھی کبھی، ''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین کے لیے یہ تکلیف اتنی زیادہ ہوتی

ہے کہ وہ اسے بھول جانا پسند کرتے ہیں۔ وقت کے پاس ہمیں مختلف طریقے سے بھلانے یا ہماری یادوں میں اسے زندہ رکھنے کے طریقے ہیں۔ واقعہ کے بعد جو کچھ ہوتا ہے وہ ہماری یادداشت کو تبدیل کر دیتا ہے، بعض اوقات تو ہم خود کو بھی پہچان نہیں پاتے ہیں۔ کچھ واقعات کا صدمہ ہماری یادداشت کی صلاحیت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ جب سپورٹ گروپ فار جسٹس فار کنن پوش پورہ (ایس جی کے پی) کے محققین ریپ متاثرین کے بیانات ریکارڈ کر رہے تھے، تو ہم میں سے ایک نے عصمت دری کا نشانہ بننے والی ایک عورت سے اس رات بجلی کے شیڈول کے بارے میں پوچھا تو اس نے کہا

''یہ واقعہ ہماری پوری زندگی میں اندھیرا کر گیا، مجھے کیسے یاد رہے کہ جب میرے ساتھ یہ سب ہو رہا تھا، اس وقت بجلی تھی یا نہیں؟''۔

ماضی کے کسی بھی واقعے کو یاد کرتے وقت، یادداشت کو ایک مثبت طاقت کے طور پر کام کرنا چاہئے۔ جن لوگوں نے تکلیف برداشت کی ہے، شرم یا نتائج کے خوف سے اپنے درد کے بارے میں بات کرنے میں ہچکچاہٹ کا احساس اور زبان کھولنے کی صورت میں اس کے نتائج بھگتنا، یہ تمام چیزیں مل کر اس حقیقت کو واضح کرتی ہیں کہ یادیں کبھی کبھی اندھیرے میں گم ہو جاتی ہیں لیکن ہمیشہ کے لئے گم ہونے سے پہلے انہیں بچانے کی ضرورت ہے۔ مثال کے طور پر ''کنن پوش پورہ'' کے مردوں پر وحشیانہ تشدد تاریخ کے صفحات سے تقریباً غائب ہو چکا ہے۔ کتنے لوگ جانتے ہیں کہ عورتوں کی عصمت دری کے علاوہ، گاؤں کے مردوں کو بھی خوفناک جسمانی تشدد کا سامنا کرنا پڑا تھا؟ خاص طور پر جموں و کشمیر کے عوام کے مرکز بیس کیمپ آزاد کشمیر کے حکمرانوں اور عوام کو تو بالکل ہی نہیں خبر کہ ان کے بہن بھائیوں پر کیا قیامت ٹوٹ پڑی ہے؟

متاثرین کے علاوہ وہ کون لوگ ہیں جو اس لمحے سے گزرے، جنہوں نے اس کا تجربہ کیا، اور جن کے پاس اس کی یادیں ہیں؟ انہیں کیا یاد ہے؟ وہ کیا بھولنا پسند کریں گے؟

یا اس کے بارے میں بات نہیں کرتے؟ اس باب میں، میں نے متاثرین کے علاوہ دوسرے لوگوں سے بات کر کے کنن پوش پورہ کی متوازی یادیں زندہ کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جنہوں نے ماضی میں اس واقعے کے بارے میں بات کی ہے، اور ساتھ ہی وہ لوگ بھی ہیں جنہوں نے اس کے بارے میں کبھی بات نہیں کی ہے۔ کچھ لوگوں سے میں نے رابطہ کیا انہوں نے کہا کہ وہ اپنی یادوں اور واقعات میں اپنے کردار کے بارے میں بات نہیں کرنا چاہتے۔ کچھ لوگوں نے مجھ سے بات کی، لیکن اس سخت شرط پر کہ کتاب میں ان کا حوالہ نہ دیا جائے۔ غیر رسمی بات چیت میں کھل کر بات کرنے والے دوسرے لوگوں نے کہا کہ وہ چاہتے ہیں کہ ان کی کہانی کے کچھ حصے 'آف دی ریکارڈ' ہوں، یا یہ کہ ان کا حوالہ گمنام طور پر بھی نہیں دیا جانا چاہیے۔ ''کنن پوش پورہ'' کی یادوں کے ارد گرد خاموشی کی پرتیں 52 سال بعد بھی اتنی ہی قوی ہیں۔ یہ باب گم شدہ دستاویزات، جلے ہوئے کاغذات اور مسخ شدہ تاریخ سے بھرا ہوا ہے۔ یہ آسیب زدہ آوازوں سے رقم ہے جنہیں خاموش کر دیا گیا ہے، دوسری آوازیں جو اٹھی ضرور ہیں لیکن سنی نہیں گئیں اور وہ لوگ بھی جو آج تک نہیں بولے۔

☆......☆

پراسرار ڈائری

اپریل 2014ء میں، ایس جی کے پی کی تشکیل کے ٹھیک ایک سال بعد، ہماری ملاقات کپواڑہ کے اس وقت کے تحصیل دار (ریونیو ایڈمنسٹریٹو آفیسر) محمد سکندر ملک سے ہوئی۔ یاد رکھنے والے لوگوں سے مزید جاننے کی جستجو میں، ہم نے رابطوں کا ایک سلسلہ کھول دیا اور ہمیں ہر بار نئے چہروں کی طرف راغب کیا گیا۔ ہمیں سکندر ملک کے بارے میں کپواڑہ سیشن کورٹ میں ایک نوجوان وکیل کے ذریعے پتہ چلا، جہاں ہم سماعت کے لیے مہینے میں کم از کم ایک بار جاتے تھے۔ وکیل ان کا بھتیجا تھا۔ بعد میں ہمیں ان کے بیٹے کے بارے میں پتہ چلا جو ہائی کورٹ میں وکیل بھی ہے اور آخر کار ہم نے سکندر ملک سے اس کے بیٹے کے ذریعے رابطہ کیا۔ مئی 1992ء میں ریٹائر ہونے والے، تحصیلدار ملک محمد سکندر، جو آرٹس گریجویٹ ہیں، ''کنن اور پوش پورہ'' سے بمشکل چھ کلومیٹر دور، ترہ گام گاؤں کے رہنے والے ہیں۔

سکندر ملک سے میری پہلی ملاقات جموں وکشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی ایس) کے دفتر میں ہوئی۔ ایڈوکیٹ پرویز امروز نے سری نگر کی نچلی عدالت میں اس بزرگ شخص سے ملاقات کی تھی اور وہ اسے اپنے ساتھ دفتر لے آئے تھے۔ دفتر میں داخل ہوتے ہی آہستہ آہستہ خستہ حال سیڑھیوں پر چلتے ہوئے اور زور زور سے سانس لیتے ہوئے انہوں نے کمرے میں کام کرنے والے ہم سب سے کہا کہ ایک بوڑھے شخص کو پرویز صاحب نے اغوا کر کے کسی نامعلوم مقام پر پہنچا دیا ہے۔ میں نے مڑ کر دیکھا کہ ایک بوڑھا شخص جس کی داڑھی برف کی طرح سفید ہے، قراقلی ٹوپی پہنے چہرے پر دلکش مسکراہٹ لئے

نیلے رنگ کے چمک دار عصا کی مدد سے چل رہا تھا۔ انہوں نے ہم سب کے نام یاد کرنے کی کوشش کی اور سر ہلایا جب کہ پرویز صاحب نے انہیں سب لوگوں کے سامنے ایک کمرے میں بٹھایا۔ اپنے بارے میں زیادہ تفصیلات بتائے بغیر سکندر ملک صاحب نے کنن پوش پورہ کا واقعہ بیان کرتے ہوئے اپنی بات کا آغاز کیا۔ انہوں نے اس کیس کے بارے میں بہت سے حیرت انگیز حقائق بھی منکشف کئے۔

سکندر ملک کو 1991ء میں ضلع کپواڑہ کا تحصیل دار مقرر کیا گیا تھا۔ انہیں کچھ ماہ قبل اسی ضلع سے سری نگر منتقل کر دیا گیا تھا، لیکن چوں کہ کوئی دوسرا شخص سرحدی ضلع میں کام کرنے کو تیار نہیں تھا، اس لیے انہیں دوبارہ وہی ذمہ داری سونپی گئی۔ وہ راضی ہو گئے کیوں کہ ان کا گھر ترہ گام کے مقامی گاؤں میں تھا۔ انہوں نے یاد کرتے ہوئے کہا، 'کنن کے گاؤں کے چوکیدار جمعہ شیخ میرے رشتہ دار تھے، اس لیے میں انہیں ذاتی طور پر جانتا تھا۔ فروری 1991ء کے اواخر میں ایک برفانی دن کی صبح جمعہ شیخ ان سے ملنے ان کے دفتر آیا تھا۔ ایک مقامی سویلین عہدیدار کی حیثیت سے سکندر ملک کا دعویٰ ہے کہ انہیں پہلے ہی معلوم تھا کہ چند راتوں قبل جڑواں بستیوں میں محاصرے اور تلاشی کی کارروائی ہونی تھی کیوں کہ فوج کی طرف سے انتظامیہ کو اس کی اطلاع دی جانی تھی۔

وہ حیران تھے کہ جمعہ شیخ آپریشن کے فوراً بعد ان کو رپورٹ کرنے نہیں آئے تھے لہٰذا انہوں نے گاؤں کے چوکیدار سے اس بارے میں پوچھ گچھ کی۔ جمعہ شیخ نے کمرے کے چاروں طرف بے چینی سے دیکھا اور اس پر مطمئن ہونے کے بعد کہ دور سے کوئی سننے والا نہیں ہے، اس نے سرگوشی میں کہا کہ وہ انہیں کسی چیز کے بارے میں بتانا چاہتا ہے۔ سکندر ملک کو اس کی بے چینی کا احساس ہوا، لیکن چوکیدار مزید کچھ کہنے سے ہچکچا رہا تھا جس پر سکندر ملک جمعہ کو اپنے ذاتی چیمبر میں لے گئے اور پوچھا کہ معاملہ کیا ہے۔ جمعہ نے تحصیلدار کو بتایا کہ محاصرے اور تلاشی کی کارروائی کے دوران فوج کے جوانوں نے کئی

خواتین کو جنسی زیادتی کا نشانہ بنایا۔اس نے بتایا کہ تمام مردوں کو گھروں سے باہر نکلنے کا حکم دیا گیا اور خواتین کو اندر رہنے دیا گیا۔

تین جگہوں پر جمع ہونے والے ان افراد کو رات بھر بے رحمی سے تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ کچھ گھروں سے چیخوں کی آوازیں سنی گئیں جس نے مردوں کو مشتعل کر دیا اور انہیں شک ہوا کہ فوجی کیا کر رہے ہیں لیکن کسی کو یہ دیکھنے کی اجازت نہیں تھی کہ کیا ہو رہا ہے۔ نماز فجر کے بعد مردوں کو رہا کر دیا گیا اور جب وہ اپنے گھروں میں پہنچے تو انہیں احساس ہوا کہ ان کے گھروں میں موجود تمام خواتین کی عصمت دری کی گئی ہے، جن میں نوعمر لڑکیاں بھی شامل ہیں۔سکندر ملک نے کہا۔

''پہلے تو مجھے جمعہ شیخ پر بہت غصہ آیا۔ میں نے اسی وقت اسے تقریباً فارغ کر دیا تھا۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ وہ فوری طور پر میرے پاس کیوں نہیں آیا۔ جمعہ شیخ اس پر رو پڑا اور وضاحت کی کہ اس کے اپنے خاندان کی خواتین کی عصمت دری کی گئی ہے۔ اس نے یہ بھی کہا کہ گاؤں کے ارد گرد محاصرہ تھا اور کسی کو بھی باہر جانے کی اجازت نہیں تھی۔''

جب انہیں اس محاصرے کے بارے میں پتہ چلا، جو دراصل اسی صبح اٹھایا گیا تھا، تو تحصیل دار نے اپنے الفاظ واپس لے لیے، اس کے بعد تحصیل دار کو یاد آیا کہ کس طرح وہ اور گاؤں کا چوکیدار ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین سے ملنے ڈی سی آفس گئے تھے۔ انہیں یاد ہے کہ ڈی سی نے فوری طور پر کشمیر کے ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کو بتایا، جنہوں نے ڈی سی کو ''کنن پوش پورہ'' کا دورہ کرنے اور موقع پر تحقیقات کرنے کا حکم دیا تاہم اگلے دو دنوں تک شدید برف باری ہوئی اور یہ دورہ 5 مارچ 1991ء کو کیا گیا۔

یہ سڑک صرف ترہ گام تک گاڑی چلانے کے قابل تھی، اس لیے انہیں ''کنن پوش پورہ'' تک پیدل جانا پڑا تھا۔اس کے بعد انہوں نے جمعہ شیخ کے گھر کا دورہ کیا اور کچھ خواتین سے ملاقات کی جنہوں نے اپنی کہانیاں سنائیں۔ جو کچھ ہوا تھا اس کے بارے میں بات

کرتے ہوئے عورتیں غصے میں آ کر جذباتی ہو گئیں۔ انہیں وہ عورت بھی یاد آئی جس نے تقریباً ڈیڑھ ماہ پہلے بچے کو جنم دیا تھا، اس کی عصمت دری کی گئی تھی اور وہ بہت خراب جسمانی حالت میں تھی۔ تحصیل دار نے کچھ دن بعد بارہ مولہ کے اسپیشل کمشنر مسٹر چھنسوک کے ساتھ ''کنن پوش پورہ'' کا دورہ بھی یاد کیا۔ ایس ایم یاسین کے تبادلے کے بعد ان کی جگہ تعینات ہونے والے نئے ڈپٹی کمشنر زرگر نے بھی گاؤں کا دورہ کیا۔

تقریباً چھ ماہ قبل، ڈرگ مالا کا ایک پٹواری (ریونیو کلرک) لاپتہ ہو گیا جس کے متعلق فوجی اہلکاروں کے ہاتھوں ہلاک ہونے کا شبہ تھا۔ سکندر ملک کو اس معاملے کے بارے میں جانکاری کے ساتھ ایک خط ملا تھا۔ انہیں یاد ہے کہ ڈی سی ایس ایم یاسین کے ہمراہ ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ نے ایک ہی تاریخ کو ان دونوں واقعات (یعنی ڈرگ مالا کیس اور کنن پوش پورہ) کے حوالے سے دورہ کیا تھا۔ ڈویژنل کمشنر نے انہیں ترہ گام کے پولیس اسٹیشن میں ایف آئی آر درج کرانے کی ہدایت دی۔ جب ہم نے ان سے صحیح تاریخوں کو یاد کرنے کے لئے کہا، جو کرنا تقریباً ناممکن لگ رہا تھا، تو انہوں نے یونہی اپنی ڈائری کا ذکر کیا۔ ایسا لگتا ہے کہ پچھلے 40 برسوں میں تحصیل دار نے اپنی روزمرہ کی سرگرمیوں کو ایک ڈائری میں درج کیا تھا۔ 'یہ ایک عادت بن گئی ہے،' انہوں نے کہا. 'ریٹائرمنٹ کے بعد بھی میں نے اسے برقرار رکھا ہے۔ اس میں میری تمام ملاقاتیں اور دن بھر کی سرگرمیاں موجود ہیں۔

انہوں نے مذاقاً کہا آج بھی، اگر مجھے کچھ ہوتا ہے، تو میرے گھر والے میری ڈائری پڑھیں گے اور آپ کی تلاش میں آئیں گے! کچھ اور لطیفوں کے بعد کہ ہم ان کی ڈائری کو ان پر الزامات عائد کرنے کے لیے استعمال نہیں کریں گے، وہ فوراً کپواڑہ میں اپنے گھر سے اسے لانے اور ہمیں دکھانے پر راضی ہو گئے۔ ہم یہ سننے کے لئے کافی پر جوش تھے، کیوں کہ ہم نے سوچا کہ چلو اس طرح ہمیں ان ابتدائی چند دنوں میں جو کچھ ہوا تھا اس

کی ایک واضح تصویر مل سکتی ہے۔

تحصیل دار نے اپنی کہانی جاری رکھتے ہوئے کہا، 'کچھ مہینوں کے بعد، مجھے پریس کونسل آف انڈیا (پی سی آئی) کی ایک ٹیم سے ملنے کے لیے 68 ماؤنٹین بریگیڈ، 4 راشٹریہ رائفلز کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر میں بلایا گیا۔ ان کے مطابق اس ملاقات میں فوجی اہلکاروں اور پولیس کے درمیان وہ واحد سویلین افسر تھے اور یہ ایک طرح سے غیر رسمی بات چیت تھی۔ ہیڈ کوارٹر جاتے ہوئے، بیس کے اندر، ان کی ملاقات افسروں کے ایک گروپ سے ہوئی جن میں کرنل دالل (کنن پوش پورہ میں آپریشن کے دوران کمانڈنگ آفیسر) اور ایک میجر شامل تھے، جن کا نام انہیں یاد نہیں تھا۔ تحصیل دار ان سے قبل ازیں ہونے والی بات چیت سے اچھی طرح واقف تھے اور انہوں نے ان سے کہا، ''ہندوستان ایک جمہوری ملک ہے۔ وہ وقت دور نہیں جب آپ یہاں جو بھی جرائم کر رہے ہیں ان کا جواب دینا پڑے گا۔'' تاہم ان کے ساتھ تحصیلدار کا رویہ جارحانہ نہیں تھا اور بات چیت کافی خوشگوار موڈ میں ہوئی۔ انہوں نے ان سے یہ بھی کہا کہ ''انہیں ایسی سرگرمیوں میں ملوث نہیں ہونا چاہیے جن پر انہیں مستقبل میں پچھتانا پڑ سکتا ہے۔'' وہ بی جی ورگیس ٹیم کے ساتھ گاؤں کا دورہ کرنے کو یاد نہیں رکھ سکے حالاں کہ ہم انہیں بتا چکے تھے کہ بی جی ورگیس نے اپنی رپورٹ میں ان کا نام لیا تھا۔

سکندر ملک کے مطابق 1992ء کے اوائل میں انہیں ڈویژنل کمشنر کی جانب سے ایک نوٹ موصول ہوا جس میں انہیں ان کے دفتر میں ان سے ملنے کی ہدایت کی گئی تھی۔ وہ یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ 'مجھے نوٹ کے انداز سے فوری طور پر پتہ چل گیا تھا کہ یہ کوئی عام نوٹ نہیں تھا۔ دفتر پہنچنے کے بعد تحصیل دار سکندر ملک کو ڈویژنل کمشنر نے، جنہیں وہ 'اچھے افسر' اور اپنے ماتحتوں کا خیال کرنے والے اچھے آدمی' کے طور پر یاد کرتے ہیں انہیں بتایا کہ ' کپواڑہ میں تعینات فوج آپ کے خلاف ہے اور یہ کہ اگر آپ کپواڑہ میں

رہتے ہیں تو آپ کے لئے خطرہ ہے۔ انہیں سری نگر یا سوپور منتقل کرنے کی پیش کش کی گئی تھی لیکن انہوں نے انکار کر دیا۔ انہوں نے ڈویژنل کمشنر کو بتایا کہ ان کی جگہ جس کو بھی تعینات کیا جائے گا اسے بھی فوج سے خطرہ ہوگا اور ان کا تبادلہ انتظامیہ کی جانب سے اچھا اقدام نہیں ہوگا۔ اس کے بعد ڈویژنل کمشنر نے ہوم سیکریٹری سے بات کی اور تبادلے کا حکم واپس لے لیا گیا۔ یہ آخری موقع تھا جب انہوں نے اجتماعی عصمت دری اور تشدد کے معاملے کے بارے میں کسی شخص سے بات کی تھی۔

اس بات کی تصدیق کرنے کے بعد کہ وہ اپنی ڈائری کے حوالے سے رابطہ رکھیں گے، سکندر ملک جے کے سی ایس کے دفتر سے چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد ملک صاحب آئے اور ڈائری حوالے کر دی۔ ڈائری کے ہر اندراج میں ان کی روزمرہ کی ملاقاتوں اور حرکات وسکنات کے بارے میں چند سطریں لکھی تھیں، جو شارٹ ہینڈ میں اور مختصراً الفاظوں کے مخففات سے بھری ہوئی تھیں۔ تقریباً ہر جگہ موسم کے حالات کا ذکر موجود تھا۔ ان کی ڈائری میں لکھا ہے کہ انہیں اسی دن یعنی 23 فروری 1991ء کو محاصرے کے بارے میں معلوم ہوا تھا۔ ان کی ڈائری سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ 23 فروری کو، اور 3 اور 4 مارچ کو بھاری برف باری ہوئی تھی، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ڈی سی اور دیگر افسروں کو گاؤں کا دورہ کرنے میں تاخیر کیوں ہوئی۔

23 فروری سے 5 مارچ 1991ء کے درمیان کی تاریخوں پر انہوں نے کئی بار ڈی سی سے ملاقات کا ذکر کیا۔ لیکن وہ اس بارے میں کچھ نہیں بتاتے کہ ان ملاقاتوں میں کیا ہوا، یا انہوں نے کس بارے میں بات کی، جیسا کہ ان کا معمول تھا۔ اتنے محتاط آدمی نے ان ملاقاتوں کے بارے میں کچھ نوٹ کیوں نہیں کیا؟ کیا یہ اتنی خفیہ ملاقات تھی کہ اپنی ڈائری میں بھی نہیں لکھا جا سکتا تھا؟ ان کے اس یقین کے باوجود کہ یہ عصمت دری کے اگلے ہی دن کی بات ہے کیا جمعہ شیخ نے عصمت دری کے چار یا پانچ دن بعد ان سے ملاقات کی تھی؟

بدقسمتی سے اس کیس کے بارے میں بہت کچھ جاننے والے کئی دیگر گواہوں کی طرح جمعہ شیخ کا بھی انتقال ہو چکا ہے۔ لہٰذا ہمیں شاید اس سوال کا جواب کبھی نہ ملے۔

5 مارچ 1991ء کو اپنے ڈائری میں سکندر ملک لکھتے ہیں، ''غیر سویلین حکام کی جانب سے کریک ڈاؤن کے سلسلے میں موقع پر انکوائری کے لیے ڈی سی کے ساتھ کنن گاؤں گئے، شام پانچ بج کر پینتالیس منٹ پر ہیڈ کوارٹر واپسی، عصمت دری کی قسط وغیرہ''۔ ان کی ڈائری کے مطابق، پی سی آئی کی ٹیم نے 11 جون 1991ء کو اسی دن ان سے ملاقات کی۔ اس میں لکھا ہے: '11 جون، 1991ء منگل: صبح 8 بجے پی سی آئی کے ذریعہ کنن کے دورے کے سلسلے میں ڈپٹی ایس پی کے ساتھ ترہ گام سے روانہ ہوئے۔ شام ساڑھے پانچ بجے ڈی سی کے ساتھ بھی ملاقات ہوئی۔ یہ سب سرکاری ٹائم لائن سے مطابقت رکھتے ہیں جو ریکارڈ پر ہے لیکن تحصیل دار کو خود یہ دورہ یاد نہیں ہے، حالاں کہ انھیں یاد ہے کہ دوسری ٹیمیں گاؤں آئی تھیں۔ ہمیں امید تھی کہ تحصیلدار کی ڈائری سے بہت سے راز عیاں ہو جائیں گے لیکن ہمیں احساس ہوا کہ انسانی یادداشت اور یہاں تک کہ انسانی ڈائریاں بھی نا قابل فہم ریکارڈ ہیں۔ وہ صرف ادھورے ٹکڑے ہیں، مکمل مربوط بیانیہ نہیں ہیں۔ فوج کے اتنے سخت حصار اور سکیورٹی میں ادنی درجہ کے سویلین افسران سے اس سے زیادہ کیا توقع رکھی جاسکتی ہے کہ وہ ایسا مواد مہیا کرے جس سے آرمی اہلکاران گرفت میں آئیں ممکن نہیں ہے۔ اگر کوئی ایسا کرنا چاہے تو اس کی زندگی مختصر ہی ہوتی ہے جیسا ''کنن پوش پورہ'' کے مقدمہ میں ہوا کہ کئی چشم دید گواہ کو آرمی نے قتل کروا دیا۔

☆......☆

کس قدر ریا در کھنے کی توقع رکھتے ہیں؟

جس دوسرے شخص سے میری ملاقات ہوئی وہ ڈاکٹر تھا جس نے سب سے پہلے متاثرین کا معائنہ کیا تھا اور ان کے معائنے کی تصدیق کرنے والی طبی دستاویزات جاری کی تھیں جو پولیس کو لکھے گئے خطوط کی شکل میں تھے۔ 15 اور 20 مارچ 1991ء کو کرل پورہ کے بلاک میڈیکل آفیسر (بی ایم او) ڈاکٹر محمد یعقوب مخدومی نے اجتماعی عصمت دری کے 32 متاثرین کا معائنہ کیا۔ ڈاکٹر مخدومی کی رپورٹ کے مطابق، جو پہلے باب میں زیر بحث پولیس فائل میں شامل ہے، کئی خواتین کے 'سینے پر خراشوں ٹھیک اور کولہوں پر ہلکی چوٹیں مندمل ہونے کے نشانات ملے، ایک کیس میں 'چہرے پر دانت سے کاٹنے کے نشان بھی تھے۔ ٹیم کے سربراہ بی جی ورگیس کی جانب سے تیار کردہ پی سی آئی کی رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ:

''اس قدر تاخیر سے ہوئے طبی معائنے سے کچھ بھی ثابت نہیں ہوتا۔ کشمیر میں گاؤں کے لوگوں کے سینے اور پیٹ پر خراشیں آنا عام بات ہے کیوں کہ یہ لوگ شدید ٹھنڈ سے بچنے کیلئے 'کانگڑی' یا جلتے کوئلے والے مٹی کے برتن جسم سے لگاتے ہیں۔ جہاں تک پھٹے ہوئے پردہ بکارت کا تعلق ہے، یہ قدرتی عوامل، چوٹ، شادی سے پہلے جنسی تعلقات، یا ریپ کا نتیجہ ہوسکتا ہے''۔

ورگیس کی دلیل کو طنزیہ انداز میں مسترد کرتے ہوئے شریموئی نندنی گھوش نے حال ہی میں ایک مضمون میں تبصرہ کیا تھا کہ کس طرح کانگڑیوں کو اس الزام تراشی پر غصہ آئے گا:

''بے شک وہ بالی ووڈ اسٹارز کے تیزی سے خود کو جھٹکنے، بری طرح جلنے اور شاید

ایک عجیب قسم کے کینسر کا سبب بنتی ہوں گی مگر میں نے کبھی کوئی ایسی کانگڑی نہیں دیکھی جو چہرے پر بھی کاٹ سکے''۔

حالانکہ پولیس دستاویزات میں اس ڈاکٹر کا نام درج نہیں ہے، جس نے یہ جانچ کی تھی اور صرف اس کے عہدے کا ذکر کیا گیا ہے، گاؤں والوں نے ایک بی ایم او کا حوالہ دیا لیکن تھوڑی پوچھ گچھ کے بعد ہمیں پتہ چلا کہ یہ وہ بی ایم او نہیں تھا جس نے متاثرین کا معائنہ کیا تھا۔ ایک اور میڈیکل افسر نے جو چاہتے تھے کہ ہم اس معاملے میں ان کے کردار کے بارے میں کچھ ظاہر نہ کریں، آخر کار ہمیں ڈاکٹر مخدومی کے گاؤں کے دورے کے بارے میں بتایا۔

منزہ اور میں نے سرینگر کے ناتی پورہ علاقے میں اس وقت کے بی ایم او سے ان کی رہائش گاہ پر ملاقات کی۔ اسی علاقے کی رہنے والی منزہ نے کئی مقامی دکانداروں سے ایک ایسے شخص کے بارے میں پوچھا جو کبھی کرال پورہ کا بی ایم او تھا۔ ہم نے بی ایم او کے ساتھ ایک میٹنگ طے کی اور ایک اتوار اس سے ملنے گئے۔ اگرچہ وہ بہت بوڑھا نہیں تھا، لیکن کمزور نظر آنے والا آدمی ہے۔ اس کا پورا خاندان شائستہ اور مہمان نواز تھا لیکن اس کیس کے بارے میں بات کرنے میں ان کی ہچکچاہٹ واضح تھی۔ شروع میں صورتحال عجیب تھی لیکن کمرے میں ان کے پوتے پوتیوں کی موجودگی ہمارے لئے خوشگوار تھی اور یہ ایک طرح کی آئس بریکر ثابت ہوئی۔

چند ماہ قبل مسٹر ورگیس نے ایک مضمون میں ذکر کیا تھا کہ 'اس معاملے میں ضرورت کے مطابق کوئی میڈیکولیگل رپورٹ داخل نہیں کی گئی تھی' اور اس سے ہمارے ذہنوں میں یہ سوال پیدا ہو گیا تھا کہ کیا بی ایم او کی جانب سے لکھا گیا خط، جس میں خواتین کے زخموں کی وضاحت کی گئی تھی، واحد طبی دستاویز ہے، یا آیا مسٹر ورگیس کسی اور میڈیکل ریکارڈ یا سٹیفکیٹ تک رسائی رکھتے ہیں۔ چوں کہ انہیں ان خفیہ دستاویزات تک سرکاری

رسائی دی گئی تھی جو اس وقت عدالت میں بھی پیش نہیں کی گئی تھیں اس لئے ہم حیران تھے کہ اجتماعی عصمت دری کے معاملے میں کوئی باضابطہ میڈیکولیگل سرٹیفکیٹ کیوں نہیں بنایا گیا حالانکہ پولیس فائل میں بی ایم او کی مہر والی طبی دستاویزات موجود ہیں۔ جب ہم ڈاکٹر مخدومی سے ملے، تو انہیں واضح طور پر یاد تھا کہ انہوں نے ایک پرنٹ شدہ فارم میں مناسب میڈیکولیگل رپورٹس درج کرنے کے بعد پرائمری ہیلتھ سینٹر میں رکھے گئے ایک رجسٹر میں تفصیلات درج کی تھیں۔ وہ یہ سن کر پریشان ہوئے کہ میڈیکولیگل رپورٹس غائب ہیں۔

لیکن بی ایم او ایک بھولا ہوا آدمی لگ رہا تھا۔ یہاں تک کہ وہ اس پہلی ملاقات کے بارے میں بھی بھول گئے تھے جسے ہڑتال کی وجہ سے دوبارہ شیڈول کرنا پڑا تھا! انہوں نے فون پر بات کے دوران پولیس کیس کی فائل ساتھ لانے پر زور دیا تھا۔ انہوں نے متعلقہ دستاویزات کو غور سے دیکھا، اس دوران ان کے پوتے پوتیاں کمرے کے ارد گرد دوڑتے ہوئے شور مچا رہے تھے۔ فائل میں درج کچھ تاریخیں جو نا قابل فہم تھیں ان کی مدد سے واضح کی گئیں۔ یہ فائل اس کی یادداشت تازہ کرنے میں مددگار لگ رہی تھی۔ وہ اچانک ہر لمحے اور تفصیل کو یاد کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

ایک بھولا ہوا شخص ہونے کے باوجود، ڈاکٹر مخدومی کو واضح طور پر یاد ہے کہ 8 یا 9 مارچ کو اس نے اپنی ٹیم کے ساتھ گاؤں کے متاثرین کا معائنہ کیا تھا اور میڈیکل رپورٹس بنائی تھیں لیکن پولیس فائل میں موجود دستاویزات 15 اور 20 مارچ کی ہیں اور ان کا تعلق کرل پورہ پرائمری ہیلتھ سینٹر میں ہوئے طبی معائنے سے ہے۔ گاؤں والوں کو بھی یاد ہے کہ بی ایم او ایک خاتون نرس کے ساتھ ایمبولینس میں آئے تھے، اور کریک ڈاؤن ختم ہونے کے فوراً بعد انہیں انجکشن اور دوائیں فراہم کی تھیں لیکن 23 سال بعد بھی انھیں صحیح تاریخ یاد نہیں ہے۔ اس بات کی تصدیق ایک اور طبی عہدیدار نے بھی کی ہے۔ ان سابقہ رپورٹس کا کیا ہوا جو بہت سے الزامات کی تصدیق کر سکتی تھیں، جیسے طبی معائنے میں تاخیر کے سبب

میڈیکل شواہد بے نتیجہ ثابت ہونا۔

ہم بعض دستاویزات کے بارے میں متجسس تھے جنہیں اس وقت جب ابھی انٹرویو جاری تھا، ڈاکٹر احتیاط سے ایک نئے لگنے والے پیلے رنگ کے لفافہ میں دوسرے کمرے سے باہر لایا۔ اس کے مطابق یہ دستاویزات 1991ء میں کی گئی اس کی تحقیقات سے متعلق تھیں۔ اس نے بیحد احتیاط سے ان کا حوالہ دیا لیکن ہمیں مواد پر نظر ڈالنے کا موقع دیئے بغیر۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ محض پولیس فائل میں موجود طبی دستاویزات کے انگریزی ترجمے تھے۔ ہم نے دستاویزات کو ایک نظر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا لیکن اس پر شائستگی سے انکار کر دیا گیا۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ یہ دستاویزات اس وقت جاری تحقیقات کا حصہ تھیں کیوں کہ ہم نے ایک کاغذ پر ایس پی عبدالجبار کے دستخط دیکھے تھے۔

ڈاکٹر مخدومی کے مطابق انہوں نے مارچ 1991ء کے پہلے ہفتے میں اجتماعی عصمت دری کے بارے میں سنا تھا۔ ترہ گام پولیس اسٹیشن کے پولیس افسروں نے انہیں اطلاع دی، اور ایف آئی آر کی ایک کاپی لے کر ان کے پاس آئے۔ ڈاکٹر مخدومی کے مطابق:

''یہ شاید وہی دن تھا جب ایف آئی آر درج کی گئی تھی (یعنی 8 مارچ) یا شاید ایک دن بعد۔ چوں کہ یہ ایک حساس مسئلہ تھا اس لئے پولیس نے مجھے گاؤں کا دورہ کرنے اور وہاں کی خواتین کا معائنہ کرنے کے لئے کہا۔ اس وقت بہت بے چینی پھیلی ہوئی تھی۔ فوج اور عسکریت پسندوں دونوں کے خوف کی وجہ سے پولیس اس واقعے کی اطلاع دینے سے خوفزدہ تھی''۔

بعدازاں انہوں نے کہا ''میں نے ماحول کو اداس اور مایوس کن پایا۔ عورتیں اپنی کہانیاں سنانے سے ڈری ہوئی تھیں اور کانپ رہی تھیں۔ میری یادوں میں یہ سب اچھی طرح محفوظ نہیں ہے، صرف ایک دھندلی سی تصویر ہے، ایک نرس، ایک اے این ایم

(معاون نرس، دائی) اور ایک فارماسسٹ پر مشتمل ایک ٹیم میرے ساتھ تھی۔ طبی معائنہ تین یا چار گھروں میں کیا گیا تھا جہاں پڑوس کے گھروں کی کچھ خواتین کو جمع کر کے ان کا معائنہ کیا گیا۔ ہم نے تقریبا 30 خواتین کا معائنہ کیا اور میڈیکولیگل رپورٹس تیار کیں لیکن میں حیران ہوں کہ وہ فائل میں نہیں ہیں۔ انہوں نے مزید کہا:

''مجھے ایک بوڑھی عورت یاد ہے جو 70 سال کی ہوگی اور کہہ رہی تھی 'دیکھو! یہاں تک کہ مجھے بھی نہیں بخشا گیا۔ 17۔18 سال کی ایک نوجوان لڑکی بھی ان متاثرین میں شامل تھی اور انہی میں سے ایک عورت نے کچھ دن پہلے ایک بچے کو جنم دیا تھا''۔

ڈاکٹر کو ایک اور بچہ کا معائنہ کرنا بھی مبہم طور پر یاد ہے جو زخمی تھا اور بعد میں مر گیا تھا۔ اس کے علاوہ اسے وہ خواتین یاد رہ گئیں جنہیں کانسٹیبل عبدالغنی 15 اور 21 مارچ کو کرالپورہ پرائمری ہیلتھ سینٹر میں لائے تھے۔ اس نے پولیس فائل میں موجود خطوط کو پہچان لیا، اور پرنٹ شدہ فارم میں میڈیکولیگل سرٹیفکیٹ بھرنا بھی یاد رکھا۔ چونکہ یہ ایک پولیس کیس تھا، اس لیے یہ رپورٹ سی ایم او (چیف میڈیکل آفیسر) یا کسی دوسرے میڈیکل آفیسر کو پیش نہیں کی گئی تھی بلکہ انہیں براہ راست پولیس حکام کے حوالے کی گئیں (جبکہ مسٹر ورگیس کا دعویٰ ہے کہ انہیں کپواڑہ ضلع کے چیف میڈیکل آفیسر سے رپورٹ کی کاپی ملی) جب ہم نے ڈاکٹر مخدومی سے ان کی تیار کردہ رپورٹس کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے کہا، 'میرے پاس ان کے بارے میں کوئی معلومات نہیں ہیں لیکن وہ پولیس ریکارڈ میں ہونی چاہئیں اور آپ انہیں حاصل کرنے کی کوشش کریں''۔ شاید اسے امید تھی کہ ان گمشدہ ٹکڑوں سے کچھ فرق پڑے گا۔ لیکن ہم ان دستاویزات کی تلاش کیسے کریں جو خفیہ ہو سکتی ہیں؟

پولیس فائل میں موجود دستاویزات سے پتہ چلتا ہے کہ 15 اور 20 مارچ کو کرل پورہ ہیلتھ سینٹر میں متاثرین کا تفصیلی طبی معائنہ کیا گیا تھا۔ کانسٹیبل عبدالغنی کے ساتھ تقریبا 13 خواتین کو 15 مارچ کو ڈاکٹر مخدومی سے ملاقات کے لیے مرکز میں لایا گیا تھا۔

اس بارے میں انہوں نے یاد کرتے ہوئے کہا:

''میں نے خواتین کا معائنہ کیا اور ان کے جسم پر مندمل زخموں کے بہت سے نشانات پائے۔ کنواری لڑکیوں کے معائنے پر پردہ بکارت پھٹا ہوا پایا۔ کچھ دنوں کے بعد خواتین کا ایک اور گروپ جانچ کے لئے آیا۔ شاید، یہ وہ عورتیں تھیں جن کا گاؤں میں معائنہ نہیں کیا جا سکتا تھا، یا شاید میں نے پہلے انہیں دیکھا تھا۔ مجھے یاد نہیں کہ کچھ خواتین کا دوبار معائنہ کیوں کیا گیا۔ ضرور انہیں کچھ سنگین مسائل کا سامنا کرنا پڑا ہوگا''۔

چونکہ یہ معائنہ تقریباً دو ہفتوں کے بعد کیا جا رہا تھا لہٰذا ان سے عصمت دری کے زیادہ جسمانی ثبوت ملنے کا امکان نہیں تھا۔ انہوں نے ہمیں بتایا کہ ''اس بات کا زیادہ امکان ہے کہ یہ معائنہ تفصیلی ہو یا کوئی باہمی تعلق ہو لیکن براہ راست نہ ہو۔ بی ایم او نے ریپ کیس میں طبی معائنے سے متعلق چند حقائق سے مطلع کرتے ہوئے کہا کہ ایک ڈاکٹر کس طرح بتا سکتا ہے کہ چوٹ یا زخم کب لگے ہیں:

''عصمت دری کے معاملے میں واقعہ پیش آنے کے 72 گھنٹوں کے اندر طبی معائنہ کرنا پڑتا ہے۔ اس مدت کے اندر پردہ بکارت کی حالت کا پتہ لگایا جا سکتا ہے۔ کسی بھی چوٹ کے زخم دو دن تک نیلے رنگ کے ہوتے ہیں اور سوجن ہوتی ہے۔ 10 دن کے بعد وہ جامنی ہو جاتے ہیں اور آہستہ آہستہ شفایابی کی طرف جاتے ہوئے زرد ہو جاتے ہیں۔ کوئی بھی خرابی یا سوجن 21 دن کے اندر مکمل طور پر ٹھیک ہو جاتی ہے، لیکن یہ صرف معمولات ہیں، طبی شواہد فوری طور پر جمع کیے جانے چاہئیں''۔

بی ایم او کے مطابق، گاؤں میں معائنے کے وقت بھی بعض عورتوں کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا لیکن پولیس رپورٹ (10 دن بعد) میں درج طبی دستاویزات میں خون بہنے کا کوئی تذکرہ نہیں بلکہ ان میں صرف خواتین کے مخصوص حصے کے مندمل ہوتے زخم کا ذکر ملتا ہے۔ جب ہم نے گاؤں میں زیادتی کا نشانہ بننے والی کچھ خواتین سے بات کی تو انہوں

کنن پوش پورہ
مصنف۔ بشیر سدوزوی

نے بھی ہمیں دو خواتین کے بارے میں بتایا جن کے زخموں سے کئی مہینوں تک مسلسل خون بہتا رہا اور آخر کار اسی حالت میں وہ چل بسیں۔

بی ایم او نے ہمیں طبی سہولیات کی کمی کے بارے میں بھی بتایا، اور ان مشکل حالات کے متعلق بھی جن میں عسکریت پسندی کے عروج کے دوران ڈاکٹروں اور طبی کارکنوں کو کام کرنا پڑتا تھا۔ وہ وہاں واحد ڈاکٹر تھے اور کرالپورہ پرائمری ہیلتھ سینٹر اس علاقے میں واحد کام کرنے والا سرکاری کلینک تھا۔ وہ خود بتاتے ہیں ''مقامی حکام کو معلوم تھا کہ ''کنن پوش پورہ'' کے قریب واقع قصبوں ترہ گام، پنزگام یا اوورا کے پرائمری ہیلتھ سینٹروں میں کوئی ڈاکٹر نہیں ہے۔ دیگر تمام ڈاکٹر حالات کی وجہ سے اپنی تعیناتی کہیں اور کرانے یا اپنی پوسٹ چھوڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

کرال پورہ کنن اور پوش پورہ سے نزدیک ترین فعال پرائمری ہیلتھ سینٹر تھا اور وہ وہاں کے واحد ڈاکٹر تھے جو اگرچہ پہلے بھی کرال پورہ میں خدمات انجام دے چکے تھے تاہم ان کی دوبارہ یہاں تقرری اسی مہینے، فروری 1991ء کے آغاز میں ہوئی تھی۔ انہوں نے دہشت گردی کی صورتحال کا ذکر کیا جس میں انہوں نے وہاں کام کیا تھا اور بتایا کہ دو سال بعد 1993ء میں عسکریت پسندوں نے انہیں اغوا کر کے چار دن تک یرغمال بنائے رکھا۔ کرال پورہ میں اپنی تعیناتی کے بارے میں انہوں نے کہا،

''حکام نے مجھے اپنے تعاون کی یقین دہانی کرائی تھی لیکن انہوں نے ہماری حفاظت کی کوئی ذمہ داری نہیں لی۔ ایک طرح سے مجھے وہاں جانے پر مجبور کیا گیا''۔ ڈاکٹر مخدومی، چیسٹ ڈیزیز ہسپتال سرینگر سے سپرنٹنڈنٹ کی حیثیت سے 2002ء میں ریٹائر ہو گئے۔

گاؤں کے کچھ لوگوں نے ہمیں بتایا تھا کہ گاؤں کے دورے پر آنے والی ٹیم کے ساتھ ایک لیڈی ڈاکٹر بھی تھی لیکن بی ایم او نے کہا کہ یہ ایک اے این ایم تھی جسے گاؤں

والوں نے غلطی سے ڈاکٹر سمجھ لیا ہوگا، انہوں نے مزید بتایا کہ:

''پورے ضلع میں کوئی لیڈی ڈاکٹر نہیں تھی۔ اے این ایم نے خواتین کا معائنہ کیا۔ اگر ہم نے لیڈی ڈاکٹر حاصل کرنے کی کوشش کی ہوتی تو کیس میں مزید تاخیر ہوتی اور مزید طبی ثبوت ضائع ہو جاتے۔ اس معاملے کو ہر سطح پر غلط طریقے سے ہینڈل کیا گیا اور اس کا غلط انتظام کیا گیا۔ یہ سچ ہے کہ میڈیکل معائنہ ایک لیڈی ڈاکٹر کے ذریعہ کیا جانا تھا اور جسمانی ثبوت فارنسک لیب کو بھیجے جانے تھے لیکن بدقسمتی سے ہمارے پاس اس وقت بھی ایسا کوئی انتظام نہیں ہے اور اس کی نتیجہ یہ کہ جو نمونے یا اہم طبی ثبوت دوسری ریاستوں کی لیبارٹریوں میں بھیجے جاتے ہیں ان سے چھیڑ چھاڑ کی جاتی ہے یا گم ہو جاتے ہیں جیسا کہ شوپیاں ریپ کیس میں ہوا تھا۔ اس معاملے کی اطلاع فوری طور پر دی جانی چاہیے تھی۔ مقامی حکام کی جانب سے 10-12 دن کی تاخیر کی گئی، جنہیں میں اس معاملے کو دبانے کا یکساں طور پر ذمہ دار سمجھتا ہوں''۔

ہمارے سامنے بہت سے سوالات تھے جن کا جواب نہیں ملا جیسے، کیا وہ بی جی ورگیس سے ملے تھے؟ اس پر انہوں نے پہلے مثبت جواب دیا، لیکن پھر اپنے ہی بیان کی تردید کرتے ہوئے کہا کہ نہیں۔ انٹرویو کے آخر میں ڈاکٹر مخدومی نے دردناک انداز میں کہا کہ 'آپ کسی آدمی سے یاد رکھنے کی کس قدر امید رکھ سکتے ہیں؟'

جونئی اور متضاد چیزیں ہمارے علم میں آئیں انہی میں الجھے ہوئے ہم گھر سے باہر نکل رہے تھے کہ، منزہ نے ڈاکٹر کے بیٹے سے کہا، 'اگر ہمارے پاس مزید کچھ سوال ہوئے تو آپ کو دوبارہ پریشان کر سکتے ہیں۔ اس پر وہ دروازے سے باہر آیا اور شائستگی سے بولا، 'بہتر ہوگا اگر تم اس سے پرہیز کرو۔ اب 23 سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے اور تقریباً ہر افسر جو براہ راست یا بالواسطہ طور پر اس معاملے سے وابستہ تھا عمر رسیدہ اور بیمار ہے''۔ جب ہم ڈاکٹر مخدومی سے ملے تو یہ بات بہت واضح تھی کہ انسانی یادیں کتنی نازک

ہوتی ہیں اور تاریخ کے بعض حصوں کو ہمیشہ کے لئے کھونے سے پہلے کسی کی یادداشت کی قید سے باہر نکالنا کتنا ضروری ہے۔

''کنن پوش پورہ'' کا واقعہ کشمیریوں کے لیے اتنا حساس ہے کہ اس میں ملوث یا اس مقدمے سے وابستہ ہر افسر یا اکثریت بھول سکتی ہے کیوں کہ وہ وادی کشمیر میں رہتا ہے جو ایک جیل میں بدل چکی، جہاں انسانی حقوق نہیں، جہاں ریاست کی چھتری سر پر نہیں تو پیرانہ سالی میں کوئی کیوں اپنے لیے تکلیف اور تشدد کا انتخاب کرے جب اس کو معلوم ہو کہ پورا منہ کھولنے یا پورا سچ بولنے کا کچھ فائدہ بھی نہیں اور نہ ہی سوسائٹی پر یا حکومت پر اس کا کچھ اثر ہو سکتا ہے، جب پورا نظام ہی فوج، پولیس، سول انتظامیہ، سیاستدان حتیٰ کہ عدالت بھی اس آنکھوں دیکھے سچ کو جھوٹ ثابت کرنے پر تلی ہوئی ہے تو ایک ڈپٹی کمشنر، تحصیلدار یا تحصیل ہیلتھ آفیسر یا ان میں سے کوئی ایک، ریاست کی جانب سے اعلان کردہ سچ کو جو واقعی جھوٹ ہی ہے، کو جھوٹ ثابت کرنے میں کیوں کر کامیاب ہو سکتا ہے؟ لہٰذا اس کے لیے ضروری ہے کہ وہ اتنا ہی سچ بولے جس سے نظام کا سچ متاثر نہ ہو۔ اسی میں بچت ہے سب کی، ورنہ طیش میں آ کر فوج اس طرح کا ایک اور واقعہ کر لے تب بھی یہ سارے لوگ مل کر اس کو کیسے روک سکتے ہیں؟ جو ''کنن پوش پورہ'' میں سچ کی تلاش میں گھوم رہے ہیں۔

☆......☆

سچ میں مبالغہ نہ کریں

معروف کشمیری صحافی یوسف جمیل کے دفتر میں داخل ہوتے ہی میری نظر لکڑی کے دلکش پینل والے کمرے کی دیوار پر چسپاں سفید کاغذ پر لکھے ہوئے ان الفاظ پر مرتکز ہوگئی۔اس باب کے لیے تحقیق کے دوران جن لوگوں سے میری ملاقات ہوئی ان میں سے بہت سے لوگوں کے برعکس یوسف جمیل نے ابھی پچاس سال کی عمر کا سنگ میل عبور نہیں کیا تھا۔یہ حقیقت اس لئے بتانا ضروری ہے کہ ہر دوسرا شخص جس سے میں اس دوران ملی، بوڑھا ،عمر رسیدہ اور اس واقعے کو یاد کرنے کے لئے اپنی یادداشت سے نبرد آزما لگا۔ یوسف جمیل سے میری ملاقات پریس انکلیو سری نگر میں ان کے دفتر میں ہوئی۔ دلکش مسکراہٹ کے حامل طویل قامت یوسف جمیل فری لانسر کے طور پر لکھتے ہیں اور وہ 1990ء کی دہائی میں بی بی سی ریڈیو کی آواز تھے،اس کے علاوہ ٹیلی گراف اور رائٹرز کے لیے بھی لکھتے رہے ہیں۔

وہ پہلے صحافی تھے جو مارچ 1991ء کے اوائل میں دی ٹیلی گراف کے لئے ایک رپورٹ لکھ کر میڈیا میں ''کنن پوش پورہ'' عصمت دری کی خبروں کی شروعات کا سبب بنے۔ان کی یادداشت وسیع اور مضبوط ہے،اور ان سے بات کرنا بہت آسان ہے،جب ہم ''کنن پوش پورہ'' کے واقعہ کے بارے میں گفتگو کر رہے تھے تو مجھے احساس ہوا کہ ایک صحافی کے لئے اپنے قارئین میں قابل اعتماد ہونا کتنا ضروری ہے۔

جمیل نے ہنستے ہوئے کہا کہ کس طرح سینئر صحافی خشونت سنگھ نے ان پر جعلی خبریں پھیلانے کا الزام لگایا تھا جو سنگھ کے مطابق پہلی بار پاکستانی ٹیلی ویژن پر چلائی گئیں۔ وزارت دفاع کے لیے یوسف جمیل کی رپورٹ کو 'مسلح افواج کی ساکھ خراب

کرنے کے لیے ملک مخالف عناصر سے متاثر' قرار دینا کتنا آسان تھا۔ درحقیقت ان جیسے لوگوں کو ایک بھارتی وزیر سلمان خورشید کی زبانی ''کنن پوش پورہ'' واقعہ کا اعتراف کرانے میں کئی سال کی محنت کرنی پڑی ہے۔

جمیل صاحب نے مجھے بتایا کہ انہیں اس واقعہ کے بارے میں سرینگر کے ڈویژنل کمشنر کے دفتر میں کچھ ذرائع سے معلوم ہوا۔ وہ یاد کرتے ہوئے کہتے ہیں:

''صحافیوں کے پاس ہر جگہ اپنے قابل اعتماد ذرائع موجود ہیں۔ ایک دوست نے مجھے کپواڑہ کے ڈپٹی کمشنر کے سرینگر کے ڈویژنل کمشنر کو لکھے گئے خفیہ خط کے بارے میں بتایا۔ کپواڑہ کے ڈی سی ایک اہم عہدے پر فائز افسر تھے،اس لیے اس خط کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ میں نے ڈویژنل کمشنر (وجاہت حبیب اللہ) کو فون کیا اور ان سے خط کے بارے میں پوچھا۔ وہ یہ جان کر حیران رہ گئے کہ یہ خط میڈیا میں لیک ہو گیا ہے لیکن انہوں نے مجھے یقین دلایا کہ اس کی مناسب جانچ کی جائے گی البتہ بعد میں وجاہت کی رپورٹ سے سب حیران رہ گئے جہاں انہوں نے الزام لگایا کہ یہ واقعہ غالباً ایک فریب تھا''۔

12 مارچ 1991ء کو ٹیلی گراف میں شائع ہونے والے یوسف جمیل کے مضمون میں لیک ہونے والی رپورٹ کا پورا متن موجود تھا۔ میں نے اصل رپورٹ کی نقل تلاش کرنے کی بہت کوشش کی (اس کے کچھ حصوں کا حوالہ بی جی ورگیس کی رپورٹ میں دیا گیا ہے جس سے مجھے اس کی موجودگی کا علم ہوا تھا) لیکن میں اسے کہیں بھی نہ پا سکی۔ جب میں نے جمیل صاحب سے اس اہم مضمون کی کاپی دینے کی درخواست کی تو انہوں نے نرمی سے جواب دیا کہ ''ضرور دے دیتا مگر دھماکے میں وہ تمام دستاویزات کھو چکا ہوں''۔

ستمبر 1995ء میں یوسف جمیل کو نامعلوم افراد کی جانب سے بھیجا گیا پارسل بم موصول ہوا تھا جس کے نتیجے میں ان کے قریبی دوست اور ایشیا نیوز انٹرنیشنل کے نیوز فوٹوگرافر مشتاق علی جاں بحق ہو گئے تھے۔ اس سے قبل 1992ء میں یوسف جمیل کے گھر پر

دستی بم پھینکے گئے تھے۔ انہیں جون 1990ء میں ہندوستانی فوج نے ان کے گھر سے اغوا کیا تھا اور ایک فوجی کیمپ میں لے جایا گیا تھا جہاں سے 30 گھنٹے بعد رہا کر دیا گیا۔ فوج نے انہیں اٹھانے اور حراست میں لینے کا اعتراف کیا لیکن دعویٰ کیا کہ یہ غلط شناخت کی وجہ سے ہوا۔ ان تمام باتوں نے یوسف جمیل کو ایک محتاط اور زیرک انسان بنا دیا ہے۔

یوسف جمیل نے رپورٹ شائع ہونے کے دو دن بعد 14 مارچ 1991ء کو اپنے دوست مشتاق علی اور ایک ڈرائیور کے ساتھ دونوں دیہات کا دورہ کیا تھا۔ انہوں نے یاد کیا کہ ''کچھ خواتین بولنے سے کافی ہچکچا رہی تھیں اور نوجوان لڑکیاں خاص طور پر الگ تھلگ اور خاموش تھیں تاہم ان کے مطابق، بڑی عمر کی خواتین نے ان سے کھل کر بات کی اور اپنی اذیت اور صدمے کی کہانیاں بیان کیں:''

''ہم نے وہاں موجود خواتین سے بات کی۔ اگرچہ کچھ لوگ واضح وجوہات کی بنا پر ہچکچا رہے تھے۔ جو خواتین خواندہ نہیں تھیں، ان کو یہ سمجھانا بہت مشکل تھا کہ قانونی طور پر ریپ کیا ہے یا یہ پوچھنا کہ آخر ہوا کیا تھا تاہم ہمارے ساتھ بات چیت کرنے کے بعد، بزرگ خواتین نے ہمیں کھلے الفاظ میں بتایا کہ ان کے ساتھ عصمت دری کی گئی ہے''۔

یوسف جمیل یاد کرتے ہیں کہ جون 1991ء میں پی سی آئی کی ایک ٹیم اسی دفتر میں ان سے ملنے آئی تھی جس میں ہم بیٹھے ہوئے تھے۔ دوسرے کمرے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے انہوں نے کہا، 'میں اس کمرے میں بیٹھا تھا جب کچھ لوگ داخل ہوئے۔ ان کے ساتھ ایک کشمیری خاتون صحافی بھی تھیں جو پیچھے رہ گئیں۔ میں نے اسے اپنی کھڑکی سے دیکھا لیکن میں اس کا نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا۔ انہوں نے مجھے یہ بھی بتایا کہ ایک تجربہ کار صحافی اور راجیہ سبھا رکن کلدیپ نیر نے انہیں بتایا تھا کہ بی جی ورگیس نے رپورٹ لکھتے وقت دوسرے ممبروں کو اعتماد میں نہیں لیا تھا۔

''1990ء کی دہائی کے اوائل میں، ہر روز انسانی حقوق کی پامالی کا ایک واقعہ پیش آتا تھا۔ صحافیوں کے لیے ہر واقعے کی کوریج کرنا ناممکن ہو گیا تھا، 'یوسف جمیل اس

وقت کے بارے میں کہتے ہیں۔ لامحالہ مجھے بھی اسی مسئلے کا سامنا کرنا پڑا۔ وہ بتاتے ہیں کہ کس طرح لوگ اس وقت ناراض ہو گئے جب میڈیا والے ان کو درپیش حالات اس لئے کور نہیں کر سکتے تھے کہ وہ اس دن کہیں اور، کسی اور چیز کی کوریج کر رہے تھے۔ یوسف جمیل 1990ء کی دہائی میں ہر روز ہونے والی ہلاکتوں کو ڈائری میں باقاعدگی سے درج کرتے تھے لیکن بدقسمتی سے اس ڈائری کو بھی جلا دیا گیا ہے۔ ہمارے انٹرویو کے آخر میں یوسف جمیل نے جذباتی طور پر کہا کہ انہیں یہ اچھا لگا کہ'' کنن پوش پورہ'' کیس کو دوبارہ کھولنے سے صحافیوں کی ساکھ برقرار رہی اور آخرکار 23 سال سے جس چیز کے ہونے سے انکار کیا جاتا رہا اس سے اب انکار ممکن نہیں رہا۔

مقبوضہ کشمیر میں صحافیوں کو مارنا، دھمکانا، ڈرانا اور قتل کرنا روز کا معمول تھا اور یہ فوج کے لیے بہت ضروری تھا کیونکہ انسانی حقوق کے اکا دکا کارکن اور کچھ صحافی ہی ایسے تھے کہ بھارتی فوجیوں کے کرتوتوں کو نمایاں کرتے اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیاں دنیا تک پہنچاتے جیسا کہ یوسف جمیل کی رپورٹ نے ہی ''کنن پوش پورہ'' واقعہ عوام تک پہنچایا ورنہ فائل میں ہی گم ہو جاتا۔

یہ سچ ہے کہ اس واقعے کے نمایاں ہونے سے بھی مجرموں کو کچھ فرق نہیں پڑا اور نہ ہی جرائم رکے لیکن دنیا میں بھارتی آرمی کا وہ چہرہ ضرور نمایاں ہوا جو وہ دہشت گردی کی چھتری کے نیچے چھپائے رکھتی ہے اور جرائم کرتی ہے، تاہم مقبوضہ جموں وکشمیر کے صحافیوں اور سول سوسائٹی نے اس مہم کی بہت بھاری قیمت چکائی ہے۔ خود یوسف جمیل جیل کی سلاخوں کے پیچھے رہے جب کہ عصمت زہرہ کو ملک چھوڑنا پڑا، کتنے صحافی شہداء قبرستان میں زمین کے نیچے ہیں اور کتنوں کو مفرور ہونا پڑا، اکثر کو تو آبائی وطن ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑنا پڑا اور مہاجر ہو گئے۔ انسانی حقوق کا بین الاقوامی کارکن فرح پرویز سمیت کسی دیگر کارکن صرف اس بنیاد پر جیلوں میں ہیں کہ وہ مقبوضہ وکشمیر میں جرائم کی رپورٹنگ کرنے یا آواز اٹھانے نکلے جو بھارتی آرمی کرتی ہے، بے شک مقبوضہ کشمیر میں سچ بولنا اور لکھنا بہت مشکل ہے، اس لیے لوگ آدھا سچ ہی بولتے ہیں۔

☆......☆

یہ ایک سوچا سمجھا منصوبہ تھا

''کنن پوش پورہ'' کے بارے میں انسانی حقوق کی موجودہ رپورٹس کی بڑی تعداد میں جسٹس مفتی بہاؤالدین فاروقی اوران کی ٹیم کی رپورٹ ایک خودمختارٹیم کے دیہات کے پہلے دورے پرمبنی تھی۔سری نگر ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس،جسٹس بہاؤالدین فاروقی اپنے وکیل بیٹے شوکت فاروقی سمیت ٹیم کے دیگرارکان کے ساتھ جڑواں بستیوں میں گئے جن میں سینئر ماہر امراض اطفال اورسول سوسائٹی کے کارکن ڈاکٹر الطاف حسین، ریٹائرڈ سیشن جج این ایچ نہوی اورمحکمہ جنگلات کے ریٹائرڈ چیف کنزرویٹرنورالحسن شامل تھے۔

انہوں نے ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کے دورے سے بھی پہلے 17 مارچ کو یہ دورہ کیا تھا۔میں خوداس رپورٹ کے مرکزی مصنف جسٹس فاروقی کا انٹرویو کرنا چاہتی تھی لیکن مجھے پتہ چلا کہ وہ بہت بوڑھے اورعملی طور پر اپنے بستر تک محدود تھے، وہ مہمانوں سے ملاقات کے قابل نہ تھے۔بعد میں جب میں جولائی 2014ء میں کتاب لکھ رہی تھی تو جسٹس فاروقی کا انتقال ہوگیا۔میں کشمیر میں سول سوسائٹی کی کئی تقریبات میں ڈاکٹر الطاف سے ملی تھی اوران کا انٹرویو لینے کا فیصلہ کیا تھا۔

میں نے ڈاکٹر الطاف کے ساتھ ان کے کلینک میں ایک ملاقات طے کی، جو جواہر نگر کے ایک علاقے میں واقع ہے، جہاں میں ہمیشہ اپنے آپ کو کھویا ہوا محسوس کرتی ہوں کیوں کہ وہاں رہائشی گھروں سے زیادہ پارک ہیں! یہ ایک غیر معمولی ملاقات تھی، میں ایک ماہر امراض اطفال کے کلینک میں مریضوں کے اسٹول پر بیٹھی تھی اور جب میں ان سے بات کررہی تھی تو ڈاکٹر الطاف نسخے کے پیڈ پر کچھ لکھ رہے تھے۔ڈاکٹر الطاف، برف

جیسے سفید بال اور گھٹے ہوئے لہجے کے ساتھ وہ کسی اورعمر کے بوڑھے آدمی کی طرح نظر آتے تھے۔انہوں نے اپنی ٹیم،ممبروں کو درپیش مسائل کے بارے میں کھل کر بات کی، اور ایک بار پھراس یقین کواجاگر کیا کہ بی جی ورگیس نے اپنی رپورٹ لکھنے سے پہلے کبھی ''کنن پوش پورہ'' کا دورہ نہیں کیا تھا۔ڈاکٹر الطاف کے مطابق 1990ء کی دہائی میں جب جموں وکشمیر میں زیادتیاں وسیع پیمانے پر اوراندھادھند ہوگئیں تو جسٹس فاروقی نے ایک ٹیم تشکیل دی جسے انسانی حقوق کی پامالیوں کی نگرانی اورتحقیقات کرنی تھی۔اس معاملے کی جانچ کے علاوہ، ٹیم نے کئی دیگر زیادتیوں کا جائزہ بھی لیا۔

جب میں نے جسٹس فاروقی کی رپورٹ کے بارے میں پوچھا کیونکہ میں نے صرف دیگر رپورٹس میں شائع ہونے والے اقتباسات اوراخبارات میں اس کے حوالے ہی دیکھے تھے تو اس پر،ڈاکٹر الطاف نے کہا کہ جسٹس فاروقی نے تمام شواہد کو گہرائی سے،ایک جامع رپورٹ میں ریکارڈ کیا ہے، اور وہ خود وہاں موجود تھے۔تحقیقات کے متعلق اخباری بیانات کے ساتھ ساتھ ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کی رپورٹ میں بتایا گیا ہے کہ ٹیم نے 53 خواتین کے انٹرویو کیے۔لیکن ڈاکٹر الطاف نے خواتین کے بیانات کے حوالے سے زیادہ تفصیلات نہیں بتائیں،شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ بہت زیادہ وقت گزر چکا تھا۔

یہ رپورٹ صحافتی رپورٹ نہیں ہے بلکہ تقریبا ایک عدالتی رپورٹ ہے جس میں متاثرین کی جانب سے ریکارڈ کی گئی تمام شہادتوں کی مکمل نقل موجود ہے۔یہ رپورٹ ''کنن پوش پورہ'' کے بارے میں تمام تفصیلات کے ساتھ پہلی جامع رپورٹ تھی۔جب میں نے تاریخوں کے بارے میں پوچھا تو انہوں نے جواب دیا:''پہلے تو،تمام تفصیلات کو یاد کرنا واقعی مشکل ہے کیونکہ 22 سال سے زیادہ گزر چکے ہیں لیکن مجھے یاد ہے کہ یہ ٹیم ''کنن پوش پورہ'' کے گاؤں میں رہی اور پورے دن گواہی ریکارڈ کی۔جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے سابق چیف جسٹس کے لئے اس مقام تک پہنچنا واقعی مشکل تھا کیونکہ مقامی حکومت نے ہمارے موقع تک پہنچنے کے

راستے میں تمام ممکنہ رکاوٹیں کھڑی کیں مگر پھر بھی جسٹس فاروقی وہاں پہنچنے پر بضد تھے۔

ڈاکٹر الطاف اس رپورٹ کو ایک قیمتی دستاویز سمجھتے ہیں جو بدقسمتی سے میں دوبارہ حاصل نہیں کرسکی کیوں کہ میں نے جن لائبریریوں یا لوگوں سے مشاورت کی ان میں سے کسی کے پاس بھی اس دستاویز کی کاپی نہیں تھی۔ یہ تاریخ کا ایک اور کھویا ہوا حصہ ہے جسے ہم دوبارہ زندہ کرنے کی کوشش کررہے ہیں۔

ڈاکٹر الطاف نے مجھے بتایا کہ ''کنن پوش پورہ'' میں عصمت دری سوچا سمجھا عمل تھا اور یہ درحقیقت آزادی کی جاری جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کی دانستہ کوشش تھی۔ انہوں نے کہا:

''یہ تحریک آزادی کا مقابلہ کرنے کی ان کی تیارکردہ حکمت عملیوں میں سے ایک تھی۔ ان کا کہنا ہے کہ کسی قوم کی تذلیل کرنے کا بہترین طریقہ یہ ہے کہ اس قوم کی خواتین کی بےحرمتی کرنے کی کوشش کی جائے۔ یہ ایک جنگی حکمت عملی تھی جسے انہوں نے ریاستی پالیسی کے طور پر استعمال کیا۔ یہ ایک سوچی سمجھا اور بہت سردمہری پر مبنی عمل تھا۔ مجھے یقین ہے کہ یہ عمل سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا گیا تھا جس کا مقصد مزاحمتی تحریک کی کمر توڑنا اور پوری قوم کو ذلت سے دوچار کرنا تھا''۔

میں نے پی سی آئی کی ٹیم کے بارے میں پوچھا۔ گاؤں والوں نے بار بار ہمیں ان لوگوں کے بارے میں بتایا ہے جو پچھلے 23 برسوں میں ان سے ملنے آئے ہیں۔ ان میں سیاست دان، صحافی (کشمیری، بھارتی، غیرملکی)، فلم ساز، انسانی حقوق کی ٹیمیں شامل ہیں۔ ۔لیکن بی جی ورگیس کا نام اس کی غیر موجودگی میں بھی نمایاں ہے۔ ایک بار ہم نے کچھ گاؤں والوں کو ان کی تصویر دکھانے کی کوشش بھی کی مگر بے سود رہی۔ بعد میں، 22 جون 2013ء کو ''کنن پوش پورہ'' کی گاؤں کمیٹی کے ممبروں نے ایک عوامی جلسے میں کہا کہ بی جی ورگیس نامی کسی بھی شخص نے کبھی بھی متاثرین میں سے کسی سے ملاقات نہیں کی ہے۔ ڈاکٹر الطاف

حسین نے اس بات کی تصدیق کرتے ہوئے کہا کہ ورگیس کبھی بھی بارہ مولہ میں فوجی اڈے کے بریگیڈ ہیڈ کوارٹر سے آگے نہیں گئے اور انہوں نے فوج کے ساتھ شراب پیتے ہوئے فوج کی مذموم حرکت پر پردہ ڈالنے کے لئے یہ رپورٹ لکھی۔ یہ رپورٹ ان کی سہولت اور شرائط کے مطابق لکھی گئی تھی اور انہوں نے یہ سب صرف بین الاقوامی رائے عامہ کو گمراہ کرنے اور قومی مفاد کے تحفظ کے لئے لکھا تھا۔

پی سی آئی نے ٹیم کو تحقیقات کے لئے کیوں بھیجا تھا؟ میں نے پوچھا۔ ڈاکٹر الطاف نے جواب دیا: ''جب پوری بین الاقوامی برادری کو اس سنگین واقعے کے بارے میں پتہ چلا تو انہوں نے بھی تحقیقات کے لئے اپنی ٹیمیں بھیجنا شروع کردیں۔ مجھے یاد ہے نیویارک ٹائمز نے بھی آکر اپنے پہلے صفحے پر اس واقعے کی کوریج کی تھی لیکن پھر بھی مجھے تاریخ یاد نہیں ہے، اس گڑبڑ پر پردہ ڈالنے کے لیے انڈین گورنمنٹ نے پریس کونسل آف انڈیا سے اپنی ٹیم تشکیل دی، جس کی سربراہی بی جی ورگیس کررہے تھے، جنہوں نے فوج کے غلط کاموں کا بے شرمی سے دفاع کیا۔ ایک صحافی ہونے کے ناطے لوگ ان سے معروضی ہونے کی توقع رکھتے تھے۔ انہوں نے بہت شعوری طور پر، جان بوجھ کر پوری سچائی کو چھپانے اور الٹا متاثرین کو موردالزام ٹھہرانے کی کوشش کی اور مجرموں کو صاف بچالیا''۔

متاثرین اور فیکٹ فائنڈنگ وفد کے ممبروں کی جانب سے اتنے الزامات کے باوجود کہ ورگیس نے کبھی ''کنن پوش پورہ'' کا دورہ نہیں کیا اور اپنی رپورٹ کے ذریعے دھوکہ دیا، ایسا لگتا ہے کہ وہ مکمل طور پر پچھتاوے سے محروم تھا۔ سچ کو جھوٹا ثابت کرنے اور متاثرین پر الزام تراشی کرنے کے اس کے عمل نے پوری صحافتی برادری کو اس کا ذمہ دار ٹھہرادیا ہے۔

ڈاکٹر الطاف تحقیقات دوبارہ شروع کرنے کے ممکنہ نتائج کے متعلق تبادلہ خیال کے دوران بہت بدگمان نظر آئے۔ انہوں نے کہا، 'پرامید ہونا اچھا ہے، لیکن جموں وکشمیر

ریاست کے تمام اداروں کے ریکارڈ کو دیکھتے ہوئے، مجھے نہیں لگتا کہ انصاف ملے گا کیونکہ کہیں نہ کہیں کوئی یقینی طور پر پورے عمل کو دوبارہ پٹری سے اتار دے گا۔ یہ شرم کی بات ہے کہ 23 سال بعد عدالت نے آخر کار کہا ہے کہ ہمیں تحقیقات دوبارہ شروع کرنی چاہئیں تو شاید مزید 23 سال اور گزر جائیں۔ وہ صرف مایوس کرنے کا کوئی طریقہ تلاش کرتے ہیں۔

''کنن پوش پورہ'' متاثرین کی بدنامی کے بارے میں ایک سوال کے جواب میں ڈاکٹر الطاف حسین نے کشمیری معاشرے پر زور دیا کہ وہ ان کے ساتھ عاجزی کا برتاؤ کریں۔ انہوں نے لوگوں پر زور دیا کہ وہ فیصلہ نہ کریں اور دوسروں کی طرف انگلی اٹھانے سے گریز کریں۔ انہوں نے مزید کہا کہ 'وہ متاثرین ہیں نہ کہ مجرم، لہٰذا انہیں صدمہ نہیں پہنچنا چاہیے۔' ڈاکٹر الطاف حسین نے کہا کہ بہت سے دیگر متاثرین کی طرح ان لوگوں نے بھی کشمیر کے اجتماعی کاز کے لئے جدوجہد کی۔ درحقیقت بار بار ایک ہی واقعے کے بارے میں بات کرنے سے متاثرہ افراد کا سکون مجروح ہوتا ہے شاید یہی وجہ ہے کہ وہ اب اس معاملے پر بات کرنے سے ہچکچا رہے ہیں۔

☆......☆

نذرِعورت

کشمیر میں خواتین کی گرفتاری ہمیشہ بدنامی کا معاملہ رہی ہے۔ جب کسی عورت کو گرفتار کیا جاتا ہے تو لوگ بہت سے نتائج اخذ کرتے ہیں اور بہت سے الزامات عائد کرتے ہیں تاہم سیدہ آسیہ اندرابی کے لیے گرفتار ہونا اور زیرزمین جانا کوئی غیر معمولی بات نہیں ہے۔ آسیہ دختران ملت (مسلم امہ کی بیٹیاں) کی بانی ہیں، جو ایک مکمل طور پر خواتین پر مشتمل، آزادی کی حامی سیاسی تنظیم ہے۔ یہ تنظیم 1980ء کی دہائی کے آخر میں 'سماجی برائیوں' کے خلاف تشکیل دی گئی تھی۔ بہت سے لوگوں کی جانب سے ایک بنیاد پرست اسلامی حقوق نسواں کی حامی کے طور پر پیش کی جانے والی آسیہ نے ہمیشہ کشمیر کی خواتین کو درپیش ناانصافیوں، خاص طور پر جنسی تشدد کے خلاف آواز اٹھائی ہے حالانکہ اسلامی معاشرے میں عورت کے کردار کے بارے میں ان کی تفہیم کے بہت سے ناقدین ہیں۔

میں نے جن لوگوں سے انٹرویو کئے ان میں طویل عرصے تک کوئی خاتون شامل نہیں تھی۔ مجھے کشمیر سے کوئی ایسی خاتون کارکن نہیں ملی جو اجتماعی عصمت دری کے فوراً بعد ''کنن پوش پورہ'' پہنچی ہو۔ ایک دن مصنفہ ثمرینہ نے مجھے ایک رپورٹ دی جس میں مجھے ایک چھوٹا سا نوٹ ملا جس میں لکھا تھا کہ دختران ملت کی ایک ٹیم نے کنن پوش پورہ میں موقع پر تحقیقات کیں اور اس کی رپورٹ 20 مارچ 1991ء کو ایک مقامی اردو اخبار الصفا میں شائع ہوئی۔ میں نے آرکائیوز سے اس ایڈیشن کی کاپی تلاش کرنے کی کوشش کی لیکن مجھے پتہ چلا کہ 1990ء کی دہائی میں الصفا کا دفتر تب نذر آتش ہو گیا جب وسطی سری نگر میں آتشزنی بہت عام تھی۔ ایک دن صحافی ظہیرالدین، جو جے کے سی ایس کے رکن ہیں،

دفتر آئے اور میری بے نتیجہ تلاش کے بارے میں سن کر مجھے اس وقت کے اپنے ذاتی آرکائیوز کے بارے میں بتایا، جس میں الصفا بھی شامل تھا۔ میں بہت خوش ہوئی، ظہیر صاحب نے مجھے بتایا کہ انہوں نے یہ اخبارات ایک ہاکر سے تھوک میں خریدے تھے۔ میں زرد کاغذات، فائلوں اور مکڑیوں سے بھری ان کی گرد آلود الماری میں انہیں دیکھنے گئی۔ آخر کار میں نے مارچ کے مہینے کے الصفا ایڈیشن تلاش کیے۔ وہ ایک شکستہ فائل میں بندھے ہوئے تھے۔ میں بے چینی کے ساتھ 20 مارچ 1991ء کا اخبار تلاش کر رہی تھی جس میں یہ رپورٹ شائع ہوئی تھی لیکن صرف وہی اخبار غائب تھا۔ شاید کسی اور محقق یا صحافی نے اسے کسی خبر کے تعاقب میں اسے اڑا لیا ہو۔

میں نے آسیہ کے ساتھ ان کے گھر پر ایک ملاقات طے کی اور مجھے امید تھی کہ ان سے رپورٹ کی اصل کاپی مل جائے گی۔ مجھے اس جگہ تک پہنچنے کے لئے بہت جدوجہد کرنی پڑی جہاں وہ رہتی تھیں۔ یہ میرے لئے ایک بالکل اجنبی جگہ تھی، آسیہ کے گھر میں عورتوں کے لیے آزاد فضا تھی۔ آس پاس صرف نقاب پوش عورتیں تھیں، ایسا لگا جیسے آپ مغل رانیوں کے کمرے میں داخل ہو گئے ہیں جہاں کسی مرد کو جانے کی اجازت نہیں ہے۔ ایک عورت باہر آئی اور مجھے سلام کیا۔ میں نے پوچھا، 'کیا میں آسیہ جی سے مل سکتی ہوں؟' اس نے اپنا نقاب اتارا اور کہا، 'میں آسیہ ہوں، اندر آجاؤ۔' چند عوامی تقریبات میں ان کی شعلہ انگیز تقاریر سنتے ہوئے میرے ذہن میں ان کی ایک تصویر تھی لیکن یہ عورت اس سے بالکل مختلف تھی جس کا میں نے تصور کیا تھا۔ میں نے آسیہ سے پوچھا کہ اسے ''کنن پوش پورہ'' کے بارے میں کیا یاد ہے۔ انہوں نے گہری سانس لی اور کہا:

''کپواڑہ کی کچھ خواتین نے جو ہماری تحریک کا حصہ ہیں، مجھے اس واقعہ کے بارے میں بتایا۔ مجھے یاد ہے کہ میں واقعہ کے اگلے ہی دن وہاں گئی تھی۔ ان کے گھروں کے اندر کوئی نہیں تھا، سردی تھی لیکن پورا گاؤں باہر جمع تھا اور لوگ سوگ میں تھے۔ ہم نے

کچھ عورتوں سے ملاقات کی جو رو رہی تھیں۔ مجھے یاد ہے کہ ایک عورت جس کی عمر 70 سال یا شاید اس سے زائد ہوگی، شاید کسی کی دادی تھی، وہ بہت زور سے رو رہی تھی۔ میں نے سوچا کہ اس کی بیٹی یا شاید اس کی پوتی کا ریپ کیا گیا ہوگا۔ میں نے اسے تسلی دینے کی کوشش کی اور اس سے بات کرتے ہوئے پتہ چلا کہ وہ خود بھی اس کا نشانہ بنی ہے''۔

آسیہ کے مطابق وہ عورت اس صدمے کی وجہ سے بہت پہلے مر گئی ہوگی جس سے اسے گزرنا پڑا تھا۔ آسیہ اور ان کی ٹیم نے جو تحقیقاتی رپورٹ تیار کی تھی اس میں انہوں نے متاثرہ خواتین کے بیانات قلم بند کیے کہ ان میں سے بہت سی خواتین کے زخموں سے خون بہہ رہا تھا۔ یہ ایک بہت ہی غیر معمولی قسم کا کریک ڈاؤن تھا جہاں تمام مردوں کو پوری رات خواتین سے الگ رکھا گیا اور تشدد کا نشانہ بنایا گیا۔ عام طور پر فوج کی طرف سے گھروں کی تلاشی مکمل کرنے کے بعد مردوں کو رہا کر دیا جاتا تھا۔ یہاں عورتوں کو فوج کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا گیا۔ انہوں نے اسے وحشیانہ تشدد کا معاملہ قرار دیا اور ڈی سی یاسین کی رپورٹ کا جانا پہچانا فقرہ استعمال کیا، 'فوج نے خواتین کے ساتھ درندوں کی طرح برتاؤ کیا۔' کشمیر میں ڈھائی گئی اس درندگی کے حوالے سے آسیہ نے مزید کہا۔

''آج کل جانور لوگوں پر حملہ کرتے ہیں اور انہیں بے دردی سے مار ڈالتے ہیں۔ یہ بھی ایسا ہی ایک واقعہ تھا۔ عورتوں نے اپنی عصمت کھو دی اور مردوں سے ان کی عزت چھین لی گئی۔ میں ہمیشہ لوگوں کو ان کی خواتین کی عزت کے تحفظ کی اہمیت کے بارے میں آگاہ کرنے کی کوشش کرتی ہوں۔ یہاں تک کہ خواتین کو بھی اپنی عصمت کے دفاع کے لئے اقدامات کرنے چاہئیں۔ ''کنن پوش پورہ'' میں ہونے والے واقعے کے بعد ہم نے کئی علاقوں میں خواتین کو تربیت دی۔ ہم نے انہیں میان میں رکھنے والے چاقو فراہم کیے اور انہیں ان کے استعمال کی تربیت دی۔ میں جانتی ہوں کہ لوگوں کی نظر میں چاقو کا استعمال کرتے ہوئے مسلح فوجی سے لڑنا ممکن نہیں ہے لیکن آپ کو اس بات کا احساس ہونا چاہئے کہ جب کوئی شخص آپ

کے پاس برے ارادوں کے ساتھ آتا ہے تو وہ اپنی مردانہ طاقتوں کا استعمال کرتا ہے، ایسی حالت میں انسان کو اس کا جسم پھاڑ دینا چاہیئے''۔

آسیہ کے شوہر، ایک اسلامی اسکالر اور سیاسی کارکن، محمد قاسم فکتو کو عمر قید کی سزا سنائی گئی ہے۔ انہیں دہشت گردی اور تخریبی سرگرمیوں کی روک تھام کیلئے بنائے گئے قانون ٹاڈا کے تحت 2003 میں عدالت نے مجرم قرار دیا تھا۔ آسیہ کہتی ہیں کہ

''یہ وہ قربانی تھی جس کی ہماری آزادی کی جدوجہد متقاضی تھی۔ 'میں انہیں اس سے روک نہیں سکتی تھی۔ اسی طرح عورتوں نے بھی تکلیف اٹھائی ہے، لیکن ہماری جدوجہد کے لیے کسی بھی قیمت پر عورتوں کی عصمت کو قربان نہیں کیا جاسکتا''۔

اگرچہ آسیہ بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح سپورٹ گروپ کی کوششوں کی حمایت کرتی تھیں تاہم وہ یہ بھی محسوس کرتی ہیں کہ موجودہ انتظامی نظام میں انصاف کبھی نہیں ملے گا۔ وہ محسوس کرتی ہیں کہ واحد انصاف جو ہم ہزاروں بے گناہ انسانوں کو دے سکتے ہیں وہ بھارتی قبضے سے آزادی ہے لیکن کیا یہ آزادی کشمیری خواتین کو یقین دلائے گی کہ ان کے خلاف جنسی تشدد ختم ہو جائے گا؟ آسیہ جیسی کارکنوں کو اس بات پر غور کرنا چاہیئے کہ جنسی جرائم کے لئے استثنیٰ صرف مسلح افواج کے ذریعہ ہونے والی عصمت دری تک ہی محدود نہیں ہے۔ اس حقیقت کے بارے میں کیا خیال ہے کہ سویلین عصمت دری کے بہت سے کیس بھی ہر ماہ سماعت کیلئے مقرر کیے جاتے ہیں لیکن بدقسمتی سے انہیں کبھی نہیں سنا گیا؟ اس لیے کہ ان میں بھی کہیں نہ کہیں ریاست ملوث ہوتی ہے۔

مقبوضہ جموں وکشمیر میں یہ تو اب عام سی بات ہوگئی کہ جن جرائم میں حکومتی اہلکار ملوث ہوں خواہ وہ کتنا ہی بڑا جرم کیوں نہ ہو، اس پر نہ انکوائری ہوسکتی ہے اور نہ ہی مجرموں کو سزا ملے گی۔ اسی طرح ''کنن پوش پورہ'' کے مظلوموں کو انصاف کیا ملے گا جس کو حکومت تسلیم ہی نہیں کرتی، حالاں کہ یہ سچا واقعہ ہے کہ بھارتی فوج نے وہاں سویلین آبادی اور خاص طور پر

عورتوں کے ساتھ درندگی کی۔ آسیہ اندرابی جوان دنوں تہاڑ جیل میں ہیں اور ان پر دہشت گردی اور ملک دشمنی کا الزام ہے، اس الزام میں مجموعی طور آسیہ 18 سال سے زائد سزا بھگت چکی ہیں۔ یہ بہادر خاتون نہ صرف جموں وکشمیر میں خواتین کے حقوق اور ان کی عزت وعصمت کی حفاظت کے لیے لڑ رہی ہے بلکہ مقبوضہ جموں وکشمیر کی آزادی کی جدوجہد میں تحریک آزادی کے ہراول دستے کی سپاہی ہے۔

☆......☆

ہم کچھ نہیں بھولے اور نہ بھولیں گے

مجھے یاد ہے کہ ایک بار وزیراعلیٰ کو لوگوں کے ایک گروپ سے خطاب کرتے سنتے ہوئے ایک بوڑھا شخص چیخ اٹھا تھا، 'ہمیشہ ایسے بولتا ہے جیسے ڈی سی لگا ہوا ہے؟' کشمیر کے معاشرے میں ڈی سی کی کافی اہمیت ہے اور ''کنن پوش پورہ'' مقدمہ میں تو ڈی سی کپواڑہ کی رپورٹ نے ڈی سی پر اعتماد اور زیادہ پختہ کر دیا جیسے ہر ڈی سی ہی ایس ایم یاسین اندرابی جیسا ہوتا ہے۔ سپورٹ گروپ شروع سے ہی ''کنن پوش پورہ'' کے واقعہ میں کپواڑہ کے سابق ڈی سی ایس ایم یاسین (سید محمد یاسین اندرابی) کے کردار سے واقف تھا۔ اس کی متنازعہ رپورٹ 8 مارچ 1991ء کو پولیس رپورٹ (ایف آئی آر) کے اندراج کی سرکاری بنیاد تھی اور 1991ء میں اس واقعے کی منسوخ شدہ تحقیقات کا نقطہ آغاز تھا۔ اس واقعے کی خبر پوری وادی اور پوری دنیا میں پھیل گئی کیونکہ یہ رپورٹ کسی نہ کسی طرح یوسف جمیل تک پہنچ گئی تھی۔ ڈی سی مجھے انٹرویو دینے والوں کی فہرست میں پہلا شخص تھا۔

میں فروری 2013ء میں اپنی ایک دوست کے ساتھ ان سے ملنے گئی تھی تا کہ ''کنن پوش پورہ'' واقعہ کو 22 سال مکمل ہونے کے موقع پر ایک تقریب میں انہیں مدعو کر سکوں۔ واقعہ کے متاثرین کے علاوہ، میں نے ان سے پہلے اس کیس سے متعلق کسی سے ملاقات نہیں کی تھی۔ یاسین صاحب نے ، جو ایک بوڑھے آدمی تھے، ہمارا گرمجوشی سے استقبال کیا۔ ہم نے انہیں اپنے گروپ اور ایک کتاب لکھنے کے خیال کے بارے میں بتایا جس پر انہوں نے ہمارے منصوبے کو سراہا تھا، ہم نے ان کے ڈرائنگ روم میں چائے پیتے ہوئے اس معاملے پر مختصر گفتگو کی اور ایسا لگتا تھا کہ اس حوالے سے ان کی یادداشت واضح

ہے۔ ان کی بیٹی، جو سری نگر کے ایک اسپتال میں میڈیکل پروفیسر ہیں، کچھ دیر بعد اپنی بیمار ماں سے ملنے آئی اور ہماری گفتگو میں شامل ہو گئیں۔

انہوں نے اس کیس اور گاؤں والوں کو بھی یاد کیا، اور بتایا کہ پوری فیملی کس قدر متاثر ہوئی تھی۔ 'یہ ہمارے لیے بہت زیادہ ذہنی تناؤ کا وقت تھا،' ایسا کہتے ہوئے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ ایس ایم یاسین نے ہماری دعوت قبول کی اور عصمت دری کے واقعات کے بارے میں جرات مندی سے بات کی، جو انہوں نے دیکھا تھا، اور کس طرح فوج اور بی جی ورگیس کی طرف سے ان پر دباؤ ڈالا گیا اور ڈرایا دھمکایا گیا، اور آخر کار ان کی بے باک فطرت کے نتیجے میں ان کا تبادلہ کر دیا گیا۔

انہوں نے تقریبا 300 لوگوں کے سامنے اپنے اصل الفاظ کا اعادہ کیا۔ ''مسلح افواج پرتشدد ہو گئی تھیں اور وحشی درندوں کی طرح برتاؤ کر رہی تھیں''۔ گاؤں کی کمیٹی کے ممبران انہیں مدعو کرنے پر ہمارے شکر گزار تھے اور اتنے سالوں کے بعد بھی انہیں اپنے مقصد کی حمایت کرتے ہوئے دیکھ کر خوش تھے۔ ان کی تقریر کے بعد، بی جی ورگیس نے ایک جوابی خط لکھا، اور یہ ایک عوامی مسئلہ بن گیا جسے ہندوستانی پریس میں بھی کور کیا گیا۔ مسٹر ورگیس کے جواب کے بعد بہت سے اخبارات نے یاسین کا انٹرویو کیا مگر وہ ایک بار پھر اپنے اصل الفاظ پر قائم رہے۔

چند مہینوں کے بعد، میں ایس ایم یاسین سے ان کے گھر میں ایک طویل انٹرویو کے لئے دوبارہ ملی۔ اس بار میں نے انہیں زیادہ بیمار اور کمزور پایا۔ انکی بیوی بھی بستر پر تھی۔ وہ لوگ سری نگر کے مضافات میں ایک بڑے گھر میں رہتے تھے جہاں فیملی کا ایک قابل اعتماد فرد ان کی دیکھ بھال کے لئے موجود تھا۔ یاسین نے مجھے بتایا کہ کس طرح انہیں 1990ء میں کپواڑہ کا ڈپٹی کمشنر/ضلع مجسٹریٹ مقرر کیا گیا تھا اور وہ کپواڑہ میں اپنی سرکاری رہائش گاہ پر رہتے تھے۔ میں نے انہیں ان تمام لوگوں کے بارے میں بتایا جن سے میں اپنی تحقیق کے عمل

کے دوران مل چکی تھی اور بتایا کہ کس طرح میں نے ہر ایک سے کہا تھا اس حوالے سے انہیں جو بھی یاد ہے اسے بتائیں جس پر انہوں نے کہا، 'وہ آخر کتنا یاد رکھ سکتے ہیں؟ یہ بہت مشکل ہے، اگر مجھے معلوم ہوتا کہ ایسا کچھ ہونے والا ہے تو میں ایک ڈائری بھی لکھتا جس میں ہر چھوٹی سے چھوٹی تفصیل کا ذکر ہوتا۔

میں نے ان سے تحصیل دار کے بارے میں پوچھا۔ انہوں نے کہا، 'اس کا نام سکندر تھا، وہ کپواڑہ کا تحصیلدار تھا لیکن ترہ گام علاقہ بھی اس کے دائرہ اختیار میں تھا۔ میں نے ان سے دوبارہ پوچھا کہ انہیں اس واقعہ کے بارے میں کس نے بتایا اور گاؤں والوں کے ذریعے لکھے گئے خط کا کیا ہوا، جو 25 یا 26 فروری 1991ء کو لکھا گیا لیکن 4 مارچ کو جمع کرایا گیا تھا۔ یاد رکھنے کی واضح کوشش کرتے ہوئے انہوں نے کہا،

'مجھے لگتا ہے کہ وہ اسے مجھ تک پہنچانے کے قابل نہیں تھے حالاں کہ انہوں نے اسے 26 فروری کو لکھا تھا۔ انہیں یاد آیا کہ انہوں نے کچھ افواہیں سنی تھیں اور 2 یا 3 مارچ کو بارہ مولہ کے اسپیشل کمشنر کو مطلع کیا تھا جس پر انہوں نے کہا، 'اس طرح کے واقعات ہوتے رہتے ہیں۔ میں نے ان سے پوچھا کہ مجھے کیا کرنا چاہئے۔ انہوں نے کہا کہ آپ اپنی سرکاری حیثیت میں جو چاہیں کریں۔ اس نے مجھ سے باضابطہ شکایت حاصل کرنے کو کہا۔ چوں کہ اس دن کوئی تحریری شکایت نہیں تھی، اس لیے یاسین موقع پر نہیں پہنچ سکے۔ اگلے دن تحصیل دار اور گاؤں کا محافظ جمعہ شیخ ان سے ملنے آئے اور انہیں گزشتہ رات کے بارے میں تفصیل سے بتایا۔ اسی دن گاؤں والوں کا لکھا ہوا خط ان کے دفتر پہنچا (انھیں یقین نہیں تھا کہ وہ اسے ساتھ لے کر آئے یا ان کے سامنے پہنچا)۔

میں نے ان سے پوچھا کہ کیا انہیں لگتا ہے کہ خط کو چھپایا گیا ہے کیوں کہ یہ 26 فروری کو لکھا گیا تھا۔ انہوں نے کہا کہ میں ایسی کوئی بات نہیں کہہ سکتا جو مجھے یاد نہ ہو۔ لیکن انہیں یاد آیا کہ جمعہ شیخ اور سکندر ملک کے سامنے انہوں نے وجاہت حبیب اللہ کو فون کیا،

جنہوں نے انہیں جڑواں گاؤں کا دورہ کرنے اور ضرورت پڑنے پر تحریری رپورٹ پیش کرنے کا حکم دیا۔

یاسین نے 5 مارچ کو دونوں دیہات کا دورہ کیا اور 7 مارچ کو اپنی رپورٹ لکھی۔ انہوں نے اس میں کشمیر کے ڈویژنل کمشنر کو مخاطب کیا۔ یہ وہ رپورٹ تھی جو میڈیا میں لیک ہوئی تھی۔ یاسین نے کہا کہ انہوں نے احکامات پر عمل کیا اور جو کچھ دیکھا اس کی اطلاع دی۔ وہ بتاتے ہیں 'میرے اعلیٰ حکام نے مجھے تحقیقات کرنے اور سرکاری طور پر اقدامات کرنے کا حکم دیا اور میں نے یہی کیا۔ بعد میں وہ میرے اٹھائے گئے اقدامات سے ناراض ہو گئے۔ یاسین نے اپنی رپورٹ میں کہا تھا کہ اس معاملے کی مناسب تحقیقات ہونی چاہیے۔ جون 1991ء کے مہینے میں، پی سی آئی کی ٹیم یاسین سے ملی، لیکن، بہت سے دوسرے لوگوں کی طرح، ان کا بھی ماننا ہے کہ ٹیم نے کبھی ''کنن پوش پورہ'' کا دورہ نہیں کیا۔ یاسین کے مطابق ان کے ماتحت تحصیلدار کو ٹیم کی حفاظت کی ذمہ داری سونپی گئی تھی اور وہ مسلسل ان کے ساتھ تھے۔ یاسین کے مطابق ''وہی ان کی نقل وحرکت کے بارے میں بہتر جانتے ہوں گے''۔

ایس ایم یاسین نے اپنی رپورٹ کی بدولت سامنے آنے والے سرکاری اور غیر سرکاری نتائج کے بارے میں بات کی۔ انہوں نے پولیس افسران، اعلیٰ سرکاری عہدیداروں کے ساتھ ساتھ فوجی عہدیداروں کا بھی نام لیا، جنہوں نے انہیں دھمکیاں دی تھیں اور ڈرانے دھمکانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اپنے دوسرے انٹرویو میں وہ بات کرنے سے زیادہ ہچکچا رہے تھے۔ انہوں نے درخواست کی کہ کچھ چیزیں ریکارڈ سے باہر رہیں۔ چونکہ وہ بظاہر بیمار دکھائی دے رہے تھے اس لیے میں انٹرویو کو طول دینا یا ان پر مزید دباؤ ڈالنا نہیں چاہتی تھی۔

اپنے تبادلے کے بعد 1994ء میں ریٹائرمنٹ کے وقت یاسین کے پاس زرعی افسر اور اسپیشل آفیسر اوقاف (مسلم انڈومنٹ ٹرسٹ) کا اضافی چارج تھا۔ 1991ء کے آرکائیوز میں یاسین کو ایک بہادر وسل بلوور (گھنٹی بجانے والے) کے طور پر پیش کیا گیا ہے

اور 25 سال بعد بھی لوگ ان کی بہت عزت کرتے ہیں۔ وہ ایک راست باز آدمی کی طرح دھمکیوں کے باوجود متاثرین کو ان کا حق دلانے کے لئے کھڑے ہوئے۔ میں نے انہیں اب بھی اس حوالے سے پرامید پایا کہ ان لوگوں کو انصاف مل سکتا ہے کیوں کہ ہمارے پاس اب بھی اس واقعے کے متاثرین کی زبانی کہانیاں موجود ہیں، حالاں کہ زیادہ تر جسمانی ثبوت ضائع ہو چکے ہیں۔ یاسین کے خیال میں ''اگر ہم کچھ حاصل نہ بھی کریں تو بھی ہم یہ پیغام دیں گے کہ ہم کچھ نہیں بھولے ہیں اور نہ ہی بھولیں گے''۔ میں بہت کم ایسے لوگوں سے ملی ہوں جنہیں قطعی بےخوف پایا۔ میرے لیے ایس ایم یاسین ایک ہیرو ہیں۔

☆......☆

مجھے انکاؤنٹر میں ہلاک کر دیں گے

یادداشت کو کمزور کہا جاتا ہے۔ اگر ایسا ہے تو ہم کوئی نتیجہ کیسے اخذ کر سکتے ہیں؟ لیکن سچائی ٹکڑوں میں زندہ رہتی ہے۔ لوگوں کا انٹرویو کرتے ہوئے میں نے نئے حقائق اور معلومات دریافت کیں، جن میں سے کچھ متضاد تھیں، کچھ نے واقعے کی تصدیق کی اور کچھ نے نئے سوالات کو جنم دیا لیکن گمنام رہنے کی خواہش، خاموشی اور بھول نے سچائی اور یادوں پر غلبہ پا لیا۔ جب میں نے یہ باب لکھنا شروع کیا، تو میں نے سوچا کہ میں لوگوں کے بیان کردہ تجربات سے سچائی کو تلاش کرنے کے قابل ہو جاؤں گی کیونکہ مجھے توقع تھی کہ وہ اس خوفناک تاریخ کو واضح طور پر یاد رکھیں گے کیونکہ انہوں نے اس کا سامنا کیا تھا لیکن میں نے اس کے بجائے یہ جانا کہ سچائی اور یادیں یکجا نہیں بلکہ منقسم ہیں۔

اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ ہم کنن پوش پورہ کے بارے میں سچائی بتانے والے لوگوں کے قصوں کو جوڑنے کی کتنی ہی کوشش کریں اس کہانی کے بعض ٹکڑے ہمیشہ کے لئے گم ہو چکے ہیں، اور کچھ یادیں وقت گزرنے یا حالات کی وجہ سے نئی شکل اختیار کر گئی ہیں۔ ایسے لوگوں کی بہت سی کہانیاں ہیں جن کے بارے میں ہم کبھی نہیں سنیں گے یا نہیں جانیں گے۔ یقیناً ایس ایم یاسین اور یوسف جمیل کو وسل بلور (خبر دینے والا) سمجھا جائے گا لیکن ایسے لوگ بھی ہیں جنہیں اس تاریخ میں ہیرو کے طور پر کبھی یاد نہیں کیا جائے گا، جیسے گاؤں کا گارڈ جمعہ شیخ اور کانسٹیبل عبدالغنی، جنہوں نے اس المناک واقعے کے متاثرین کی مدد کے لئے بہت کچھ کیا۔

جب ہم نے کتاب مرتب کرنے پر کام شروع کیا تو ہم نے بہت سارے انٹرویو

کرنے کا سوچا تھا لیکن بہت سے لوگوں کا انٹرویو نہیں کیا جا سکا، ان میں سے کچھ کو تلاش کرنا مشکل تھا تو بہت سے دوسرے اپنی زبان کھول کر ریاست کا مقابلہ کرنے کے لئے تیار نہیں تھے لہٰذا انہوں نے خاموش رہنا پسند کیا۔ جن لوگوں سے ہم نے بات کی ان میں سے ایک شخص اس حقیقت کے باوجود نام ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا کہ گاؤں والوں نے اس کی بروقت مدد کے لیے اسے ہیرو سمجھا۔ ہم سے بات کرتے ہوئے اس نے کہا تھا:

''اس کے قوی امکانات ہیں کہ کچھ ایجنسیوں کے لوگ آپ کا پیچھا کر رہے ہوں گے اور جیسے ہی آپ یہاں سے نکلیں گے کچھ مسلح افراد اندر گھس جائیں گے اور مجھے انکاؤنٹر میں ہلاک کر دیں گے جیسا کہ انہوں نے کانسٹیبل عبدالغنی کے ساتھ کیا تھا۔ آپ سب واپس سری نگر چلے جائیں گے، لیکن مجھے یہیں رہنا ہے''۔

ہمیں اس پر مایوسی ہوئی کہ اس نے ہم سے بات کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ ہمارے لئے ایک عذر یا مبالغہ کی طرح محسوس ہوا، لیکن ایک دن بعد، ہم نے کنن میں دھماکے اور ہتھیاروں کی جعلی برآمدگی کے واقعے کے بارے میں سنا جس سے ہمیں احساس ہوا کہ ان کے خدشات بے بنیاد نہیں تھے۔ اس سے ان لوگوں کی آوازیں اور بھی زیادہ قابل ذکر اور جرات مند ہو جاتی ہیں جنہوں نے آواز اٹھائی ہے۔ اس طرح کی یادوں کا ریکارڈ صرف اس معاملے میں ہی نہیں بلکہ سینکڑوں دیگر ایسے معاملات میں بھی رکھا جانا چاہیے جن پر پردہ ڈالا جا چکا ہے اور وہ تاریخ میں گم ہو چکی ہیں۔ اس بات کو تسلیم کرنے سے ہی کہ کشمیر کی خواتین صرف اس درندگی کا نشانہ ہی نہیں بنیں بلکہ وہ اس کی زندہ متاثرین ہیں، ہم آخر کار عصمت دری کے اردگرد موجود خاموشی اور شرمندگی کے حصار کو توڑ سکتے ہیں اور ان کی کہانیوں کا کم از کم کچھ حصہ بازیافت کر سکتے ہیں۔

☆......☆

نواں حصہ

ہندوستانی کشمیریوں کو بھول گئے

2012ء کے دہلی ریپ کیس نے ہندوستان کو ہلا کر رکھ دیا تھا جب سول سوسائٹی اور سپریم کورٹ اور پارلیمنٹ جیسے اعلیٰ سرکاری ادارے خواتین کے خلاف جنسی تشدد پر آواز اٹھانے کے لیے بیدار ہو گئے تھے، ایک ناقابل معافی جرم کے طور پر عصمت دری ہر جگہ موضوع بحث بنی ہوئی تھی تاہم اس کے باوجود کنن پوش پورہ اور کشمیر میں بھارتی مسلح افواج کی طرف سے عصمت دری کے واقعات شاذ و نادر ہی سامنے آئے۔ جب دہلی میں مظاہرین نے پدر شاہی اور جنسی تشدد سے آزادی کا مطالبہ کرنے کے لئے 'آزادی' کے مشہور نعرے کا استعمال کیا، تو ایسا لگا کہ وہ کشمیریوں کو بھول گئے جو ابھی تک آزاد نہیں ہیں۔ جسٹس ورما کمیٹی کی رپورٹ میں افسپا جیسے قوانین میں تبدیلی کا مطالبہ کرتے ہوئے کہا گیا ہے کہ اس طرح کے قوانین مسلح افواج کے ذریعہ منظم جنسی تشدد کے خلاف استثنیٰ کو مضبوط کرتے ہیں لہٰذا وہ ایسے معاملات کو عام فوجداری قانون کے تحت لانے کی سفارش کرتے ہیں۔

فروری 1991ء کے اجتماعی عصمت دری کے واقعہ پر 22 سال کی بے عملی، پردہ پوشی اور متاثرین کے خلاف شرمناک الزام تراشی کا کوئی حوالہ نہیں دیا گیا، جو شاید برصغیر میں اب تک کا سب سے بڑا جنسی جرم تھا۔ اس بات کو تسلیم نہیں کیا گیا تھا کہ کشمیر میں استثنیٰ نہ صرف افسپا یا کسی اور قانون کی وجہ سے ہے بلکہ یہ روزمرہ زندگی کی ایک حقیقت بھی ہے۔ جیسا کہ انسانی حقوق کے محافظ خرم پرویز کہتے ہیں۔

''استثنیٰ اس حقیقت کی وجہ سے ہے کہ یہاں خاص طور پر قابض افواج کے لیے کوئی قانون نہیں ہے، یہاں صرف فوجی قبضے کی لاقانونیت ہے۔ کیا عصمت دری اس کے مجرمان، بربریت، جگہ یا لوگوں کے لحاظ سے مختلف ہے؟ کیا بھارت میں ریپ قابل سزا ہے، لیکن کشمیر میں ریپ اس صورت میں جائز ہے جب وردی میں ملبوس کشمیر میں بھارت کی عزت کے محافظ ہی اس کے مرتکب ہوں۔''

میرے لئے اس کام کی شروعات ایک فون کال سے ہوئیں۔ میری دوست ثمرینہ، جو جموں کشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی سی ایس) میں کام کرتی ہے، نے ایک دن مجھے ایک بہت ہی غیر معمولی سوال کے ساتھ فون کیا: ''کیا تمہیں ''کنن پوش پورہ'' یاد ہے؟ مجھے تو یاد ہے، بہت کم لوگ ایسے ہیں جنہوں نے 1991ء کے اس شرمناک واقعے کے بارے میں نہ سنا ہو جس نے کشمیر کی خونی، سیاہ تاریخ میں ہمیشہ کے لیے دو گاؤں 'کنن' اور 'پوش پورہ' کو یکجا کر دیا۔

نوجوان خواتین کا ایک گروپ جے کے سی سی ایس کے دفتر میں جمع ہوا اور اس بات پر تبادلہ خیال کیا کہ ہمیں 22 سال قبل ہوئی اجتماعی عصمت دری کے بارے میں بات کیوں کرنی چاہئے۔ ہمیں سوال کے اندر ہی جواب مل گیا، حقیقت یہ تھی کہ ایسا ہوا تھا۔ کیا ہم وہ عورتیں، کشمیری عورتیں نہیں ہیں، جواب بھی بھارتی مسلح افواج کے سائے تلے زندگی بسر کر رہی ہیں۔ کون کہتا ہے کہ ایک اور کنن پوش پورہ نہیں ہوگا؟ کیا شوپیاں ڈبل ریپ اور قتل کا کیس 2009ء میں نہیں ہوا تھا؟ یہ ایک ایسی چیز تھی جس نے ہمیں پریشان کیا، کچھ ایسا جس نے ہمیں الجھن میں مبتلا کیا۔ اس کے علاوہ کیا یہ ہندوستانی حکام کا عمومی رویہ نہیں تھا کہ سچ کو دفن کرو اور انصاف سے انکار کرتے رہو؟

یہ ایک مقدمے کے ذریعے اپنے اجتماعی غصے کا صحیح اظہار کرنے اور انصاف کے لئے متاثرین کی جدوجہد کو جاری رکھنے کا ایک موقع تھا۔ یہ پی آئی ایل ایک اور متوازی

جدوجہد کا آغاز تھی: ایک قانونی جدوجہد، ہندوستانی ریاست کے مسلسل استثنیٰ اور جھوٹ کو بے نقاب کرنے کی جدوجہد، بھولنے اور مجرمانہ پردہ ڈالنے کے خلاف جدوجہد، عوامی یادوں کو واپس لانے کی جدوجہد، اور ''کنن پوش پورہ'' کی حمایت کی جدوجہد۔

اس پی آئی ایل کا مسودہ ایک اور شریک مصنف اور وکیل منزہ راشد نے وکیل پرویز امروز کی رہنمائی میں تیار کیا تھا۔ ابتدائی طور پر تقریباً 100 خواتین نے پٹیشن پر دستخط کرنے پر رضامندی ظاہر کی تھی۔ درخواست گزار نوجوان طالب علم، پیشہ ور اور کچھ عمر رسیدہ خواتین تھیں جو بھارتی قبضے کی بہت سی غلطیوں میں سے ایک کے خلاف بولنے کی مشترکہ ضرورت سے منسلک تھیں۔

سری نگر ہائی کورٹ کی رجسٹری نے ہمیں مطلع کیا کہ ان کے ترمیم شدہ قواعد کے تحت ہر درخواست گزار کو اپنی شناخت ثابت کرنے کے لئے ایک دستاویز فراہم کرنے کی ضرورت ہے جس کے بعد ہم نے درخواست گزاروں کی تعداد 50 تک گرتے ہوئے دیکھی۔ خوف، جوش و خروش اور بڑھتے قدم روک سکتا ہے۔ کچھ خواتین نے شناخت کے خوف سے دستبرداری اختیار کی، کچھ کو اپنے کیریئر کے بارے میں ڈر تھا اور کچھ نے کہا تھا کہ ان کے پاسپورٹ منسوخ ہو جائیں گے، آخر کار 20 اپریل 2013ء کو 50 خواتین کے نام اور شناختی کارڈ کے ساتھ ہائی کورٹ میں دوبارہ مفاد عامہ کی عرضی (پی آئی ایل) دائر کی گئی۔

میں نے مئی 2013ء کے اوائل میں پہلی بار ہائی کورٹ کا دورہ کیا، تاکہ اس معاملے کی اولین ساعتوں میں سے ایک میں شرکت کر سکوں۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے میں ایک ہائی سکیورٹی زون میں قدم رکھ رہی ہوں جہاں میرے جسم اور میرے سامان کے ہر حصے کی جانچ پڑتال کی گئی تھی جس سے مجھے شرمندگی کا احساس ہوا۔ مجھے اس وقت کمرہ عدالت میں بیٹھ کر ججوں کا انتظار کرتے ہوئے اونچی چھت سے لمبی بالیوں کی طرح لٹکنے والے پنکھے نصب کرنے والوں کو داد دینا یاد ہے۔ کمرہ عدالت نوجوان خواتین اور کچھ مردوں سے بھرا ہوا تھا،

ان میں تمام درخواست گزار نہیں تھیں بلکہ دیگر ایسے لوگ بھی تھے جو اس کیس کے بارے میں جاننے اور عدالت میں اس کی پیروی کے حوالے سے متجسس تھے۔ ہائی بنچ پر براجمان دونوں ججوں کے درمیان مفاد عامہ کی عرضی کی قبولیت اور طویل عرصہ قبل ہوئے ایک معاملے کی تلافی کے طور پر پی آئی ایل کے موزوں ہونے کے متعلق بحث جاری تھی جبکہ ہم نوجوان خواتین، کچھ متاثرین کے ساتھ عدالت میں خاموشی سے بیٹھی سب کچھ دیکھ رہی تھیں۔

دریں اثنا، پولیس نے مارچ 2013ء میں کپواڑہ کے مجسٹریٹ کے روبرو اچانک اس معاملے کی جانچ کے بارے میں بندش کی ایک رپورٹ داخل کی جس میں کہا گیا تھا کہ اس معاملے کو سرکاری طور پر بند کر دیا جائے، کیوں کہ کوئی ثبوت نہیں ملا ہے، اور یہ 32 سال سے زیادہ عرصہ گزرنے کے بعد ہوا تھا جب سرکاری فائلوں پر غیر رسمی طور پر اس معاملے کو 'بند' کر دیا گیا تھا۔ ہم نے محسوس کیا کہ ایسا پی آئی ایل کو مات دینے کے لئے کیا گیا تھا جسے اس وقت تک جمع نہیں کرایا گیا تھا لیکن جس کے بارے میں شاید پولیس کو پتہ چل گیا تھا۔ چوں کہ پولیس نے اب جا کر کلوزر رپورٹ داخل کی تھی، اور مجسٹریٹ کو ابھی اس پر غور کرنا تھا، اس لیے ہائی کورٹ نے 23 سال کی تاخیر سے کلوزر رپورٹ داخل کیے جانے کے باوجود جانچ کی نگرانی نہ کرنے یا مداخلت نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ تین سماعتوں کے بعد ہائی کورٹ نے اس پی آئی ایل کو 'قبل از وقت' قرار دیتے ہوئے نمٹا دیا تھا۔

ہر سماعت میں ایک چیز عام تھی: خواتین کے جائے وقوعہ سے چلے جانے کے بعد کمرہ عدالت ویران ہو گیا، صرف وکلاء اور چند لوگ بنچوں پر بیٹھے ہوئے تھے۔ کھچا کھچ بھرے کمرہ عدالت سے خالی بنچوں تک، یہ تبدیلی واقعی قابل ذکر تھی۔ ایک ایسے کیس میں ایک بار پھر دلچسپی پیدا ہوئی جسے مردہ اور فراموش کر دیا گیا تھا۔ ''کنن پوش پورہ'' اب مقامی اخبارات میں پہلے صفحے پر بڑے حروف میں شائع ہوتا تھا، یہ ہندوستانی اور بین الاقوامی نیوز چینلوں پر چمکتا تھا جس سے فراموش ماضی کے آسیب واپس آ جاتے تھے۔ لوگ اب ان

دیہاتوں اور وہاں ہونے والے المناک جرائم سے واقفیت حاصل کر چکے ہیں۔ جیسا کہ وکیل پرویز امروز نے کہا، 'میڈیا کی شمولیت نے اسے عوامی طور پر جوابدہ کیس بنا دیا۔ پی آئی ایل نے نہ صرف لوگوں کی یادوں کو تازہ کرنے کا کام کیا بلکہ اس معاملے پر کام کرنے کے لیے خواتین اور سول سوسائٹی کے گروپس کو بھی اکٹھا کیا۔

ایک لمحے کے لیے، جب ہم نے سنا کہ عدالت نے کیا کہا ہے، تو ہم میں سے بہت سے لوگوں میں مایوسی پھیل گئی، یہ قانون سے لاعلم سادہ لوح لوگ تھے جنہوں نے سوچ لیا تھا کہ فتح قریب ہے۔ تاہم ہمیں بعد میں احساس ہوا کہ کیس ختم کئے جانے کے باوجود، کئی طریقوں سے اس میں ہماری جیت ہوئی تھی، خاص طور پر نوجوان خواتین کو اب کشمیر کی خواتین کے طور پر بولنے کی ترغیب ملی۔ بلاشبہ یہ شکوک وشبہات اور اندیشوں کے دن تھے، بے شمار سوالات تھے۔ 23 سال بعد کیس دوبارہ کیوں کھولا گیا؟ ہم نے اس سے کیا حاصل کرنے کی کوشش کی؟ ہم ڈر گئے تھے کیونکہ یہ ہمارے معمول کے برخلاف تھا، ثمرینہ نے اس صورتحال کو جامع طور پر بیان کیا ہے:

''ہم نے عرضی اس لئے دائر نہیں کی کہ ہمیں نظام سے انصاف کی توقع ہے بلکہ ہم ہندوستانی فوج کو جوابدہ بنانا چاہتے تھے تاکہ انہیں سمجھایا جا سکے کہ انہیں ایسی کھلی آزادی نہیں مل سکتی کہ ایک ہی جرم کو دوہرا سکیں۔ ہماری جدوجہد نتائج کے لیے نہیں بلکہ مزاحمت کے ایک ایسے کلچر کو فروغ دینے کیلئے ہے جہاں لوگ جرم سے استثنٰی پر سوال اٹھائیں، جہاں ہم ناانصافی کے سامنے خاموش نہ رہیں۔ یہ خوف کہ ہمارے ساتھ بھی ایسا ہو سکتا ہے اس خوف سے کہیں زیادہ ہے کہ ہمارے کیریئر تباہ ہو جائیں گے۔ عزت اور وقار کے ساتھ زندگی گزارنا کسی بھی چیز سے زیادہ اہمیت رکھتا ہے''۔

ایک اور درخواست گزار کا کہنا تھا کہ 'ظالم مضبوط ہو گیا ہے کیوں کہ مظلوم اس کے بارے میں بات نہیں کر رہے جب کہ انصاف کا مطالبہ کرنے میں ڈرنے کی ضرورت نہیں، بھلے ہی آپ یہ چیز ظالم اور سفاک ترین قابضین سے مانگ رہے ہوں۔

کپواڑہ کی طرف منتقلی

پی آئی ایل دائر ہونے کے بعد ''کنن پوش پورہ'' ایک جانا پہچانا نام بن گیا، خاص طور پر سری نگر میں جہاں یہ معاملہ صحافیوں اور اس میں دلچسپی رکھنے والے سماجی کارکنوں کے لیے قابل رسائی تھا۔ دریں اثنا، پی آئی ایل کی سماعت کے دوران، جس میں وہ شرکت کرنے آئے تھے، ''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں نے سری نگر میں قانونی ٹیم کو مطلع کیا کہ انہیں جانچ کے لئے کپواڑہ مجسٹریٹ کی عدالت میں بلایا جارہا ہے۔ جے کے سی سی ایس کے وکلاء کی ایک ٹیم نے کپواڑہ کا دورہ کیا جہاں انہیں پتہ چلا کہ جوڈیشل مجسٹریٹ، پولیس کی کلوزر رپورٹ کی بنیاد پر معاملے کو بند کرنے یا نہ کرنے کے معاملے میں ٹال مٹول سے کام لئے جانے کے دوران، کھلی عدالت میں متاثرین کے بیانات ریکارڈ کررہا تھا اور یوں ان کی توہین کرتے اور انہیں صدمہ پہنچاتے ہوئے عصمت دری کے معاملات میں سپریم کورٹ کی ہدایات کی خلاف ورزی کررہا تھا۔

وکلاء نے اس عمل کو روک دیا اور 10 جون 2013ء کو پولیس کی طرف سے کیس بند کرنے کی کوشش اور 4 راجپوتانہ رائفلز کے 125 فوجی اہلکاروں سے جن کے اس رات فوج کے آپریشن میں ملوث ہونے کے کافی ثبوت موجود ہونے اور فوج کی طرف سے اپنے آپریشن میں حصہ لینے والے فوجی اہلکاروں کے ناموں کی فہرست جمع کرائے جانے کے باوجود، تفتیش میں ناکامی کے خلاف متاثرین کی جانب سے عدالت میں ایک تحریری احتجاجی درخواست دائر کی۔ گویا ریاست کے ردعمل نے متاثرین کو قانونی تلافی کے موقع سے محروم کیا اور الٹا ان کی توہین کی۔ پولیس کے وکیل نے متاثرین کے احتجاجی درخواست دائر کرنے

کے حق کے خلاف دلائل دیے اور یہ بھی کہا کہ درخواست صرف نقد معاوضہ حاصل کرنے کے لئے دائر کی گئی تھی، تحقیقات میں تاخیر کے لئے متاثرین کو ذمہ دار ٹھہرایا گیا تھا، جب کہ اصل میں ذمہ داری ریاست پر عائد ہوتی ہے۔

18 جون 2013ء کو ایک چھوٹی سی فتح اس وقت سامنے آئی جب کپواڑہ کے سب جوڈیشل مجسٹریٹ نے پولیس کلوزر رپورٹ کے نتائج کو مسترد کرتے ہوئے کہا کہ عصمت دری کا کوئی ثبوت نہیں ہے نیز سینئر سپرنٹنڈنٹ آف پولیس کو تین ماہ کے اندر مزید تحقیقات کرنے کا حکم دیا۔ یہ کیس سے جڑے ان تمام لوگوں کے لئے ایک کامیابی تھی جنہوں نے خوف، بدنامی اور صدمے کا مقابلہ کرنے کے ساتھ ساتھ، شکوک وشبہات، تنقید اور کیس کو بند کرنے کی بار بار کوششوں کی بھی مزاحمت کی تھی۔ 22 سال تک کوئی کارروائی نہ ہونے کے بعد بالآخر کیس کو مزید تحقیقات کے لیے دوبارہ کھول دیا گیا جس پر ہم واقعی خوش تھے کیوں کہ سرنگ کے آخری سرے پر روشنی مکمل طور پر ختم نہیں ہوئی تھی، مجرموں کو مکمل طور پر چھوڑا نہیں گیا تھا، گاؤں والوں کے خلاف جو جرم کیا گیا تھا، آخر کار 23 سال بعد اسے ایک نام ملا، اور پہلی بار ان باتوں اور شواہد پر ان لوگوں کے مقابلے میں بھروسہ کیا گیا جو ان کی ساکھ پر لگا تار شک کررہے تھے۔ یہ اس معاملے کی پردہ پوشی کو ختم کرنے کی طرف پہلا قدم تھا۔

☆......☆

اس دوران...

''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین کو انصاف دلوانے کے لیے قائم سپورٹ گروپ (ایس جی کے پی) نے قانونی جدوجہد کے ساتھ ایک مہم شروع کی۔ ہمیں زیادہ سے زیادہ لوگوں تک پہنچنے کے لئے اس کیس کی ضرورت تھی تاکہ متاثرین کی آواز کپواڑہ کے ایک کمرہ عدالت تک محدود نہ رہے بلکہ کشمیر کے وسط اور دیگر جگہوں تک سنی جائے۔ پردہ پوشی میں ملوث انتہائی قابل احترام 'لوگوں کو نہ صرف قانونی طور پر بلکہ اخلاقی طور پر بھی جوابدہ بنایا جانا تھا۔ اپنے بیانات، تحریروں اور 'سرکاری تحقیقات کے ذریعے متاثرین کی بار بار توہین کرنے کے ذمہ دار، پی جی ورگیس اور وجاہت حبیب اللہ کے خلاف بائیکاٹ مہم کا اعلان کیا گیا تھا۔ اس مہم میں حقائق کو چھپانے والے لوگوں کو کشمیری سول سوسائٹی کے سامنے اخلاقی طور پر جوابدہ ٹھہرایا گیا۔

بدقسمتی سے، اس ریاست کے لیے، جو پرویز امروز کے مطابق ہمیشہ تنازعات والے علاقے میں لوگوں کو تقسیم کرنے کی کوشش کرتی ہے، یہ معاملہ اس کے بالکل برعکس تھا کیوں کہ یہ درد پورے کشمیر میں محسوس کیا گیا۔ جون 2013ء میں ایک پریس کانفرنس میں پہلی بار عوامی سطح پر بات کرتے ہوئے، کیس کو دوبارہ کھولنے اور بائیکاٹ مہم کا اعلان کرتے ہوئے متاثرین نے جو آنسو بہائے تھے، وہ بہت سے دیگر لوگوں نے ان کی جنس یا جغرافیہ سے قطع نظر شیئر کیے تھے گویا ہم اپنے احساسات اور اظہار میں ایک تھے۔

دریں اثناء بھارت کے اس وقت وزیر خارجہ سلمان خورشید نے ''کنن پوش پورہ'' کی اجتماعی عصمت دری کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ عوام کو اب بھول جانا چاہیے اور

معاف کر دینا چاہیے۔ ایسے معاملے میں 'معافی' کی تلقین ظالموں کا ساتھ دینا اور ان کے اعمال کا جواز پیش کرنا ہے۔ انہیں اس واقعے کو تسلیم کرنے میں 23 سال لگے۔ انصاف ملنے تک یہ سوال ہوا میں لٹکا رہا۔

فروری 2014ء میں، اجتماعی عصمت دری کو 23 سال مکمل ہونے پر، ایس جی کے پی کی طرف سے ایک پروگرام کا اہتمام کیا گیا۔ 23 فروری کو کشمیری خواتین کے یوم مزاحمت کے طور پر منانے سے مزاحمتی تحریک کو ایک نئی جہت ملی جس میں خواتین نے کئی طریقوں سے حصہ لیا۔ پروگرام کے دوران ایک متاثرہ خاتون نے اسٹیج سے بات کی، جس کا چہرہ پہلی بار کھلا ہوا تھا۔ اس وقت کے ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین سمیت دیگر لوگوں نے بھی اس پر بات کی۔ مقررین میں متاثرین کے بچے، اس کیس کی ایک درخواست گزار اور شوپیاں عصمت دری اور قتل کے متاثرین کے اہل خانہ بھی شامل تھے۔ آزادی ٹروپ نامی ایک نوجوان تھیٹر گروپ نے کشمیر میں جنسی تشدد کے استعمال پر طنز و مزاح پر مبنی شو پیش کیا جہاں پورا ہال ان جگہوں کے ناموں سے بھرا ہوا تھا جہاں شہروں، قصبوں، دیہات میں ریاستی اہلکاروں نے عصمت دری کی تھی۔ کشمیر کے وہ گاؤں، جنہیں بھلا دیا گیا تھا، ڈرامے کے دوران دل ہلا دینے والے شور میں انہیں پھر سے یاد کیا گیا۔ ہال کو کشمیری خواتین کی طاقت اور بقا کی یاد میں پوسٹرز اور بینرز سے بھر دیا گیا تھا اور اس موقع پر سامعین نے ان واقعات کو یاد رکھنے اور ہر قسم کے ظلم کی مزاحمت کرنے کے اپنے عزم کا اعادہ کیا تھا۔ پروگرام کے اختتام تک ایک آنکھ بھی ایسی نہیں تھی جو خشک رہی ہو۔

☆......☆

بھارتی فوج کی جوابی کارروائی

نومبر 2013ء میں بھارتی فوج نے مجسٹریٹ کی جانب سے جاری کیس کی تحقیقات کے حکم کے خلاف سیشن کورٹ میں نظر ثانی کی درخواست دائر کی تھی۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ اس کیس کو بند کیا جائے، جس کا دلچسپ مطلب یہ تھا کہ ملزمان عدالت سے کھلے عام کہہ رہے تھے کہ ثبوت جنہیں ایک جج نے قابل قدر پایا، موجود ہونے کے باوجود ان کی تحقیقات نہ کی جائیں۔ ہم جانتے تھے کہ یہ تاخیر کی سوچی سمجھی حکمت عملی تھی جس کا مقصد وکلاء اور کارکنوں کو تھکانا تھا۔ کوئی بھی مہینے میں چار بار کپواڑہ کا سفر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

بھارتی مسلح افواج جانتی تھیں کہ سخت ترین سردی میں 200 کلومیٹر کا سفر طے کر کے ایک غیر موثر سماعت میں شرکت کا احساس لوگوں کی کمر توڑ دے گا، جہاں زیادہ تر امکان ہے کہ ریاست کے وکیل غیر حاضر ہوں گے، یا کسی بہانے سے ایک اور التوا کا مطالبہ کریں گے، یا جج خود چھٹی پر ہوں گے یا دلائل سننے کے لئے ان کے پاس وقت نہ ہوگا۔ وہ جانتے تھے کہ میڈیا کے لیے اب اس معاملے کی کوریج کرنا اتنا آسان نہیں ہوگا، اور یہ بھول ایک بار پھر عوام کی یادوں پر چھا جائے گی لیکن اس کہانی کے ایک دلچسپ موڑ پر، کپواڑہ پھر سے ایک منزل بن گیا، جس سے ہم بہت جلد شناسا ہوتے گئے۔

ہم میں سے بہت سے لوگوں کے لیے سیشن کورٹ میں کیس کی سماعتوں میں شرکت کپواڑہ جانے کا یہ پہلا موقع تھا، وہی کپواڑہ جو آج تک بھارتی مسلح افواج کی بھاری تعداد میں موجودگی اور انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے متعدد واقعات کی وجہ سے خوف زدہ ہے۔ یہ سفر اس وحشیانہ قبضے کی ایک اور دردناک یاددہانی تھی جس کے تحت ہم رہ رہے

ہیں، جسمانی اور نفسیاتی رکاوٹوں کی حدیں جو ہمیں گھورتی ہیں۔ فوج کی جانب سے غیر قانونی طور پر قبضہ کیے گئے زمین کے نہ ختم ہونے والے حصوں پر بل بورڈ لگائے گئے ہیں، جن پر بڑی معصومیت سے 'جوان اور عوام، امن ہے مقام' کا اعلان کیا گیا ہے۔ کبھی کبھی مجھے ہنسی آتی ہے کہ وہ 'امن' جیسے لفظ کو بھی جانتے تھے جس کا کپواڑہ میں کوئی وجود نہیں اور جہاں آپ جنگل دیکھنے اور وحشیانہ قتل اور عصمت دری کے مناظر کا تصور کیے بغیر نہیں رہ سکتے ہیں اور پھر بھی کپواڑہ کی عدالت میں آپ کا استقبال کرنے کا ایک بہت ہی غیر معمولی طریقہ ہے، جیسا کہ منزا نے اپنی عدالتی ڈائری میں لکھا ہے:

''میرے جیسی لڑکی کے لیے جو شہر کے مرکزی علاقوں میں الجھن کا شکار ہے کہ ایک کدل (سرینگر کے مرکزی علاقوں کی نشاندہی کرنے والے پل) کہاں ختم ہوتا ہے اور دوسرا کہاں شروع ہوتا ہے، اب مجھے یاد آیا کہ کپواڑہ کہاں سے شروع ہوا تھا۔ میرے لئے یہ ایک ایسے مقام پر شروع ہوا جس نے مجھے الہٰ دین اور اس کی خوبصورت شہزادی یاسمین کی کہانی کی یاد دلا دی۔ کپواڑہ کے آغاز میں واقع عظیم الشان مسجد میں اس محل کے مینار تھے جس میں شہزادی یاسمین رہتی تھی۔''

جادوئی نظر آنے والے میناروں کے فوراً بعد، 'ڈسٹرکٹ اینڈ سیشن کورٹ، کپواڑہ' کا اعلان کرنے والا ایک خستہ حال لوہے کا بورڈ آپ کو اس جگہ پر خوش آمدید کہتا ہے۔ صحن کیچڑ سے اتنا بھرا ہوا ہے کہ عدالت کی ناسازگار عمارت پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بھی آپ اپنے کپڑوں کو بچانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ ایسا محسوس نہیں ہوتا جس کی میں نے توقع کی تھی۔ احاطے میں ہر طرف مردوں، عورتوں اور یہاں تک کہ بچوں کی بھی بھرمار ہے اور یہ لوگوں سے کھچا کھچ بھری ایک ایسی جگہ ہے کہ آپ پہلے سے اپنے ذہن میں بنائے ہوئے اس کے ویران عمارت کے تصور کو عملی شکل میں نہ پا کر مایوس ہو جاتے ہیں۔

سیڑھیوں کا ایک سلسلہ عمارت کے اندرونی حصے کی طرف جاتا ہے جہاں ہجوم

عدالت کے باہر قانون کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کا بے چینی سے منتظر ہے۔عدالت ایک ایسا کمرہ ہے جس میں جج کے لئے ایک اونچا پلیٹ فارم، معاونین کے لئے ایک نچلی میز اور گواہوں کے دو باکس ہیں، جس میں لوگ داخل ہوتے ہیں اور جس سے وہ ایک لفظ کہے بغیر باہر نکلتے ہیں۔ یہاں ایک روایتی کوئلہ ہیٹر ہے جو برائے نام حرارت فراہم کرتا ہے مگر جلتے ہوئے اس سے خارج ہونے والا دھواں آپ کا دم تقریباً گھونٹ دیتا ہے جب کہ بہترین نشستوں پر بیٹھے اسی ہیٹر سے حرارت حاصل کرنے والے سینئر وکلاء کو دیکھ کر آپ حسد میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

یہی وہ جگہ تھی جہاں فوج ''کنن پوش پورہ'' کیس کو عوام کی نظروں اور تجسس سے دور لے کر آئی تھی۔ دسمبر 2013ء میں جب ''کنن پوش پورہ'' کو نظر ثانی عرضی کی سماعت کے لیے قبول کیا گیا تو کمرہ عدالت غیر معمولی طور پر بھرا ہوا تھا جن میں کنن پوش پورہ کی نوجوان خواتین کارکنوں، وکیلوں اور متاثرین کی ایک بڑی تعداد موجود تھی۔فوج کے وکیل کرنیل سنگھ کی عادت ہے کہ وہ جان بوجھ کر یا کسی اور طریقے سے عدالت میں دیر سے آتے ہیں اور پھر اپنی تاخیر کو مذاق میں بدل دیتے ہیں جسے سن کر صرف انہیں ہی مزہ آتا ہے۔اس خاص موقع پر انہوں نے متاثرین کی نظر ثانی کی درخواست پر اعتراضات دائر کرنے کے حق میں دلائل دے کر فوج کی حمایت کی۔لیکن یقینی طور پر یہ پہلا کیس ہوگا جس میں ملزمان نے دعویٰ کیا کہ انہیں تفتیش بند کرنے کا حق ہے اور متاثرین کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں ہے!

نظر ثانی درخواستوں کی سماعت موسم سرما کے دوران جاری رہی۔ اور اس معاملے کے حامی اور پیروکار کپواڑہ آتے رہے، کبھی بسوں میں بھر بھر کے اور کبھی کبھی ہم میں سے صرف چند ہی۔ اس دوران ہم بھیڑ بھاڑ والی عدالت، سماعت میں وقفے کے دوران چائے اور باقر خانیوں، انتخابات سے قبل پینے کے پانی اور بجلی کی عدم دستیابی کے خلاف احتجاج، کرنیل سنگھ کی دیر سے آمد اور اس کے بعد مذاق، تاخیر اور فوج کے اشتعال انگیز بیانات سننے کے عادی ہو گئے تھے۔ سماعت کے دوران فوج نے متاثرین کی تذلیل کرنے اور کارروائی کو جتنا ممکن ہو

مؤخر کرنے کی کوشش کی۔

عدالت کی جانب سے متاثرین کو سماعت کا حق دیے جانے کے بعد ایک موقع پر فوج کے وکیل نے ریپ کے مقدمات سے نمٹنے کے حوالے سے بھارتی سپریم کورٹ کی ہدایات کو نظرانداز کرتے ہوئے بحث کے دوران متاثرین کے نام پڑھ کر سنائے۔ ایسا لگتا تھا کہ ان کی حکمت عملی یہ تھی کہ گھنٹوں بلاتعطل بحث کی جائے، مختلف طریقوں سے ایک ہی بات کہی جائے، تاکہ متاثرین کے وکیل کو کبھی موقع نہ ملے کہ وہ اپنے دلائل پیش کریں۔شاید وہ اس بات کو یقینی بنانا چاہتے تھے کہ ہم اتنے ذہنی تناؤ کا شکار ہو جائیں کہ دوبارہ کبھی کپواڑہ کا رخ نہ کریں۔ ہر وقت اس کا معاون مسکراتا رہا اور ہماری طرف دیکھتا رہا۔اس دن ایک وکیل دوست کرنیل سنگھ کے پاس گیا اور نشاندہی کی کہ اس سے کہاں غلطی ہوئی ہے، جس کا کوئی جواب نہ پا کر سنگھ نے ایک بے معنی بات کہی، 'کیا آپ کا تعلق انسانی حقوق کی تنظیم سے ہے؟'

یہ سن کر دم گھٹ رہا تھا کہ ہندوستانی فوج نے اپنے جھوٹ کا پلندہ پیش کیا اور پھر اسے سچ کہا۔ ہر بار کرنیل سنگھ کے فوجی جوانوں کے ساتھ داخل ہوتے وقت غصہ واضح رہتا تھا مگر اس نے درخواست گزاروں کے عزم میں اضافہ کرنے کے علاوہ کچھ نہیں کیا کہ وہ کیس کو گمنامی میں نہیں جانے دیں گے۔ہم فوج کو فقط جھوٹ بولتے اور ہمیں طنزیہ 'انسانی حقوق کی دعویدار لڑکیاں' کہتے نہیں دیکھ سکتے تھے، ظاہر ہے اس سے ان کا مقصد یہ بتانا تھا کہ وہ ہمیں کس قدر کمتر مخالفین تصور کرتے ہیں۔ہمیں اکثر فوجی افسران، ان کے وکلاء اور معاونین کی طرف سے ڈرانے دھمکانے کی کوششیں کی جاتیں۔ایک سے زیادہ بار انہوں نے اپنے چہروں پر مسکراہٹ لئے ہم سے پوچھا کہ ہم کون ہیں اور اس کیس سے کیوں جڑے ہوئے ہیں۔

اکثر تو وہ کچھ بھی پوچھنے کے بجائے بس ہمیں اوپر سے نیچے تک دیکھا کرتے تھے اور یوں ہمیں مردانہ نظروں تلے بے چین رکھنا چاہتے تھے۔ کپواڑہ کے وکلاء کا رویہ بھی اسی طرح کا ہوتا، وہ اکثر ہنستے اور سرکاری وکیل کے ساتھ مذاق کرتے تھے اور کمرہ عدالت پر ایک بے چین نظر ڈالتے جو ان کی ہنسی میں بھی واضح محسوس ہوتی۔ مجھے نہیں لگتا کہ وکلاء کو کنن پوش پورہ یا کسی

اور معاملے کی زیادہ پرواہ تھی۔ وہ باتیں کرتے تھے، ہنستے تھے، یہاں تک کہ اس وقت بھی جب ایک سزا یافتہ شخص سزائے موت کے کیس میں فیصلے کا انتظار کر رہا تھا۔ وہ کنن پوش پورہ کی پرواہ کیوں کریں گے؟ یہ ان کے لئے ایک بیکار کیس تھا، جس سے کچھ بھی حاصل حصول نہیں ہونا تھا۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ عدالت میں جس واحد خاتون وکیل سے ہم اکثر ملتے تھے، وہ بھی اسی طرح سوچتی تھی کہ مقدمہ لڑنا وقت اور وسائل کا ضیاع ہے۔ ان کے لیے ''کنن پوش پورہ'' والے' کیس کی تاریخ لگنے کا مطلب فقط ایک ایسے کیس میں ایک اور دن گزارنا تھا جس کا کوئی نتیجہ نہیں نکلنا۔ اپنے ہی ملک کے لوگوں کے لیے وکلاء میں ہمدردی یا غم خواری کے فقدان پر یقین کرنا مشکل ہے، لیکن ممکن ہے اپنے پیشے اور کمرہ عدالت کی مشقت نے انہیں ان احساسات سے ماورا بنا دیا ہو۔

چند ایک مزید موثر سماعتوں کے بعد، جس میں واقعی دلائل سنے گئے تھے، ہم عدالت کے احاطے کے باہر خاردار تاروں سے حد بندی کی گئی جگہ پر کھڑے ہوئے، جسے ہمیں دوسروں سے بالکل الگ رکھنے اور احتجاج کیلئے بنایا گیا تھا۔ یہ علامتی انتظام تھا تا کہ احتجاج وہیں تک محدود رہے اور ساتھ ہی ہمیں یہ احساس دلایا جائے کہ ہمیں کتنی آزادی حاصل ہے۔ ہم نے پولیس اور فوج کے خلاف احتجاج کیا جس کے دوران ہمارے اطراف لوگ سڑک پر اتنی بڑی تعداد میں مردوں کی موجودگی میں احتجاج کرنے والی لڑکیوں کو دیکھ کر خوش ہو رہے تھے۔ پولیس والے اپنے تھانے سے، شاہراہ کے اس پار سے ہمیں خاموشی سے دیکھ رہے تھے۔ احتجاج ختم ہونے تک فوجی اہلکار عدالت کے احاطے سے باہر نہیں آئے۔

مجھے بیساکھیوں کا سہارا لئے ایک بوڑھا آدمی یاد ہے۔ مجھے یاد ہے کہ میں اسے دیکھ رہی تھی، دونوں پیر غائب تھے، ان کی جگہ باقی رہ جانے والے ٹنڈ سڑک پر گھسٹ رہے تھے، انگلیاں شکل بگڑنے کے سبب سخت ہو چکی تھیں۔ وہ ہمارے ساتھ احتجاج میں شامل تھا۔ وہ ایک ایسا شخص تھا جسے مبینہ طور پر عسکریت پسندوں کی مدد کرنے پر ہندوستانی فوج نے تشدد کا نشانہ بنایا تھا۔ اس کے پیر کاٹ دیئے گئے تھے اور خود اپنا لہو چاٹنے پر مجبور کر دیا گیا تھا۔ اس کا نام قلندر کھٹانہ تھا جو پہاڑوں کا رہنے والا تھا، 'میں تمہارے ساتھ ہوں'، اس نے بس اتنا ہی کہا

اور ہمارے ساتھ کھڑے ہو کر اپنے موٹے شیشوں والی عینک سے فوجی جوانوں کو دیکھنے لگا۔ اس کے لیے یہ بہت معنی رکھتا تھا کہ وہ کھڑا ہو، ہمارے ساتھ، ''کنن پوش پورہ'' کے لوگوں کے ساتھ اور ایک مشترکہ ظالم کے خلاف۔ کچھ لوگ آتے اور ہم سے پوچھتے کہ کیا احتجاج بجلی کے لئے ہے۔ اسے ستم ظریفی ہی کہیں کہ ایک ایسی جگہ جہاں لوگوں کو اپنے مردوں اور عورتوں کے لئے انصاف کا مطالبہ کرنا چاہیئے تھا، بجلی سب سے اہم مسئلہ بن گیا تھا لیکن فوجی علاقے میں ایسا ہی ہوتا ہے، ماضی میں کیے گئے جرم کو بھلا دیا جاتا ہے، وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ روزمرہ زندگی کے دیگر مسائل اس جگہ کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ تنازعات میں جب کوئی جرم شدت اختیار کر جاتا ہے تو انسانی حقوق، وقار اور انفرادی و اجتماعی قدریں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ جرم اپنا اثر کھو دیتا ہے۔ اور فوج اور ریاست اسے اسی طرح برقرار رکھنے کے لئے سخت جدوجہد کرتے ہیں۔

فوج اور ریاستی حکومت کی جانب سے کیس میں تاخیر کی کوششوں میں اضافہ ہوتا رہا اور جج کی عدم دستیابی کی وجہ سے سماعت ملتوی یا موخر ہوتی رہی۔ اس معاملے میں پبلک پراسیکیوٹر، جس نے پولیس کی نمائندگی کی اور وہی کیا جو ریاست کرتی رہی یعنی کچھ بھی نہیں کیا، اسی کو جنوری 2014ء میں مرکزی حکومت کے قائمہ وکیل کے طور پر مقرر کیا گیا جس کا مطلب یہ تھا کہ تکنیکی طور پر اب دیگر معاملات میں اس کے فوج کا ساتھ دینے سے مفادات کے ٹکراؤ کی صورتحال تھی۔ نئے پبلک پراسیکیوٹر نے فوج اور متاثرین کے دلائل دوبارہ سننے کے لیے کہا جو ہمارے لئے مایوس کن تھا کیوں کہ اس کا مطلب چھ ماہ سے زیادہ کی کارروائی کو دوبارہ دہرایا جانا تھا۔ کپواڑہ کی عدالت تک اتنے سفر کئے مگر کوئی شنوائی نہیں ہوئی اور سفر ضائع گئے، ہم نے بغیر کسی وجہ کے 200 کلومیٹر آنے جانے کا سفر کیا مگر ہمارے ضائع ہونے والے سفر کی شاید اتنی اہمیت نہ ہو جتنا اس کے نتیجے میں متاثرین کی توہین میں اضافہ اور ان لوگوں کے لئے انصاف کے حصول میں مزید لامحدود تاخیر اہمیت کی حامل تھی۔

☆......☆

پولیس کے خلاف توہین عدالت کا مقدمہ

جون 2013ء میں مجسٹریٹ کی جانب سے پولیس کو مزید تحقیقات کرنے کا حکم دیے جانے کے بعد تفتیشی افسر ایس پی عبدالجبار کی سربراہی میں تحقیقات ڈرامائی طور پر ناکام ہوگئیں۔ ایک بار، ہمیں بتایا گیا، پولیس نے متاثرین اور ان کے اہل خانہ کو بیان ریکارڈ کرنے کے لیے پولیس اسٹیشن بلایا اور پورا پروگرام منسوخ کرنے سے پہلے انہیں پانچ گھنٹے تک انتظار کرایا۔ اگلی بار، پولیس نے گاؤں سے متاثرین/ گواہان کو طلب کیا، جس میں ستم ظریفی یہ ہے کہ بہت سے مردہ افراد اور دیگر لوگ شامل تھے جن کا اس معاملے سے کوئی تعلق نہیں تھا۔

یہ تحقیقات میں واضح کوتاہیاں تھیں اور اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ پولیس اس معاملے میں کوئی مناسب جانچ کرنے سے گریزاں ہے۔ ستمبر 2013ء میں، جب دوبارہ تفتیش کے لیے تین ماہ کی ڈیڈ لائن ختم ہوگئی، تو ایس ایس پی عبدالجبار نے مزید چھ مہینے کی توسیع کی درخواست کی، اور کپواڑہ کے جوڈیشل مجسٹریٹ نے متاثرین کی بات سنے بغیر، تین مہینے کی توسیع دے دی۔ ہم سبھی جانتے تھے کہ یہ توسیع کیس کو طول دینے کی ایک اور کوشش تھی جس کے ذریعے متاثرین کو تھکا دیا گیا تھا۔ ویسے بھی مایوسی، امید کی موت نہیں ہے؟ لیکن ہم اس بات پر بضد تھے کہ ایسا نہیں ہوگا، کم از کم اس معاملے میں نہیں۔

ایسا لگتا ہے کہ پولیس کی تفتیش مرجانے والوں کو طلب کرنے اور کپواڑہ کے سابق ڈپٹی کمشنر ایس ایم یاسین کے ٹھکانے کے بارے میں پوچھ گچھ کے خطوط لکھنے تک ہی محدود تھی جن کا پتہ لگانے میں پولیس کو بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا، حالاں کہ وہ

کنن پوش پورہ
مصنف - بشیر سرور زوی

ایک معروف شخصیت تھے اور انہوں نے اس کیس کے بارے میں عوامی طور پر بات کی تھی۔ اس کو دیکھتے ہوئے اکتوبر 2013ء میں ہائی کورٹ میں ایک عرضی دائر کی گئی تھی جس میں عدالت سے کیس کے لیے ہونے والی تفتیش کی نگرانی کرنے کی مانگ کی گئی تھی۔

متاثرین کی درخواست کو اب قبل از وقت نہیں سمجھا جا سکتا کیونکہ انہیں دیا گیا وقت گزر چکا تھا اور پولیس نے توسیع لینے کے علاوہ اس معاملے میں ابھی تک کوئی پیش رفت نہیں کی تھی۔ ہم اس معاملے کو سری نگر، ہائی کورٹ میں واپس لانے کی کوشش کر رہے تھے، لیکن یقیناً فوج ایسا نہیں چاہتی تھی۔ ان کے لیے بہتر یہی تھا کہ یہ معاملہ کپواڑہ میں ہی رہے، جس پر کوئی توجہ نہ دی جائے اور وہ عوام کی یادداشت میں ہلچل پیدا کرنے سے قاصر رہے۔ یہی وجہ تھی کہ اس عرضی پر کئی مہینوں تک سماعت نہیں ہوئی۔

دسمبر 2013ء میں، درخواست دائر ہونے کے بعد بھی، پولیس کو ایک اور جج کے ذریعے مزید توسیع مل گئی کیوں کہ گزشتہ توسیع ختم ہونے سے صرف ایک دن قبل کپواڑہ کے مجسٹریٹ چھٹی پر تھے۔ ایک بار پھر متاثرین کو کچھ نہیں بتایا گیا۔ مطلب یہ ہوا کہ پولیس کو کچھ نہ کرنے کے لیے مزید تین ماہ مل گئے تھے۔ توسیع دیے جانے کے اگلے ہی دن 14 دسمبر کو کپواڑہ کے پولیس سپرنٹنڈنٹ کے خلاف مقررہ وقت کے اندر تحقیقات مکمل کرنے کے عدالتی حکم کی تعمیل نہ کرنے پر قائم مقام مجسٹریٹ کے روبرو توہین عدالت کی درخواست دائر کی گئی۔

کئی مہینوں کے التوا کے بعد، چوں کہ ریاست نے متاثرین کو اسٹیٹس رپورٹ کی کاپیاں دینے سے انکار کر دیا تھا، جس کی بنیاد پر انہیں توسیع مل رہی تھی، آخر کار مئی 2014ء میں توہین عدالت کے کیس پر بحث ہوئی۔ اپنے دلائل کے دوران مسٹر امروز نے اس پوری تحقیقات کو چشم پوشی اور دھوکہ دہی قرار دیا۔ انہوں نے بتایا کہ کس طرح 23 سالوں کے دوران جب پولیس نے کیس بندش رپورٹ کو دفن کئے رکھا، عصمت دری کا شکار پانچ خواتین اور بہت سے دیگر اہم گواہوں کی موت ہو چکی ہے اور اب جب انہیں تحقیقات

کرنے کا حکم دیا گیا ہے، تو وہ عدالت کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کر رہی ہے اور صرف توسیع حاصل کر رہی ہے۔

پولیس کی طرف سے دلائل دینے والے چیف پراسیکیوشن آفیسر نے صرف اتنا کہا کہ انہیں ضروری توسیع مل گئی ہے۔ ہم مثبت نتائج کے لیے پرامید تھے کیوں کہ جج نے مسٹر امروز کے دلائل کو قبول کر لیا تھا، لیکن ہمیں مایوسی ہوئی۔ آخر کار ایک ماہ بعد جون 2014ء میں توہین عدالت کی درخواست خارج کر دی گئی۔ اس سے بھی زیادہ مایوس کن بات یہ تھی کہ اسی دن اسی جج نے متاثرین کی بات سنے بغیر ایس ایس پی کو مزید تین ماہ کی توسیع دے دی۔ بظاہر عدالت کے خلاف کوئی توہین عدالت نہیں پائی گئی حالاں کہ پولیس ایک سال بعد بھی مزید تحقیقات کے عدالتی احکامات کی تعمیل کرنے میں بری طرح ناکام رہی تھی۔

☆......☆

دوسری پٹیشن اور کچھ معمولی فتوحات

متاثرین کی جانب سے اکتوبر 2013ء میں ایک رٹ پٹیشن دائر کی گئی تھی جس میں پولیس کو دی گئی توسیع اور اس کے بعد معاملے کی تحقیقات کے لئے ان کی غیر فعالیت کو چیلنج کیا گیا تھا۔ حالاں کہ یہ عرضی 2013ء کے موسم سرما میں دائر کی گئی تھی، لیکن سالانہ دربار موو کے اقدام کی وجہ سے بنچ کو مربوط کرنے میں دشواریوں کی وجہ سے اس پر کبھی شنوائی نہیں ہوئی، جس کے لیے ریاست کے تمام اعلیٰ دفاتر کو عملے کے ساتھ سرمائی راجدھانی جموں منتقل ہونا پڑتا ہے۔ یہ رٹ، جسے بعد میں ہائی کورٹ نے مفاد عامہ کی عرضی کے طور پر لیا اور کیس میں مزید تاخیر ہوئی، اس وقت آئی جب پولیس بار بار توسیع مانگتی رہی اور جون 2013ء میں کپواڑہ سیشن کورٹ کے عدالتی احکامات کے بعد بھی معاملے کی جانچ کرنے میں ناکام رہی، جس میں کہا گیا تھا کہ (1) ہائی کورٹ خود اس معاملے کی نگرانی کرے کیونکہ پولیس کچھ نہیں کر رہی تھی، اور (2) ایک خصوصی تحقیقاتی ٹیم کو اس معاملے کا انچارج مقرر کیا جائے، اس لئے کہ موجودہ تفتیشی افسر پر اس کام کے لئے بھروسہ نہیں کیا جا سکتا۔

قابل ذکر بات یہ ہے کہ متاثرین کے لئے ایک اور چھوٹی سی جیت کے طور پر، 20 مئی 2014ء کو ہائی کورٹ نے اس کیس میں ملوث تمام لوگوں کو نوٹس جاری کیا، نہ صرف مجرموں کو، بلکہ ان لوگوں کو بھی جو اس معاملے کو چھپانے اور متاثرین کو بدنام کرنے کا حصہ بن رہے تھے۔ جیسا کہ جے کے سی سی ایس کے ساتھ کام کرنے والے ایک وکیل کارتک مورو کٹلا کہتے ہیں، 'پہلی بار معاونین اور حامیوں کو صرف اخلاقی طور پر جوابدہ ٹھہرانے کے بجائے فوجداری کارروائی میں شامل کیا جا رہا ہے۔ اتنے سالوں میں پہلی بار ان لوگوں سے

جواب مانگا گیا جو بڑے پیمانے پر شرمناک پردہ پوشی اور ''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین کو انصاف سے محروم کرنے اور فعال طور پر بدنام کرنے کے مجرم سمجھے جاتے تھے۔

یکم جولائی 2014ء کو ایک اہم حکم میں ہائی کورٹ نے پہلی بار ''کنن پوش پورہ'' میں ہونے والے جرائم کے لئے ریاست کی آئینی ذمہ داری کو تسلیم کیا اور مطالبہ کیا کہ متاثرین کو معاوضہ فراہم کیا جائے اور اس معاملے میں کی گئی تحقیقات پر اسٹیٹس رپورٹ داخل کی جائے۔ ہائی کورٹ نے عصمت دری کے بارے میں ایس ایچ آر سی کی سفارشات کو کافی ثبوتوں کی حمایت کے طور پر تسلیم کیا، حالاں کہ کپواڑہ سیشن کورٹ میں ہندوستانی مسلح افواج کی نظر ثانی کی درخواست مسترد کر دی گئی تھی۔ عدالت نے جموں وکشمیر پولیس کو ان کی 'غیر سنجیدگی' اور غیر ذمہ دارانہ رویے' کے لئے تنقید کا نشانہ بنایا، جو اس معاملے کی جانچ کرنے اور عدالت کے سامنے حتمی رپورٹ داخل کرنے میں ان کی برسوں کی تاخیر سے ظاہر ہوتا ہے۔

یہ کیس اپنی غیر متوقع موڑ کاٹنے کی روایت کے مطابق ایک اور دلچسپ مرحلے میں اس وقت داخل ہوا جب ریاست نے کہا کہ وہ ایف آئی آر میں نامزد 23 متاثرین کو معاوضہ ادا کرنے کے خلاف نہیں ہے مگر اس کے بعد 11 نومبر کو وہ اپنے الفاظ سے پھر گئی۔ ریاستی وکیل نے ہائی کورٹ کو مطلع کیا کہ ریاست متاثرین کو معاوضے کی ادائیگی سے متعلق ہائی کورٹ کی ہدایات کو سپریم کورٹ میں چیلنج کرے گی۔ ریاست جو پیسہ بچانا چاہتی تھی وہ دراصل ''کنن پوش پورہ'' کے متاثرین کو واجب الادا رقم کا صرف ایک حصہ ہے۔ ریاست نے بار بار معاوضہ کارڈ کو گاجر کے طور پر استعمال کیا ہے تاکہ زندہ بچ جانے والوں کی تذلیل کی جا سکے اور انہیں توڑا جا سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ معاوضہ دینے پر رضامندی کا مطلب اجتماعی عصمت دری کا اعتراف ہوگا۔

اس میں کوئی تعجب کی بات نہیں کہ ریاست نے متاثرین کو 'معاوضے کا لالچی' اور 50 خواتین درخواست گزاروں کو 'بدنیتی پر مبنی اور مشکوک' خواتین قرار دیا جو بظاہر

ایجنسیوں کے لیے کام کر رہی ہیں اور 'عدالت کی جانب سے انکا نوٹس لیا جانا چاہیئے، جی ہاں، ہم اس نوٹس کے مستحق تھے۔ اپنی مسلح افواج کے تئیں یونین آف انڈیا کی حفاظت، ان کے خلاف کوئی قانونی کارروائی شروع کرنے میں ہچکچاہٹ سے ظاہر ہوتی ہے۔ شبھ ماتھر نے بھارتی ریاست کی جانب سے اپنی مسلح افواج کے بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ کشمیر میں 1990ء سے نافذ آرمڈ فورسز اسپیشل پاورا یکٹ (اے ایف ایس پی اے) جیسے قومی سلامتی کے قوانین ان جرائم میں ملوث فوجی اہلکاروں کو جرم سے استثنٰی کی ضمانت دیتے ہیں۔ 25 سال بعد، 23 فروری 1991ء کی رات کی سچائی کو تسلیم کرنے کا موقع ملنے کے بعد، یونین آف انڈیا نے جموں وکشمیر کی حکومت اور ہندوستانی فوج کے ساتھ قریبی تعاون سے وجاہت حبیب اللہ اور بی جی ورگیس کی رپورٹوں کو برقرار رکھنے کا انتخاب کیا، جس کی 'شاندار درستگی اور سچائی' پر کتاب میں پہلے ہی بحث کی جا چکی ہے۔

☆......☆

انصاف کو سبوتاژ کرنا

اپنے لیے نامناسب واقعات کا سامنا کرتے ہوئے ہندوستانی فوج نے اس بات کو یقینی بنانے کے لیے سوچ سمجھ کر اقدامات کیے کہ عدلیہ اس کے حق میں فیصلہ دے گی۔ انہوں نے ''کنن پوش پورہ'' معاملے میں جاری تحقیقات پر قدغن لگانے کے لئے ایک عرضی دائر کی۔ اس کی سماعت 15 جنوری 2015ء کو تعطیلات کے دوران اس وقت کے جج، جموں وکشمیر ہائی کورٹ جسٹس تاشی ربستان نے کی تھی۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ متاثرین، جو نچلی عدالت میں دیے گئے احکامات میں فریق تھے، کو سماعت کا موقع نہیں ملا۔ فوج کی درخواست سیشن کورٹ (کپواڑہ کے سب جوڈیشل مجسٹریٹ) کی جانب سے مزید تحقیقات کا حکم دیے جانے کے پانچ ماہ بعد دائر کی گئی تھی۔ فوج نے عدالت سے ایک اہم حقیقت بھی چھپائی کہ ہائی کورٹ کے ڈبل بنچ کے سامنے ایک پٹیشن پہلے ہی زیر التوا ہے۔ اس زیر التوا درخواست میں متاثرین عدالت کی نگرانی میں تحقیقات کا مطالبہ کر رہے تھے۔

اس سے پہلے ہائی کورٹ میں جموں وکشمیر ہائی کورٹ کے چیف جسٹس، جسٹس یعقوب میر نے ریاستی انسانی حقوق کمیشن کے فیصلے پر حکم امتناع جاری کیا تھا، جس میں متاثرین کو معاوضہ دینے اور کیس کی دوبارہ تحقیقات کی سفارش کی گئی تھی۔ اس طرح ہندوستانی فوج نے جموں وکشمیر میں عدالتی اور غیر عدالتی نظام کو اپنے مفادات کے لیے کامیابی سے استعمال کیا۔

☆......☆

ایک اور آغاز کی طرف شروعات

سزا دینا تو دور کی بات ہے، اس کیس میں اب تک کسی بھی ملزم سے تفتیش نہیں کی گئی ہے، حالاں کہ جرم کے ارتکاب اور اس میں مدد کرنے والوں کو عوام کے سامنے لایا گیا ہے اور ان سے کہا گیا ہے کہ وہ اپنے جرائم اور اس پر پردہ پوشی کا جواب دیں۔ یقیناً اس میں کچھ کامیابیاں بھی ملی ہیں، چھوٹی لیکن اہم۔ مثال کے طور پر بھارتی بیوروکریسی نے پہلی بار کشمیری سول سوسائٹی کے سامنے جوابدہ ہونے کی ضرورت محسوس کی ہے۔ اس کیس نے لوگوں اور خاص طور پر نوجوان خواتین کو ایک مقصد کے لئے اکٹھا کیا ہے اور ایسا کرنے سے ان کے باہمی اختلافات کو ختم کرنے میں مدد ملی ہے۔ ہم نے کپواڑہ کے اس وقت کے ڈی سی ایس ایم یاسین جیسے لوگوں کو اس کیس اور اس کی پردہ پوشی کے بارے میں کھل کر بات کرتے دیکھا۔ ان کا کہنا تھا کہ 'ہم نے اس کیس کو دوبارہ کھولنے اور اس کا دوبارہ جائزہ لینے کی امید کھو دی تھی اور پھر اس طرح کی یادیں تازہ کی گئیں جو کشمیر میں بھارتی ریاست کی جانب سے انسانی حقوق کی وسیع پیمانے پر خلاف ورزیوں کو بے نقاب کرتی ہیں۔ لوگ اب دیگر کیسز کو بھی دوبارہ کھولنے کے لئے اکٹھا ہو رہے ہیں۔ سوپور میں ایک کیس پر کام کرنے کا حوالہ دیتے ہوئے پرویز امروز کہتے ہیں کہ 'ایسا کوئی کیس تنہائی میں نہیں دیکھا جا سکتا' گویا بھولنے اور یاد کرنے کے درمیان جدوجہد کی تجدید ہوئی ہے اور یاد کرنے سے کچھ چھوٹی چھوٹی لڑائیاں جیتی بھی گئی ہیں۔

یہ کبھی بھی کوئی آسان جدوجہد نہیں تھی جس میں مایوسی یا ناامیدی کا سامنا نہ ہوا ہو، مسلح افواج کی جانب سے اس معاملے کو طول دینے، ہمیں ڈرانے دھمکانے اور نکال باہر

کرنے کی کافی کوششیں کی گئیں۔ لوگوں کی طرف سے سوالات اور شکوک وشبہات تھے کہ ہم ظالموں سے انصاف حاصل کرنے کی امید کیسے رکھ سکتے ہیں۔ ہمیں شروع سے ہی شکست خوردہ قرار دیا گیا تھا۔ ایسے دل دہلا دینے والے لمحات تھے جب گاؤں والے سماعت کے لیے آتے تھے اور ایک بار پھر التوا سے مایوس ہو کر چلے جاتے تھے۔ ایک اور تاریخ۔ ''کنن پوش پورہ'' کے مرد و خواتین اس پورے سفر کے دوران انتہائی دلیری کے ساتھ کھڑے رہے اور اپنی جدوجہد سے کبھی دستبردار نہیں ہوئے۔

7 اپریل 2014ء کو، فوج نے کنن گاؤں میں ایک دھماکہ کیا اور دعویٰ کیا کہ اس نے گولہ بارود برآمد کر لیا ہے — یہ درحقیقت ان کے اقدامات کا جواز پیش کرنے کے لئے ایک بہت پرانی چال تھی اور گاؤں والوں اور اس معاملے سے جڑے دیگر لوگوں کو ڈرانے کے لئے سوچا سمجھا منصوبہ تھا کہ وہ اس کیس کی تحقیقات کے مطالبے سے باز آجائیں۔ اگرچہ یہ کیس اس جدوجہد کے لئے ایک نئی شروعات سامنے لانے کا باعث بنا ہے مگر اس نے گاؤں والوں کی زندگیوں میں نئے مسائل کو بھی جنم دیا ہے۔ وہ رات اب بھی اپنے سفاکانہ جسمانی مظاہر میں انہیں پریشان کرتی ہے: تشدد کا نشانہ بننے والے ابلی ڈار کی ٹانگ جون 2014ء کے اوائل میں کاٹ دی گئی تھی اور 11 جون 2014ء کو اس کی موت واقع ہو گئی تھی۔ عصمت دری اور تشدد کا نشانہ بننے والے چھ افراد کی موت ہو چکی ہے اور اب بھی انصاف ان سے بہت دور ہے۔ کنن پوش پورہ کی خواتین کے مطابق میڈیا کی اچانک نئی توجہ کے نتیجے میں ان کے بچوں کو ایک بار پھر انٹرنیٹ پر ان کی ماؤں کی قابل رسائی تصاویر کے حوالے سے طنز کا نشانہ بنایا جا رہا ہے۔

یادوں کے زندہ ہونے سے لوگوں کے زخم بھی تازہ ہوئے ہیں لیکن اس چیز نے ان کی یادداشت کو متحرک و فعال بھی کیا ہے۔ گزشتہ سال سے خاص طور پر خواتین لوگوں کو یاد دلا رہی ہیں کہ وہ کپواڑہ سے سری نگر تک میلوں کا سفر کر چکی ہیں، اپنے روزمرہ کے معمولات

کو چھوڑ کر 25 سال بعد کھل کر بات کر رہی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ وہ میڈیا کے لیے ایک دلچسپ منظر پیش کریں لیکن یہ یاد رکھنا ضروری ہے کہ میڈیا بریفنگ میں شرکت کرنا، ان کے چہروں کو گھورنے والی متجسس دنیا کا سامنا کرنا، یہ توقع رکھنا کہ شاید ان کے ماتھے پر 'ریپ' کا لفظ لکھا جائے گا، ایک تکلیف دہ جدوجہد رہی ہے۔ ان عورتوں نے ہر حال میں یہ جنگ جاری رکھی ہے، اپنے روزمرہ کے معمولات میں تبدیلیاں کیں تاکہ خود کو اس نئی توجہ کے لیے تیار اور آمادہ کر سکیں جو ہمیشہ مہربان نہیں ہوتی۔

اور پھر بھی بی جے ورگیس جیسے لوگوں نے متاثرین کو بدنام کرنے اور ہندوستانی مسلح افواج کی طرف سے الٹا انہی کو مورد الزام ٹھہرانے کا انتخاب کیا۔ ''کنن پوش پورہ'' اجتماعی عصمت دری کا نشانہ بننے والی خواتین کی ایک تصویر، جو دسمبر 2014ء کی صبح اپنے گاؤں کے پولنگ بوتھ کے باہر سیاہ جھنڈے تھامے ہوئے اور بوتھ کو بند کئے ہوئے کھڑی ہیں، ان خواتین کی ہمت اور بہادری کی علامت کے طور پر ہماری یادوں میں ہمیشہ زندہ رہے گی جنہیں اپنی لڑائی لڑنے کے لیے کسی جنگجو کی ضرورت نہیں تھی۔

اس پورے کیس کا سفر ''کنن پوش پورہ'' کی طرف جانے والی بل کھاتی سڑک کی طرح رہا ہے: جہاں غیر یقینی موڑ اور اس کے باوجود امید وبیم کی کیفیت منزل کا حصول مشکل بنائے رکھتی ہے۔ یہ کیس رکاوٹوں اور تاخیر پر قابو پانے کی ان گنت کہانیوں کا مجموعہ ہے جو بلاشبہ متاثرین کو انصاف سے محروم کرنے کی کوششوں کے خلاف ابھر کر سامنے آتی رہیں گی۔ جموں وکشمیر میں ہندوستان اور اس کی مسلح افواج کو ان کے لاتمناہی جرائم کے لئے جوابدہ بنانے کے لئے ابھی بہت کچھ کرنا باقی ہے، سفر کرنے کے لئے ایک طویل راستہ تلاش کرنا باقی ہے۔ فوج کو اپنے تمام اقدامات کے نتائج سے محفوظ رکھا گیا ہے اور ریاستی ادارے اس بلبلے کو پھٹنے سے روکنے کے لیے کام کر رہے ہیں۔ ایسے حالات میں جب فوج سے منسوب ہر جرم 'مبینہ' ہے، اور انصاف کی ہر کوشش کو اس کی 'معزز بے داغ ساکھ' کو

بدنام کرنے کی ایک منظّم کوشش کے طور پر دیکھا جاتا ہے، شکوک وشبہات اور نا امیدی سے گزرنا فطری بات ہے۔

اس واقعہ اور مقدمہ کے حوالے سے لکھنے والے کے لئے یہ ایک مسلسل عمل رہا ہے۔ دقیانوسی تصورات سے پیچھا چھڑانا، آواز تلاش کرنا اور طاقت کے سامنے سچ بولنے کی ہمت کرنا، محفوظ طور پر 'غیر سیاسی' ہونے کے بجائے سیاسی ہونا، خواتین کے بیانیوں کے ساتھ جدوجہد کرنا، انہیں ایک بار پھر اسی درد سے گزرتے ہوئے دیکھنا جس سے وہ اس رات گزری ہیں۔ سب سے بڑھ کر، ہم سب کے لئے، واضح طور پر سب سے مشکل لڑائی ہر سطح پر شکوک وشبہات اور نادانوں کی طرف سے اٹھائے گئے شکوک وشبہات کے خلاف رہی ہے۔

ایسے الفاظ طویل عرصے تک پریشان رکھتے ہیں کہ آپ نوجوان لڑکیوں کو کیوں بدنام کریں گے؟ آپ انصاف کی بھیک کیوں مانگ رہے ہیں؟ کیا آپ کو اپنی زندگی کی پرواہ نہیں ہے؟ کیا آپ کو اپنے خاندان کی فکر نہیں ہے؟ ہم نے اسے نہیں مانا بلکہ اس چیلنج کو قبول کیا ہے؛ ہم اپنی زندگیوں کی پرواہ کرتے ہیں اور ہم جانتے ہیں کہ ہم مکمل طور پر محفوظ نہیں ہیں لیکن آخر ہم کب تک یونہی بیٹھے دیکھتے رہیں، زیادتیوں کو برداشت کریں اور خود کو شکار بننے کے لئے ذہنی طور پر تیار کرتے رہیں؟ ہم ایک طویل سفر طے کر چکے ہیں، ہم درپیش مسائل کا سامنا کرتے ہوئے مسلسل ایک دوسرے کے ساتھ آگے بڑھ رہے ہیں اور حل تلاش کر رہے ہیں، یہ محسوس کرتے ہوئے کہ مزاحمت کی کوئی صنف نہیں ہے، یہ ایک آفاقی زبان ہے جو مظلوموں کے ذریعے بولی جاتی ہے۔

ہماری جدوجہد ان یادوں میں سے ایک رہی ہے جو کبھی ختم نہیں ہوئیں اور پھر بھی لوگوں نے انہیں ذہن کے کسی دور دراز گوشے میں دھکیل دیا ہے۔ اجتماعی یادداشت کو دوبارہ حاصل کرنا، یاد رکھنے اور بھولنے کے درمیان جستجو جاری رکھنا اس جنگ میں ہمارا حاصل رہا

ہے۔ ہم نے تو صرف ''کنن پوش پورہ'' کی خواتین اور مردوں کی طرف سے رکھی گئی مزاحمت کی بنیاد کو مضبوط کیا اور اسے آگے بڑھایا ہے۔

اس کتاب کا اختتام کرتے ہوئے ہم اپنے آپ پر نظر ڈالتے ہیں: کشمیر سے تعلق رکھنے والی پانچ نوجوان خواتین، جنہوں نے کشمیر اور بھارتی ریاست کے ہاتھوں اس کے ظلم وستم کے بارے میں تفہیم کے اپنے ذاتی سنگ میل کو مختلف طریقوں سے عبور کیا اور آخر کار ایک مشترکہ مقصد کے ذریعے ایک دوسرے سے جڑے ہوئے ہیں۔ معلوم ہے کہ یہ تاریک اور خطرناک راستہ ہے اور ہم نے اپنے خاندان کے ساتھ اختلافات اور ہماری سلامتی کو لاحق خطرات کی قیمت پر بھڑوں کے چھتے کو چھیڑ دیا ہے لیکن تاریخ نویسی کو ریاست کے رحم کرم پر نہیں چھوڑا جا سکتا۔ اس کتاب نے، جو ہنوز منظر عام پر نہ آنے والی، طویل جنگ کی ابتدائی دستاویز ہے، ہمیں یادداشت کی گہری میں جانے اور یاد رکھنے اور بھولنے کے عمل کا سامنا کرنے پر مجبور کیا ہے۔ دوستوں، سرپرستوں اور رہنماؤں اور سب سے اہم کنن پوش پورہ کی بہادر خواتین اور مردوں کی مسلسل حمایت کے ساتھ، ہم نے تاریخ کی ایک بہت بڑی کتاب کھولی ہے، جس کا پیش لفظ 'یاد رکھنا' ہے۔

اگر ہندوستان میں دنیا کی سب سے بڑی جیل مقبوضہ کشمیر میں رہ کر یہ پانچ نوجوان خواتین اتنی بہادری کے جوہر دکھا سکتی ہیں تو آزاد کشمیر کے 45 لاکھ عوام جن پر بھارتی مظالم کے خلاف بات کرنے میں کوئی قدغن نہیں کیوں خاموش ہیں یہ ایک سوال ہے آزاد کشمیر کے عوام کے لیے اگر وہ کشمیری ہیں تو کشمیریوں کی حمایت میں کھڑے ہوں ورنہ پاکستان میں ضم ہو جائیں تا کہ یہ ڈھکوسلہ ختم ہو۔ شاید اردو زبان میں یہ پہلی کتاب ہے جو ''کنن پوش پورہ'' کے واقعہ اور مقدمہ کا مکمل احاطہ کرتی ہے۔ اس یقین کے ساتھ یہ کوشش کی گئی ہے کہ آزاد کشمیر کے عوام اور حکمرانوں، ڈائس پورہ کشمیر کا ضمیر بیدار ہو گا خاص طور پر وہ جو اپنے کاموں میں زیادہ مصروف ہو کر ذمہ داری بھول گئے ہیں۔

☆......☆

دسواں حصہ

کچھ خاص خاص

☆ چکرورتی، اوما۔ "ان کے پاس طاقت ہے، ان کے پاس بندوقیں ہیں - ہمارے لئے خاموش رہنا بہتر ہے"

☆ پیٹرک ہوئنگ اور نوشرن سنگھ (ایڈز) میں، "ان کے پاس طاقت ہے، ان کے پاس بندوقیں ہیں - ہم خاموش رہیں"، "زمین پر استثنٰی کا مطلب" سزا سے استثنٰی کو سمجھنا: ہندوستان میں انسانی حقوق کی خلاف ورزیوں کے نمونے ہیں۔

☆ ''جب کشمیر میں کوئی شہید ہوتا ہے تو اس کے والد اور والدہ اس قربانی اور شہادت پر فخر محسوس کرتے ہیں۔ نہ صرف والدین بلکہ ہر کوئی فخر محسوس کرتا ہے جب شہید ہونے والا اس کا بیٹا ہو، شہید کے خاندان کو عزت دی جاتی ہے۔ بھارتی فوج نے ہمارے ساتھ بدسلوکی کر کے ہماری عزت چھین لی۔ ہم پر اسی وجہ سے حملہ کیا گیا جس کی وجہ سے انہوں نے کشمیری نوجوانوں کو شہید کیا۔ لیکن ستم ظریفی دیکھیں، ہم کنن پوش پورہ کی 40 خواتین جنہیں 23-24 فروری، 1991ء کو ہندوستانی فوجیوں نے اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا تھا بدنامی محسوس کرتی ہیں۔ گزشتہ ہفتے سرینگر میں جموں وکشمیر کولیشن آف سول سوسائٹی (جے کے سی ایس) کی جانب سے منعقدہ اس طرح کی پہلی پریس کانفرنس کے دوران ریپ کا نشانہ بننے والی ایک مبینہ خاتون زارا نے کہا کہ کوئی بھی ہم پر فخر نہیں کرتا۔ 'بھارتی کشمیر میں مبینہ عصمت دری کے متاثرین نے نئے جذبے کے ساتھ پرانی لڑائی کی تجدید کی''۔(روزنامہ ڈان، 27 جون 2014ء)

☆ بسواس، سوتیک۔ 'ناراض گھریلو خواتین کشمیر کو آگ لگا رہی ہیں'، بی بی سی ورلڈ نیوز۔

☆ 10 فروری 2014ء کو انڈین ایکسپریس کو دیے گئے ایک انٹرویو میں وجاہت حبیب اللہ نے کہا کہ ان کی رپورٹ کا بڑا حصہ حکومت نے حذف کر دیا ہے اور ان کے نام کا استعمال کنن پوش پورہ اجتماعی عصمت دری پر بین الاقوامی احتجاج کے خلاف دفاع کے لیے کیا گیا ہے۔ انہوں نے مزید تسلیم کیا کہ 'ہوسکتا ہے کہ ایسا ہوا ہو اور اگر موقع مل جائے تو اس معاملے کی دوبارہ تحقیقات ہونی چاہیے۔ انہوں نے یہ بھی دعویٰ کیا کہ انہوں نے فوری طور پر اپنی رپورٹ کے کچھ حصوں کو حذف کرنے کا معاملہ نہیں اٹھایا کیوں کہ وہ 'حکومت کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے'۔ یہ واضح ہے کہ وہ درحقیقت 1991ء میں اس کیس کی پردہ پوشی میں ملوث تھے۔ (وجاہت حبیب اللہ) 27 فروری کو انڈین ایکسپریس میں شائع ہونے والی ایک رپورٹ میں کہا گیا ہے کہ 'حکومت نے ''کنن پوش پورہ'' پر احتجاج کے خلاف دفاع کے طور پر میرے نام اور میرے موقف کا استعمال کیا۔' انڈین ایکسپریس 27 فروری۔

☆ وجاہت حبیب اللہ سری نگر ڈویژن سے کمشنر اور اعلیٰ سول بیوروکریٹ تھے جنہوں نے 22 سال بعد تسلیم کیا کہ ''کنن پوش پورہ'' کے افسوس ناک واقعے میں فوج نے خواتین کی اجتماعی آبروریزی کی مگر انہوں نے رپورٹ میں جھوٹ لکھا، یا ان کی رپورٹ میں سے وہ حصہ حذف کر دیا گیا جس میں اس واقعے کی سچ پر مبنی تفصیل درج تھی چوں کہ وہ حکومت کو شرمندہ نہیں کرنا چاہتے تھے۔ گویا انہوں نے ''کنن پوش پورہ'' کے عوام کو تو شرمندہ کیا حکومت کو نہیں کیا۔

☆ آئین ہند کے پارٹ 21 کے تحت، جو 'عارضی، عبوری اور خصوصی دفعات' سے متعلق ہے، ریاست جموں وکشمیر کو آرٹیکل 370 کے تحت خصوصی درجہ دیا گیا ہے۔ آئین کی تمام دفعات جو دوسری ریاستوں پر لاگو ہوتی ہیں وہ جموں وکشمیر پر لاگو نہیں ہوتی ہیں۔ مثال کے

طور پر 1965ء تک جموں وکشمیر میں گورنر کے طور پر صدر ریاست اور وزیراعلیٰ کی جگہ وزیر اعظم تھا۔ اس آرٹیکل کے مطابق، دفاع، خارجہ امور، مالیات اور مواصلات کو چھوڑ کر، ہندوستانی پارلیمنٹ کو تمام قوانین کو لاگو کرنے کے لئے ریاستی حکومت کی رضامندی اور ریاستی حکومت کی منظوری کی ضرورت ہوتی تھی۔ اس طرح، ریاست کے باشندے دیگر ہندوستانیوں کے مقابلے میں شہریت، جائیداد کی ملکیت اور بنیادی حقوق سے متعلق قوانین کے ایک الگ سیٹ کے تحت رہتے تھے۔

اس شق کے نتیجے میں، دوسری ریاستوں کے ہندوستانی شہری جموں وکشمیر میں زمین یا جائیداد نہیں خرید سکتے تھے۔ آرٹیکل 370 کے تحت مرکز کے پاس مالیاتی ایمرجنسی کا اعلان کرنے کا کوئی اختیار نہیں تھا۔ یہ صرف جنگ یا بیرونی جارحیت کی صورت میں ریاست میں ایمرجنسی کا اعلان کر سکتا تھا لہٰذا مرکزی حکومت داخلی خلفشار یا خطرے کی بنیاد پر ایمرجنسی کا اعلان اس وقت تک نہیں کر سکتی جب تک کہ اس کے لیے درخواست یا ریاستی حکومت کی رضامندی اور ریاستی اسمبلی سے منظوری نہ لی جائے۔ مودی حکومت نے ہندوستان ہندوستانی آئین میں دیا گیا یہ حق بھی 5 اگست 2019ء کو کشمیریوں سے چھین لیا اور ریاستی عوام کو پہلے سے بھی زیادہ بے اختیار بنا دیا، اب کشمیری عوام ایک بلدیاتی زون اور دنیا کی سب سے بڑی جیل میں رہ رہے ہیں۔

☆ 2010ء کا موسم گرما کشمیر کے نہتے شہریوں اور بھاری ہتھیاروں سے لیس بھارتی افواج کے درمیان تصادم کا موسم تھا۔ ایک عوامی بغاوت اتنی زوردار تھی کہ ایسا لگا جیسے کوئی انقلاب آنے والا ہے اور وہ 'آزادی' ابھی قریب ہے۔ یہ مسلسل تیسرا سال تھا جب عام شہری بھارتی مسلح افواج کے سامنے آئے۔ سال 2008ء میں سری امرناتھ شرائن بورڈ کو 100 ایکڑ زمین الاٹ کیے جانے کے خلاف لوگ سڑکوں پر نکل آئے تھے۔

☆ 2009ء میں شوپیاں میں بھارتی مسلح افواج کے ہاتھوں آسیہ اور نیلوفر کی عصمت دری

اور قتل، اس کے بعد ہونے والی سیاست اور دھوکہ دہی کی ،تحقیقات کے نتیجے میں بڑے پیمانے پر مظاہرے ہوئے۔ 2010ء میں کشمیر میں بھارتی مسلح افواج کی بالادستی کے خلاف لوگوں نے احتجاج کیا۔

☆ 30 اپریل 2010ء کو ہندوستانی فوج نے تین 'عسکریت پسندوں' کو ہلاک کرنے کا دعویٰ کیا تھا جو مبینہ طور پر ایل او سی کی دوسری طرف سے دراندازی کر چکے تھے۔ مرنے والوں کے اہل خانہ نے دعویٰ کیا کہ یہ ایک فرضی انکاؤنٹر تھا اور ان کے رشتہ داروں کا تعلق بارہ مولہ کے علاقے نیدھل سے تھا۔ انہیں فوج میں نوکری دینے کا وعدہ کر کے کپواڑہ کے کلروس علاقے بھیجا گیا تھا جہاں ان کو ہلاک کیا گیا۔ پولیس نے 2 مئی 2010ء کو ایف آئی آر درج کی۔ اس واقعہ کے بعد وادی بھر میں مظاہرے ہوئے۔ ایک اور واقعہ جس کے بارے میں خیال کیا جاتا ہے کہ اس نے احتجاج کو جنم دیا وہ سرینگر کے ریناواری علاقے میں 17 سالہ طفیل متو کا قتل تھا۔ لوگوں کے غصے کی شدت اتنی زیادہ تھی کہ بہت سے لوگوں نے اسے 'انتفاضہ' یا ہندوستان کے خلاف مزاحمت قرار دیا۔ یہ ہتھیاروں کے خلاف پتھروں کی لڑائی تھی۔ فوج نے نہتے شہریوں کے خلاف اپنے دفاع کے نام پر طاقت کا وحشیانہ استعمال کیا جس کی وجہ سے بہت سے لوگ ہلاک اور زخمی ہوئے۔ مبینہ طور پر بھارتی تسلط کے خلاف مزاحمت کرتے ہوئے اس دوران تقریباً 117 افراد ہلاک ہوئے تھے۔

☆ 2010ء کے مظاہروں کی ایک فیکٹ فائنڈنگ ٹیم، جس میں ورندا گروور اور بیلا بھاٹیا بھی شامل تھیں، نے رپورٹ کیا کہ سکیورٹی فورسز نے اپنے دفاع میں کوئی کارروائی نہیں کی، لیکن ان کے اقدامات 'صدمے اور خوف کی حکمت عملی کے ذریعے مظاہروں کی حوصلہ شکنی کرنے کے مترادف تھے۔ آل پارٹیز حریت کانفرنس اس تحریک کو اپنے حق میں استعمال نہیں کر سکی اور نہ پاکستان جو خود کو اس مسئلے کا فریق سمجھتا ہے اس سے فائدہ اٹھا سکا، بلکہ صورت حال اس سے بالکل الٹ رہی۔ آل پارٹیز حریت کانفرنس مکمل طور پر ختم ہو چکی

جب کہ مقبوضہ کشمیر میں کوئی پاکستان کا نام نہیں لیتا اور نہ سنتا ہے (نعیمہ احمد مجہور)

☆12 ستمبر 1997ء کو 20 گرینیڈیئرز آرمی، بڈگام کے میجر نیر اپنے اہلکاروں کے ساتھ بڈگام کے راز وین گاؤں میں ایک گھر میں گھس گئے اور مردوں کی پٹائی کی۔ بعد میں گھر کی خاتون نے الزام لگایا کہ اس کے ساتھ عصمت دری کی گئی۔ اس معاملے میں ایف آئی آر درج کی گئی تھی حالاں کہ، اس معاملے میں وزارت دفاع کی دستاویز میں ریپ کا کوئی حوالہ نہیں ہے۔ میجر نیر کو ملزم کے طور پر بھیجا گیا تھا لیکن اب تک افسپا کے تحت ملزمان کے خلاف قانونی چارہ جوئی کے لئے کوئی منظوری نہیں دی گئی ہے۔ (بھارت کے زیر انتظام کشمیر میں انسانی حقوق اور انصاف سے متعلق بین الاقوامی پیپلز ٹربیونل)

☆ جموں و کشمیر اسٹیٹ ہیومن رائٹس کمیشن/ فیصلہ/ فائل نمبر: 2011ء/ اکتوبر 2011ء کے حکم میں کہا گیا ہے کہ: ''ڈی جی پی جموں و کشمیر نے ابتدائی طور پر 25 دسمبر 2009ء کے مراسلے کے ذریعے اسی دولائن رپورٹ کو اپنانا چاہا تھا جو انہوں نے پہلے ہی 2007ء کے متعلقہ شکایت نمبر ایس ایچ آر سی 118 میں شریف الدین شیخ وی ایس اور دیگر کے حوالے سے پیش کی تھی جس میں ریاست کے پولیس سربراہ نے اس سنگین معاملے کو صرف ایک غیر معمولی نقطہ نظر سے نظر انداز کرنے کی کوشش کی ہے۔ 1991ء کی ایف آئی آر نمبر 10 کی تحقیقات ثبوتوں کی کمی کی وجہ سے "غیر پتہ" ہونے کی وجہ سے بند کر دی گئی تھی اور ملزمین کے خلاف مقدمہ چلانے کے قابل نہیں پائی گئی تھی''۔

☆ ریاستی بجلی بورڈ کی جانب سے جاری کردہ بجلی کے شیڈول کے مطابق 24-23 فروری 1991ء کو ''کنن پوش پورہ'' کے ایک گاؤں میں بجلی تھی، جبکہ دوسرے گاؤں میں کچھ علاقوں کو رات کے اس حصے کے لئے باقاعدگی سے بجلی کی کٹوتی کے شیڈول کے تحت شامل کیا گیا تھا۔ لہٰذا، ایک گاؤں میں اور دوسرے گاؤں کے ایک مخصوص علاقے میں، رات کے اس حصے کے لیے بجلی دستیاب تھی۔ ان علاقوں میں فوج کے جوان گھروں میں گھس گئے، بلب توڑ دیے یا موم بتیاں اور لالٹینیں بجھا دیں۔

''کشمیر بنے گا پاکستان''

''کنن پوش پورہ'' کی جدوجہد سے مایوس ہو کر فوج دھماکے کرتی ہے اور ہتھیاروں کی جعلی برآمدگی کرتی ہے۔ آج 17 اپریل 2014ء صبح تقریباً 8 بجکر 45 منٹ پر کپواڑہ کے کنن گاؤں میں ایک دھماکہ ہوا۔ یہ دھماکہ ہری کیمپ کے راشٹریہ رائفلز اور 160 ٹیریٹوریل آرمی کے جوانوں نے کیا، جنہوں نے گاؤں والوں کو بتایا کہ یہ ایک بہت پرانی بارودی سرنگ ہے جسے دھماکہ کر کے اڑانا تھا۔ مزید برآں انہوں نے اعلان کیا کہ دھماکے کی جگہ کے قریب سے اسلحہ اور گولہ بارود برآمد ہوا ہے۔ بازیابی کسی آزاد یا مقامی گواہ کے بغیر کی گئی تھی۔ کنن کے سرپنچ عبدالصمد ڈار نے فوجی اہلکاروں سے سوال کیا۔ انہیں بتایا گیا کہ فوج کو کنن گاؤں میں ہتھیاروں اور گولہ بارود کے بارے میں اطلاع ملی ہے اور آنے والے دنوں میں گاؤں میں تلاشی لی جائے گی۔

5 اپریل کو ہیری کیمپ کے فوجی اہلکار اسی مقام پر ایک ویڈیو کی شوٹنگ کر رہے تھے، جو جاسوسی کی طرح دکھائی دے رہی تھی۔ پانچ اپریل سے پہلے تین دن تک اسی فوجی اہلکاروں کے اس مقام پر غیر معمولی نقل و حرکت ہوتی رہی۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ یہ دھماکہ باقاعدہ منصوبہ بندی سے کیا گیا جس کا مقصد ''کنن پوش پورہ'' کے عوام کو خوفزدہ کرنا تھا تا کہ وہ اپنے اس مقدمے کی پیروی سے دستبردار ہو جائیں یا زیادہ زور نہ دیں تاہم ان سارے ہتھکنڈوں کے باوجود ''کنن پوش پورہ'' کے باقی رہ جانے والے لوگ ہارے نہیں اور نہ تھکے۔

انہوں نے ''کنن پوش پورہ'' سے کپواڑہ اور بعدازیں سری نگر کی طویل مسافت

طے کی اور بار بار، لگا تار آتے جاتے رہے، ان کو اس مشقت سے انصاف تو نہیں ملا مگر بھارتی فوج اور مودی کی حکومت کی دنیا بھر میں جگ ہنسائی اور لعن طعن ہوتی رہی، دنیا نے یہ تسلیم کیا کہ بھارتی ظالم ہیں، بھارت میں اگر جمہوریت ہے تو جموں وکشمیر میں اس کا شائبہ تک نہیں، یہ کشمیریوں کی کامیابی اور جدوجہد کا حاصل تھا مگر بین الاقوامی طور پر ان کی کوئی سیاسی تنظیم اور شناخت نہ ہونے کے باعث یہ کامیابی ناکامی میں بدل گئی، کشمیریوں کا یہی مسئلہ ہے کہ وہ تحریک آزادی میں خون تو دے رہے ہیں مگر باقی کام دوسروں پر چھوڑے ہوئے ہیں، جو اپنی سہولت اور ضرورت کو دیکھ کر ہی کچھ کرتے ہیں، بین الاقوامی طور پر کشمیریوں کی کوئی نمائندہ اور بھرپور آواز نہیں ہے، کشمیر کی تحریک آزادی خون دینے کے باوجود آگے نہیں بڑھ سکتی جس کی نشاندہی کے ایچ خورشید نے 1962ء میں کر دی تھی مگر کشمیریوں کو یہ بات ابھی تک سمجھ میں نہیں آئی۔

سید علی گیلانی عمر بھر تحریک کی سرپرستی کرتے رہے لیکن انہیں پیرانہ سالی میں اندازہ ہوا کہ وہ خیالوں میں ہی تیر رہے تھے، لیکن اس وقت تک بہت دیر ہو چکی تھی، جموں و کشمیر کے نوجوان اگر ان ساری قربانیوں کا حاصل چاہتے ہیں تو ان کو اپنے بیانیے میں تبدیلی لانا ہوگی کیوں کہ 77 سال پرانا بیانیہ دنیا نے مسترد کر دیا، کشمیریوں کے حق میں یہ بات بہتر ہے کہ دنیا نے ابھی تک بھارت کے بیانیے کو تسلیم نہیں کیا، مگر کشمیریوں کی طرف سے ایسا زوردار بیانیہ سامنے نہیں آیا جس کی وجہ سے بھارت کو اپنے مؤقف سے دستبردار ہونا پڑے، اب دنیا اس بات پر تو راضی نہیں ہوگی کہ بھارت کو توڑ کر پاکستان کو بڑا کرنے میں کشمیریوں کی مدد کریں اور کشمیری براہ راست دنیا سے ایسی مدد مانگ بھی نہیں رہے لہٰذا پاکستان کے پالیسی سازوں اور کشمیریوں کو مل کر نیا بیانیہ تشکیل دینا چاہیے جس میں کشمیریوں سے زیادہ پاکستان کا فائدہ ہو کیوں کہ پاکستان کے بغیر کشمیری نہ تن تنہا بھارت سے آزادی کی تحریک نہیں چلا سکتے لیکن پاکستان کو اعتماد میں لے کر جموں وکشمیر کی قیادت کو آگے بڑھنا ہوگا تا کہ

وہ دنیا کو اپنی بات اور معاملات سمجھا سکیں، ”کشمیر بنے گا پاکستان کا نعرہ“ قبل از وقت لگانے والوں نے تحریک آزادی کو بہت نقصان پہنچایا اور اس سے حاصل کچھ بھی نہیں ہوا، آج جو مقبوضہ کشمیر خون آلود ہے، وہ کمزور بیانیے اور ناقص حکمت عملی کی وجہ سے ہے۔ پاکستان اور کشمیریوں کے مفاد میں ہے کہ بیانیہ اور ترجیحات میں تبدیلی لانی چاہئے، ترجیح اول بھارت سے کشمیر کو خالی کرانا ہونا چاہئے، اس کے بعد یہ نعرہ لگے کہ کشمیر بنے گا پاکستان یا خود مختار۔

☆......☆

گیارہواں حصہ

ضمیمہ جات(Annexures)

رپورٹس

1۔گاؤں والوں کی طرف سے ہاتھ سے لکھا گیا خط جس میں 23-24 فروری 1991ء کی رات کو فوج کے ذریعہ کی گئی عصمت دری کے بارے میں شکایت کی گئی تھی، جس میں انگوٹھے کے 23 نشانات تھے۔25 فروری 1991ء کو سپرنٹنڈنٹ آف پولیس اور ڈپٹی کمشنر/ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کو لکھے گئے خط میں 4 مارچ 1991 کو عرضی دائر کی گئی۔

موضوع: کنن اور پوش پورہ کے گاؤں کے مردو خواتین کی جانب سے 23-24 فروری 1991ء، ہفتہ-اتوار، رات 11:00 بجے" کنن پوش پورہ" میں تعینات 4 راجستھان رائفلز کے ایکشن کے خلاف کارروائی کی درخواست۔

درخواست دہندگان کا کہنا ہے کہ

23-24 فروری 1991ء کو ہفتہ اور اتوار کی درمیانی رات 11 بجے" کنن اور پوش پورہ" کے موضع دیہہ میں ایک دردناک اور المناک واقعہ پیش آیا۔گزشتہ ایک سال سے کشمیر میں تعینات فوجی جوانوں کی جانب سے مظالم ڈھائے جارہے ہیں جس کی وجہ سے علاقے میں عسکریت پسندی میں اضافہ ہوا ہے۔حکومت اپنے ہی لوگوں کو تحفظ فراہم کرنے میں ناکام رہی ہے جو غریب اور بے سہارا ہیں اور عام طور پر ظلم وستم کا نشانہ بنتے ہیں۔

23-24 فروری 1991ء کو، ہفتہ-اتوار، رات 11:00 بجے، فوج نے کنن

اور پوش پورہ کے گاؤں کا محاصرہ کیا۔فوج کے جوان عسکریت پسندوں کی تلاش میں گاؤں میں داخل ہوئے، لیکن اس کے بجائے بکتر بند فوج نے مردوں پر حملہ کرنا شروع کر دیا اور انہیں اپنے گھروں سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا، جبکہ خواتین کو اندر ہی رہنے پر مجبور کر دیا گیا۔ اس کے بعد فوجیوں نے خواتین پر درندوں کی طرح حملہ کیا اور ان کے کپڑے پھاڑ دیے۔ کئی خواتین نے چیخنے کی کوشش کی، لیکن جوانوں نے ان کی گردن پکڑ لی اور ان کا گلا گھونٹنے کی کوشش کی۔ انہوں نے اپنی بندوقیں خواتین کے سینوں پر رکھیں اور ان کے ساتھ جو چاہے کیا۔ افسران تفتیشی مرکز میں تھے، جو ایک اسکول میں قائم کیا گیا تھا۔کمانڈنٹ نمبردار کی دکان میں تھا، جو گاؤں کے مضافات میں واقع ہے۔

جب جوان گھروں میں داخل ہوئے تو سبھی افسر پوچھ تاچھ میں مصروف تھے۔ محاصرے اور تلاشی کی کارروائی کرنے والے فوجیوں کی کارروائیاں انہیں دکھائی نہیں دے رہی تھیں۔ جوانوں نے ان گھروں میں فرق نہیں کیا جہاں خاندان کے مرد پاکستان کے تربیت یافتہ عسکریت پسند تھے اور جو عسکریت پسندوں سے ہمدردی نہیں رکھتے تھے۔ یہ سلسلہ رات بھر چلتا رہا۔فوجیوں نے نوجوان غیر شادی شدہ لڑکیوں اور حاملہ خواتین کو بھی نہیں بخشا۔فوج کے جوان ہر گھر کے اندر دو بار گئے۔ زیادہ تر خواتین بے ہوش ہو گئیں، ان کے کپڑے پھٹ گئے اور زیادہ تر لوگوں کو مارا پیٹا گیا۔اس آپریشن کا عسکریت پسندی سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ان خواتین کا تلاشی اور محاصرے کی کارروائی سے کوئی لینا دینا نہیں تھا۔ ہم یہ درخواست اس لئے جمع کرا رہے ہیں تاکہ تحقیقات ہو اور گاؤں والوں کو دوبارہ اس طرح کے مظالم کا سامنا نہ کرنا پڑے۔ ہم گواہی دینے کے لیے تیار ہیں۔

(" کنن پوش پورہ" کے دیہاتیوں کے نام، انگوٹھے کے نشان اور دستخط)

2۔ڈائریکٹر آف پراسیکیوشن، ڈی جی پولیس، جموں وکشمیر کا 23 ستمبر 1991ء کا خط جس میں مقدمہ نہ چلانے کے معاملے میں نقائص کے بارے میں بتایا گیا تھا۔

موضوع: مقدمہ ایف آئی آر نمبر 10/1991ء کے تحت دفعہ 376/452/354/342/325/323، آر پی سی، تھانہ ترہ گام۔

پولیس ہیڈ کوارٹرز میں اس کیس کی مکمل جانچ پڑتال کی گئی ہے اور مندرجہ ذیل نقائص کا شکار پایا گیا ہے:

ا۔ گواہوں کے بیانات نہ صرف دقیانوسی ہیں بلکہ سنگین تضادات کا شکار ہیں۔

۲۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ اتنے سنگین واقعے کی اطلاع فوری طور پر پولیس اسٹیشن کو نہیں دی گئی، جو واقعہ کی جگہ سے بمشکل تین کلومیٹر کی دوری پر واقع ہے۔

۳۔ مبینہ طور پر گاؤں والوں نے 26-25 فروری 1991ء کو جو رپورٹ لکھی تھی، وہ دراصل واقعہ کے سات دن بعد 4 مارچ کو ضلع مجسٹریٹ کے سامنے پیش کی گئی تھی، جس سے یہ قانونی مفروضہ پیدا ہوتا ہے کہ اس واقعہ کو توڑ مروڑ کر پیش کیا گیا ہے۔

۴۔ مبینہ ملزم کی شناخت کرنے میں گواہوں کی ناکامی نے استغاثہ کی کہانی میں ایک مہلک اور لاعلاج خامی پیدا کردی ہے۔

مذکورہ بالا کے پیش نظر یہ مقدمہ قانون کی نظر میں فوجداری مقدمہ چلانے کے قابل نہیں ہے لہذا اس معاملے کو حتمی طور پر رپورٹ کیا جاسکتا ہے،

سی ڈی فائل کو منسلک کاغذات کے ساتھ واپس کیا جاتا ہے۔

3۔ ایس ایم یاسین کا ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کو خط

حکومت جموں وکشمیر، دفتر ضلع مجسٹریٹ کپواڑہ، ڈویژنل کمشنر، سری نگر، کشمیر

موضوع: ضلع کپواڑہ کے ''کنن پوش پورہ'' گاؤں میں فوجی اہلکاروں کے ذریعہ کئے گئے مظالم۔

23/24 فروری 1991ء کی رات کو گاؤں والوں کی ایک درخواست موصول

ہوئی، 68 بریگیڈ سی/او 56 اے پی او کی 4 راج رائفلز کی فوج رات 11 بجے ''کنن پوش پورہ'' گاؤں میں داخل ہوئی اور تمام مردوں کو زبردستی ان کے گھروں سے نکال کر 2 گھروں میں لے گئی اور انہیں 2 کمروں میں بند کر کے پوچھ گچھ شروع کردی اور پوچھ گچھ کیلئے ظالمانہ طریقے کا استعمال کیا۔ بڑی تعداد میں مسلح اہلکار گاؤں والوں کے گھروں میں گھس گئے اور بندوق کی نوک پر انہوں نے 23 خواتین کو ان کی عمر، شادی شدہ، غیر شادی شدہ، حاملہ وغیرہ کی پرواہ کیے بغیر اجتماعی زیادتی کا نشانہ بنایا۔

یہ کام 24 فروری 1991ء کی رات 9 بجے تک کیا گیا۔ 5 مارچ کو، میں نے ترہ گام میں تعینات مقامی پولیس کے ساتھ جائے وقوعہ کا دورہ کیا پورے گاؤں میں شور شرابا تھا۔ میں نے گاؤں والوں کے بیانات ریکارڈ کیے جن میں کچھ خواتین بھی شامل ہیں جن پر مذکورہ بالا مظالم ڈھائے گئے ہیں۔ مجھے وہ کمرے دکھائے گئے جو گینگ ریپ کے لیے استعمال ہوئے تھے اور مجھے عورتوں کے وہ کپڑے دکھائے گئے جو فوج نے پھاڑ دیے تھے۔ یہ پایا گیا کہ مسلح افواج تشدد پر اتر آئی تھیں اور وحشی درندوں کی طرح برتاؤ کر رہی تھیں۔ گاؤں والوں نے شراب کی خالی بوتلیں جمع کیں جو میں نے مقامی پولیس کے حوالے کیں اور مجھے بتایا گیا کہ شراب پینے کے بعد ظلم کیا گیا تھا۔ میں نے پایا کہ گاؤں والوں کو انتہائی حد تک ہراساں کیا گیا تھا۔

صبح 9 بجے کے بعد جب فوج گاؤں سے نکلی تو مردوں کو رہا کردیا گیا اور جب وہ اپنے گھروں میں داخل ہوئے تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ فوج نے ان کی بیویوں، بیٹیوں، بہنوں وغیرہ کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی ہے۔ فوج نے غیر قانونی کارروائی کرنے کے بعد مقامی لوگوں کے ساتھ ساتھ مقامی پولیس سے زبردستی این او سی بھی لے لیا تھا۔

جمعہ شیخ ولد خضر شیخ گاؤں کے چوکیدار نے انہیں اپنا شناختی کارڈ دکھایا تھا، اس کے باوجود اسے مارا پیٹا گیا اور کمرے میں بند کردیا گیا اور اس کی بیٹی اور بہو کے ساتھ اجتماعی زیادتی

کی گئی۔ گینگ ریپ کا نشانہ بننے والی لڑکیوں میں سے ایک نے صرف 4 دن پہلے ہی ایک بچے کو جنم دیا تھا، اس کے باوجود اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی تھی۔ اس موقع پر میرے علم میں کس طرح کے مظالم اور تشدد کی تفصیلات آئیں انہیں بتاتے ہوئے شرم آتی ہے۔

یہ خبر پورے ضلع میں پھیلنا شروع ہوگئی ہے اور مجھے خدشہ ہے کہ انتظامیہ پر اس کا منفی اثر پڑ سکتا ہے۔ میں نے تجویز دی کہ افسران کی ٹیم کو متعلقہ گاؤں میں تعینات کیا جائے تاکہ موقع پر ہی جانچ کی جا سکے اور قصورواروں کو سزا دینے کے لئے فوری اقدامات اٹھائے جائیں۔ مزید برآں مجرموں کو سزا دینے کے لئے اقدامات کئے جائیں اور ضلع میں اس طرح کے مزید افسوسناک واقعے کی روک تھام کے لئے اقدامات کئے جائیں۔

دستخط (ایس ایم یاسین)

نقل برائے اطلاع۔

ڈائریکٹر جنرل آف پولیس جموں وکشمیر حکومت، جموں کشمیر

ڈی آئی جی پولیس سری نگر

اسپیشل کمشنر بارہ مولا

ڈی آئی جی پولیس رینج بارہ مولا

ایس پی کپواڑہ، برائے معلومات اور ضروری کارروائی

4۔ بھارتی فوج کی 19 انفنٹری بریگیڈ کے اس وقت کے کمانڈر بریگیڈیئر ایچ کے شرما کی خفیہ رپورٹ کا متن

گاؤں ''کنن'' اور ''پوش پورہ'' (ترہ گام) میں 23 / 24 فروری 91 کو پیش آنے والے واقعے کی خفیہ تحقیقاتی رپورٹ

کنن گاؤں ترہ گام بازار سے تقریباً 3 کلومیٹر ایس ای پر واقع ہے۔ نقشے میں

بابا گنڈ گاؤں کو مشرق کی طرف دکھایا گیا ہے جب کہ اصل میں یہ مغرب کی طرف ہے۔ گاؤں پوشپورہ کو نقشے میں ایک علیحدہ گاؤں کے طور پر دکھایا گیا ہے، یہ گاؤں کنن کے مغرب میں تقریباً 800 میٹر کی دوری پر واقع ہے۔ حالاں کہ، گاؤں کنن کے شمالی حصے میں واقع کچھ گھر آمدنی کے مقاصد کے لیے گاؤں پوشپورہ میں شامل کئے گئے ہیں۔ 4 راج آر آئی ایف نے گاؤں کنن اور پوشپورہ کے کچھ گھروں میں چھپے مشتبہ این ایز کے بارے میں کچھ معلومات حاصل کی تھیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں۔

23 فروری 91 کو 21:30 بجے سی او اور 160 کے قریب اہلکاروں پر مشتمل دو کالم وہاں سے باہر چلے جاتے ہیں۔ بیرونی محاصرہ تقریباً 23:30 بجے تک جاری رہا تھا۔ پولیس کے ایک نمائندے کانسٹیبل عبدالغنی بھی محاصرے کی ٹیم کے ہمراہ تھے اور انہوں نے ان گھروں کا محاصرہ کیا جنہیں انفرادی طور پر محاصرے میں لیا گیا تھا۔ سرچ پارٹی چھ سے آٹھ افراد پر مشتمل تھی جس میں سرچ پارٹی کا انچارج آفیسر بھی شامل تھا۔ ان گھروں کے مرد قیدیوں سے بھی بیک وقت پوچھ گچھ کی گئی۔ مخصوص گھروں کی تلاشی صبح 6:00 بجے تک مکمل کی گئی اور مندرجہ ذیل اسلحہ اور بارودی مواد برآمد کیا گیا: 2 عدد اے کے 47 (کلاشنکوف) کے ساتھ 2 میگزین اور 50 راؤنڈز، ایک عدد پستول کے ساتھ 1 میگزین اور 10 راؤنڈز۔ صبح سات بجے کے قریب تمام مرد ارکان کو مسجد کے قریب جمع ہونے کے لیے اعلان کیا گیا اور 24 فروری 91 کو صبح ساڑھے سات بجے سے شروع ہونے والے دن کے دوران باقی گھروں کی تلاشی لی گئی۔

ان تلاشیوں کے دوران گاؤں کا سربراہ یا کوئی اہم شخص سرچ پارٹی کے ساتھ تھا۔ 24 فروری 91ء کو صبح نو بجے مکمل آپریشن ختم کر دیا گیا۔ مزید کوئی اندیشہ نہیں تھا لہٰذا پوچھ گچھ کے لئے حراست میں لئے گئے سبھی افراد کو رہا کر دیا گیا تھا۔ سول کارروائی سے متعلق ایس او پی کے مطابق، جب دن کے اوقات میں تلاشی لی جا رہی تھی، یونٹ کا آر ایم او مقامی آبادی

کوطبی امداد فراہم کر رہا تھا اور اس نے تقریباً آٹھ خواتین سمیت 15 فیصد کا معائنہ کیا۔

تلاشی کے اختتام پر سی او نے تمام دیہاتیوں کو اکٹھا کیا اور پوچھا کہ کیا تلاشی آپریشن کے دوران انہیں کسی پریشانی کا سامنا کرنا پڑا ہے۔ تمام افراد نے متفقہ طور پر سیکیورٹی فورسز کے طرزِ عمل کی تعریف کی اور درحقیقت رضا کارانہ طور پر ان جگہوں کی نشاندہی کی جہاں دیگر ہتھیاروں اور بارودی سرنگوں کے چھپے ہونے کا شبہ تھا اور وعدہ کیا کہ وہ خود ہی مشتبہ اے این ایز حوالے کر دیں گے۔ فراہم کردہ معلومات کی بنیاد پر، محاصرے کے علاقے کے باہر ایک اور گھر سے ایک چھڑی برآمد ہوئی۔ بی ڈی ای کمانڈر بھی تقریباً صبح نو بجے گاؤں کے مضافات میں پہنچے تھے اور انہوں نے گاؤں کے سربراہ عبدالعزیز شاہ اور گاؤں کے استاد سمیت اہم شخصیات سے بھی ملاقات کی تھی۔

آپریشن کے اختتام پر یہ کہا گیا تھا کہ عوام کو کسی قسم کی ہراسانی کا سامنا نہیں کرنا پڑا، جس پر دو پولیس نمائندوں، گاؤں کے سربراہ اور ایک ممتاز شخص کے دستخط تھے۔ میں 10 مارچ 91ء کو صبح 15:45 بجے گاؤں ''کنن پوش پورہ'' پہنچا اور گاؤں کے سربراہ عبدالعزیز شاہ اور ان کے ساتھیوں کے علاوہ تقریباً 100 مرد افراد سے ملاقات کی جن میں جناب عبدالحمید ڈار (استاد) ساکن کنن، جناب حاجی محمد اکبر بھٹ، جناب غلام محی الدین بھٹ (ہیڈ ماسٹر ترہ گام) ساکن پوش پورہ شامل تھے۔

گاؤں کے رہائشیوں نے آپریشن کی تاریخ اور اوقات کی تصدیق کی اور ایک بار پھر فوجیوں کے مجموعی طرزِ عمل کی تعریف کی۔ تاہم انہوں نے الزام عائد کیا کہ آپریشن کے دوران کچھ زیادتیاں کی گئیں جس کے لئے انہوں نے آپریشن کے 2 دن بعد یعنی 26 فروری 91 کو درخواست جمع کرائی تھی جس پر ان سے وعدہ کیا گیا تھا کہ مناسب تحقیقات کی جائیں گی۔ وہ جواب سے کافی مطمئن تھے اور درخواست کی کہ مستقبل میں سرچ آپریشن صرف دن کے اوقات میں کیا جائے۔ اے ٹی ٹی کی فہرست کے مطابق گاؤں کے 6

فیصد رہائشی سیکورٹی فورسز سے تعلق رکھتے ہیں۔ پانچ جموں و کشمیر پولیس اور ایک ہوم گارڈ سے ہیں۔ مکینوں کی بنیادی شکایت یہ تھی کہ ہیلمٹ، بیلٹ، پولیس کی وردی اور تلاشی کے وقت گاؤں میں موجود نہ ہونے والے ان پولیس اہلکاروں کی تصاویر دکھانے کے باوجود سیکیورٹی فورسز نے انہیں نظر انداز کیا اور اہل خانہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کیا جیسے وہ مشتبہ افراد کو چھپا رہے ہوں۔

جب ان سے خصوصی طور پر پوچھا گیا کہ کیا خواتین کے ساتھ کوئی بدسلوکی یا چھیڑ چھاڑ کی گئی ہے تو گاؤں کے سردار نے پیغام آگے بھجوایا اور تقریباً 30 خواتین کو اپنی شکایات درج کرانے کے لئے جمع کیا گیا۔ زیادہ تر خواتین کی عمریں 40 سے 50 سال کے درمیان تھیں اور کچھ کی عمر 30 سال کے قریب تھیں۔ ان خواتین کو الگ کیا گیا اور پولیس اہلکاروں، گاؤں کے سردار اور اسکول ٹیچر کی موجودگی میں مردوں سے دور اپنی شکایات کی وضاحت کرنے کے لئے کہا گیا۔ 13 خواتین کا کہنا تھا کہ ان کی عصمت دری کی گئی ہے۔ پہلی دو خواتین نے بتایا کہ دو سے تین افراد نے عصمت دری کی ہے۔ بعد میں شکایت کنندگان نے یہ تعداد بڑھا کر 6 سے 8 افراد فی خاتون کر دی۔

مبینہ بدسلوکی کا واقعہ آدھی رات کے قریب پیش آیا اور خواتین کے مطابق فوجی ایک سے دو گھنٹے تک گھروں میں رہے۔ مبینہ بدسلوکی کے وقت، مبینہ متاثرین کی طرف سے کوئی چیخ پکار نہیں ہوئی کیوں کہ پڑوسی گھروں کے رہائشیوں نے، جن کی تلاشی نہیں لی جا رہی تھی، کچھ نہیں سنا تھا۔ جسمانی تشدد کی نشاندہی کرنے والی خراشوں جیسے کوئی نشان نظر نہیں آئے۔ صرف ایک سوتی فیرن (لباس) پیش کیا گیا جو پرانا اور پھٹا ہوا تھا۔ کوئی اونی لباس یا اوپر پہنا جانے والا کوئی دوسرا لباس پیش نہیں کیا گیا تھا۔ ابتدائی مرحلے میں صرف بوڑھی عورتیں ہی آگے آئیں پھر آہستہ آہستہ اسکول ٹیچر کے اشارے پر دیگر خواتین بھی اپنی شکایات درج کرانے آئیں۔ پہلی عورت ایک پاگل شخص کی بیوی تھی جسے اس نے چھوڑ دیا

تھا اور جس کا ٹھکانہ معلوم نہیں تھا۔ جب خواتین اپنی شکایات درج کرارہی تھیں تو دوسری عورتیں ہنس رہی تھیں اور جب یہ بات اسکول ٹیچر کے علم میں لائی گئی تو وہ کافی پریشان تھا۔

چونکہ مبینہ متاثرین کے ساتھ ایک گھنٹے سے زیادہ وقت گزارا گیا تھا، لہذا شکایات ختم ہوگئیں اور خواتین بے سکون لگیں۔ ایسا لگتا تھا کہ انہیں پڑھایا گیا سبق مکمل ہو چکا اور وہ نہیں جانتیں کہ مزید کیا کہنا ہے۔ انہوں نے تصدیق کی کہ ڈاکٹر نے ان کا اور ان کے بچوں کا علاج کیا تھا اور آفیسرز کی تعریف کی تھی۔ کچھ گھروں کا معائنہ کیا گیا جہاں مبینہ بدسلوکی کی گئی تھی لیکن جبری داخلے کا کوئی نشان نہیں دیکھا گیا جیسے ٹوٹے ہوئے تالے/ بولٹ۔ پورے گاؤں میں طاقت کے استعمال/ آتشزنی کی وجہ سے گھر یا املاک کو نقصان پہنچنے کا کوئی ثبوت نہیں ہے۔

دورے کے اختتام پر گاؤں کے لوگوں نے رضا کارانہ طور پر آنے والی پارٹی کو ترہ گام تک لے جانے کا فیصلہ کیا کیوں کہ انہیں خدشہ تھا کہ کچھ گمراہ افراد آنے والی پارٹی کو نقصان پہنچا سکتے ہیں۔ ولیج ہیڈ مین، پولیس اہلکار اور ممتاز شہریوں کی جانب سے ایک سٹرفکیٹ حاصل کیا گیا جس میں تصدیق کی گئی کہ انہیں 10 مارچ 91ء کو اس دورے کے خلاف کوئی شکایت نہیں ہے۔

میری رائے ہے کہ 23/ 24 فروری 91ء کو تلاشی مہم کے دوران کوئی ریپ نہیں ہوسکتا تھا۔ اس دوران برف باری ہورہی تھی۔ ہر سرچ پارٹی کی سربراہی ایک آفیسر کر رہا تھا اور کمانڈنگ افسر ذاتی طور پر آپریشنز کی نگرانی کررہے تھے۔ بی ڈی ای سی ڈی آر نے بھی آپریشنز پر کڑی نظر رکھی ہے۔ تلاشی کے دوران ٹی پی ایس تناؤ کا شکار ہیں اور اے این ایز کی جانب سے اچانک حملے سے خوفزدہ ہیں اور اس طرح کی حرکتوں میں ملوث ہونے کے بجائے سیکورٹی فراہم کرنے کے لیے زیادہ فکرمند ہیں۔ آپریشن کے دو دن بعد گاؤں سے خود اے این ایز نے رضا کارانہ طور پر اسلحہ سمیت ہتھیار ڈال دیے۔ مبینہ زیادتیوں کے

ایک دن بعد بڑی تعداد میں خواتین اے ڈی ایس (بی) ترہ گام کے پاس معمول کے علاج کے لیے آئی تھیں۔ مسلح افواج پر اس طرح کا اعتماد ظاہر نہیں کیا جا سکتا تھا اگر ظلم اور ہراسانی کا ارتکاب کیا گیا ہوتا جیسا کہ الزام لگایا گیا تھا۔

ایسا لگتا ہے کہ ''کنن پوش پورہ'' کے باشندوں کو اپنے پڑوس کے گاؤں سے یہ طعنہ دیا کہ ان کی خواتین کی بے حرمتی کی گئی ہے، جس کی وجہ سے انہیں شکایت درج کرانے کی ترغیب ملی۔ اس معاملے کو اعلیٰ پولیس افسران کے علم میں لانے کے لئے جموں وکشمیر پولیس کی نمائندگی کرنے والے اہلکاروں کی مدد لی گئی۔ یہ الزامات بے بنیاد، مسخ شدہ، شرارتی اور دیگر محرکات پر مبنی ہیں اور درج ذیل وجوہات کی بناء پر لگائے گئے ہیں: فوج کو بدنام کریں۔ کچھ مشتبہ اے این ایز کو تحفظ فراہم کرنے کے لئے مزید تلاشی اور محاصرے کو روکیں۔ مقام: سی/ او 56 اے پی او (ایچ کے شرما) تاریخ: 13 مارچ 91ء

5۔ ڈویژنل کمشنر وجاہت حبیب اللہ کی خفیہ رپورٹ کا متن

(حذف شدہ پیراگراف سمیت)

سیکرٹ (خفیہ)

کنن پوشپورہ، کپواڑہ کے واقعے پر ڈویژنل کمشنر، کشمیر کی رپورٹ

کپواڑہ کے ڈپٹی کمشنر سے ان کے حوالہ نمبر کانفیڈنشل // 3/ 91 1956-61 کے ذریعے ایک رپورٹ موصول ہوئی تھی جس میں کہا گیا تھا کہ کنن کے دیہاتیوں سے انہیں موصول ہونے والی ایک رپورٹ کے مطابق 23/ 24 فروری کی رات کو 4 راجستھان رائفلز کے عناصر کے ذریعہ محاصرے اور تلاشی کی کارروائیوں کے دوران اس گاؤں میں اجتماعی عصمت دری کی گئی تھی۔ اس کے مطابق وہ 5 مارچ کو موقع پر پہنچا تھا اور اس کی ابتدائی تحقیقات کے مطابق اسے پہلی نظر میں ایسا لگتا ہے کہ ایک خوفناک

جرم کا ارتکاب کیا گیا ہے۔ ان کی رپورٹ کی ایک کاپی ضمیمہ اے میں موجود ہے۔ اس رپورٹ کی بنیاد پر تھانہ ترہ گام میں مقدمہ درج کر کے تفتیش شروع کر دی گئی۔

بتایا جاتا ہے کہ مبینہ متاثرین کا طبی معائنہ 16 مارچ کو کیا گیا تھا۔ اس کے نتیجے میں ڈی جی پولیس جموں وکشمیر کی جانب سے رابطہ کرنے پر کور کمانڈر نے بریگیڈیئر ایچ کے شرما کمانڈر 19 آرٹی بریگیڈ کو گاؤں کا دورہ کرنے اور رپورٹ کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ بریگیڈیئر نے 10 مارچ کو کچھ مقامی انکوائریاں کیں اور اس نتیجے پر پہنچے کہ رپورٹ بے بنیاد ہے تاہم ان کی رپورٹ میں اس بات پر تفصیل سے بات نہیں کی گئی ہے کہ انہوں نے گاؤں کی متعدد خواتین کی جانب سے ان کے سامنے رکھے گئے بیانات کو مکمل طور پر مسترد کیوں کیا ہے۔ اس رپورٹ کی ایک کاپی ضمیمہ بی میں ہے۔ اس رپورٹ کے ساتھ ضمیمہ بی میں میڈیکل آفیسر، ہیڈکوارٹر 68 ایم ٹی این بی ڈی سے حاصل کردہ ایک بیان ہے جس میں ان خواتین کی فہرست دی گئی ہے جنہوں نے 24 اور 28 فروری کے درمیان کنن اور بابا گنڈ گاؤں سے ان کے میڈیکل کیمپ میں شرکت کی تھی۔

دریں اثنا، اس مبینہ جرم کی خبر پر مقامی اور قومی پریس کی جانب سے سخت منفی تبصرہ کیا گیا تھا اور جاری کردہ تردیدیں سزا دینے میں ناکام رہی تھیں۔ ڈی جی پی اور کور کمانڈر کے ساتھ بات چیت کے بعد یہ فیصلہ کیا گیا کہ دستخط کرنے والے گاؤں کا دورہ کر سکتے ہیں اور متعلقہ فوجی افسران سے بھی بات چیت کر سکتے ہیں تاکہ شکوک وشبہات کو دور کرنے اور اعتماد کی بحالی کے لئے ضروری کارروائی کا تعین کیا جا سکے۔ اس لئے میں نے لیفٹیننٹ کرنل نعیم فاروقی، جناب تیاگی کمٹ 76 بی ایس ایف، ڈی سی اور کپواڑہ کے ایس پی کے سمیت 18 مارچ 1991ء کو گاؤں کا دورہ کیا۔

پس منظر:

کنن ترہ گام سے تقریباً 4 کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ہے۔ گاؤں کی طرف

جانے والی سڑک اب بھی برف سے ڈھکی ہوئی ہے اور گاڑی چلانے کے قابل نہیں ہے۔ کمانڈر 68 بی ڈی ای کے مطابق اس گاؤں میں عسکریت پسندوں کو پناہ دینے کی تاریخ رہی ہے۔ بی ایس ایف کے نمائندے نے اس بات کی تصدیق کی کہ انہوں نے بھی اکثر گاؤں میں محاصرے اور تلاشی کی کارروائیاں کی ہیں۔ بی ڈی ای کمانڈر نے یہ بھی اشارہ دیا کہ گاؤں والے ایسے عناصر اور ہتھیاروں کو فوج کے حوالے کرنے کا انتظام کرنے میں تعاون کر رہے تھے۔ اس کی تائید سی ڈی آر 19 آرٹی بی ڈی ای کی منسلک رپورٹ سے بھی ہوتی ہے۔ تاہم 23 / 24 فروری کی رات پہلی بار رات بھر آپریشن کیا گیا۔ آپریشن کو کس طرح انجام دیا گیا اس کی تفصیلات پیراگراف 3 سے 7، ضمیمہ بی میں بیان کی گئی ہیں اور یہاں دہرانے کی ضرورت نہیں ہے۔

الزام:

یہ الزام ضمیمہ اے میں ڈی سی کی رپورٹ میں شامل ہے۔ یہ بات قابل ذکر ہے کہ 23 خواتین کی عصمت دری کی شکایت کا حوالہ دیتے ہوئے، میرے سامنے پیش ہونے والی خواتین کی تعداد 42 تھی، جن میں سے 3 کو چھوڑ کر سبھی نے شکایت کی کہ ان کے ساتھ اسی طرح کا سلوک کیا گیا تھا۔ ان کا بیان یہ تھا کہ بدقسمت رات کو 11 بجے سے صبح 7 بجے کے درمیان متعدد فوجی اہلکار زبردستی ان کے گھروں میں داخل ہوئے اور جب مردوں کو پوچھ گچھ کے لئے لے جایا گیا تو خواتین کو ڈیڑھ گھنٹے سے لے کر کئی گھنٹوں تک اور کئی بار بار ریپ کیا گیا۔ بیان میں کہا گیا تھا کہ اس دوران پارٹی کے ساتھ موجود افسران جو پہلے گاؤں کے اردگرد تھے، پھر ایک علیحدہ عمارت میں چلے گئے اور پوچھ گچھ کے لئے وہیں رہے۔ ان میں سے صرف ایک خاتون نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے وہاں موجود افسروں کو کوئی رپورٹ نہیں دی لیکن الزام لگایا کہ انہیں نظر انداز کیا گیا۔ دو خواتین نے یہ بھی دعوی کیا کہ مرد شراب پی رہے تھے۔

ڈی سی کی اطلاع کے مطابق موقع سے کچھ بوتلیں برآمد ہوئی ہیں۔

۔۔۔۔(جے کے سی سی ایس کی طرف سے حذف شدہ نام) نے الزام لگایا کہ اصل میں کوئی تلاشی نہیں لی گئی تھی اور ایسا لگتا ہے کہ وہ لوگ صرف عصمت دری کی نیت سے آئے تھے۔ ان الزامات کی حمایت میں پھٹے ہوئے لباس (فران) وغیرہ بھی دکھائے گئے۔ پوچھے جانے پر زیادہ تر خواتین نے کہا کہ وہ اس لیے نہیں روئیں کیوں کہ انہیں جوانوں نے بندوق کی نوک پر دھمکی دی تھی کہ اگر انہوں نے ایسا کیا تو انہیں گولی ماردی جائے گی۔ وہ رات کو اپنے گھروں سے باہر نکلنے سے قاصر تھیں تا کہ اپنے مردوں سے شکایت کرسکیں۔ گاؤں کے قابل ذکر لوگ جو مجھ سے ملنے کے لئے جمع ہوئے تھے اور جن میں نمبردار، اساتذہ اور ریٹائرڈ پولیس اہلکار شامل تھے، ان سے یہ بھی پوچھا گیا کہ جب اس طرح کا کوئی واقعہ پیش آیا تھا تو انہوں نے فوری طور پر موقع پر موجود سینئر افسران سے مداخلت کی درخواست کیوں نہیں کی اور درحقیقت ان کی روانگی پر تلاشی پارٹی کو این او سی کیوں دیا تھا۔ انہوں نے بتایا کہ انہیں اس بات کا علم فوجی قافلے کے جانے کے بعد ہی ہوا اور وہ اس وقت تک گھر نہیں گئے تھے۔

تردید:

4 راج رائفلز کی رپورٹ کی عکاسی سی ڈی آر 19 آرٹی بی ڈی ای کی رپورٹ میں کی گئی ہے۔ میں نے اس معاملے پر سی ڈی آر 68 بی ڈی ای کے ساتھ بھی تبادلہ خیال کیا ہے، جو 4 راج رائفلز کی تشکیل کا سربراہ ہے۔ اور سی او 4 راج رائفلز کے ساتھ بھی۔ ان افسروں کے مطابق اور جیسا کہ میری ذاتی معلومات سے پتہ چلتا ہے کہ افسروں کی نگرانی کے بغیر سویلین علاقے میں تلاشی مہم کے لئے جوانوں کو بھیجنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ آپریشن کے دوران شراب لے جانا بھی ممکن نہیں ہے۔

افسران نے اس بات پر بھی زور دیا کہ عوام کی خیر سگالی حاصل کرنا ان کے بنیادی

خدشات میں سے ایک ہے اور فوجیوں کی نظم وضبط کی کسی بھی کارروائی پر پردہ ڈالنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ کمانڈر آر 86 بریگیڈ آر نے مجھے یہ بھی بتایا کہ مبینہ جرم کے بعد گاؤں والوں نے ان سے کئی بار ملاقات کی تھی۔ پہلے موقع پر انہوں نے اس بات کا ذکر کیا تھا کہ کنن میں عصمت دری کی افواہ ہے لیکن ان کے سوالات کے جواب میں انہوں نے کہا تھا کہ وہ مبینہ متاثرہ کی شناخت کرنے میں ناکام رہے ہیں۔ یونٹ کے میڈیکل آفیسر نے بھی ان خواتین کا علاج کیا تھا اور ان سے ایسی کوئی شکایت نہیں کی تھی۔

تردید:

ڈی سی اور سی ڈی آر 19 آرٹی بی ڈی ای کی رپورٹ کا مطالعہ کرنے اور متعلقہ افسران اور مبینہ متاثرین سے بات کرنے کے بعد، میری رائے ہے کہ درج ذیل وجوہات کی بناء پر اجتماعی عصمت دری کے الزامات کو برقرار نہیں رکھا جاسکتا ہے:

1۔ مبینہ متاثرین کی تعداد میں مسلسل اتار چڑھاؤ آرہا ہے۔ گاؤں والوں نے مبینہ جرم کے دو دن بعد سی ڈی آر 68 بی ڈی ای کو ایک ہی ریپ کی افواہ کی اطلاع دی تھی، لیکن ڈی سی کو 23 کے اعداد وشمار کی اطلاع دی گئی تھی۔ متاثرہ ہونے کا دعویٰ کرنے والی 39 خواتین میرے سامنے پیش ہوئی ہیں اور کچھ دیہاتیوں نے بتایا کہ اب بھی کچھ ایسی ہیں جو کھل کر رپورٹ کرنے کے لئے تیار ہیں۔ نجی تفتیش کاروں کو 53 مقدمات کے بارے میں بتایا گیا ہے۔ اگر ہر معاملے میں 5 سے 15 لوگوں نے عصمت دری کی، جیسا کہ الزام لگایا گیا تھا، تو گاؤں میں کم از کم 300 مرد اس کے سوا کچھ نہیں کرتے! درحقیقت مردوں کی تعداد 150 تھی۔

2۔ یہ دلچسپ بات ہے کہ اتنے بڑے واقعہ کے مبینہ طور پر ہونے کے باوجود جرم کی کوئی رپورٹ نہیں دی گئی۔ گاؤں والوں سے میں نے خاص طور پر اس معاملے پر پوچھ گچھ کی تھی لیکن وہ تسلی بخش وضاحت دینے سے قاصر تھے کہ اگلے ہی دن ڈی سی یا ایس

پی سے رابطہ کیوں نہیں کیا گیا۔ ان کا یہ بیان کہ انہیں نہیں لگتا کہ ڈی سی کوئی کارروائی کر سکتے ہیں، اس کی تردید کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ آخر کار گاؤں والوں نے ڈی سی کو اطلاع دی۔

3۔ یہ ممکن ہے کہ عصمت دری کے کسی الگ تھلگ معاملے میں متاثرہ کو خاموشی اختیار کرنے پر مجبور کیا گیا ہو اور اس وقت کوئی شور شرابہ نہ ہوا ہو۔ تاہم ایسی صورتحال میں جب گاؤں کا تقریباً ہر گھر مبینہ طور پر متاثر ہوا تھا، یہ ناقابل فہم ہے کہ کوئی خطرے کی گھنٹی نہیں بجائی جا سکتی تھی اور یہ کہ فوج کے جانے کے بعد تک یہ لوگ لاعلم تھے۔ اس شک کو سی او کے اس بیان سے مزید تقویت ملتی ہے کہ وہ گاؤں کے کچھ بزرگوں کے ساتھ روانگی سے پہلے کچھ گھروں کے اردگرد گئے تھے اور ان سے ایسی کوئی شکایت نہیں کی گئی تھی۔

4۔ کسی بھی افسر کے خلاف کوئی شکایت نہیں کی گئی ہے۔ سبھی ہاتھوں سے یہ بھی تسلیم کیا جاتا ہے کہ جب جرم کیا گیا تو افسر گاؤں میں تھے۔ یہ یقین کرنا ناممکن ہے کہ ہندوستانی فوج جیسی فورس کے افسران اپنے مردوں کو کسی گاؤں میں لے جائیں گے جس کا واحد مقصد اس کی خواتین کی خلاف ورزی کرنا ہے۔ یہاں تک کہ اگر یہ تسلیم کرنا ممکن ہوتا اور فوج واقعی اتنی سفاک فورس تھی تو یہ وضاحت کرنا ناممکن ہوگا کہ افسران نے خود اس طرح کے کام میں حصہ کیوں نہیں لیا۔

5۔ موقع پر شراب کی بوتلیں ملنے سے شکایت مزید کمزور ہو جاتی ہے۔ آپریشن کے دوران کسی بھی طاقت کو مشروبات لے جانے کی اجازت نہیں ہے لہٰذا بوتلیں واضح طور پر ایک سازش ہیں۔ یہ ثبوت شکایت کنندہ کی ساکھ کی حمایت نہیں کرتا بلکہ کمزور کرتا ہے۔

6۔ ایپکس بی میں خواتین کی فہرست میں بہت سے نام شامل ہیں جو میرے سامنے پیش ہونے والے متعدد شکایت کنندگان کے ناموں سے مطابقت رکھتے ہیں (جیسا کہ ایک ٹک سے اشارہ کیا گیا ہے)۔ چوں کہ تفصیلات دستیاب نہیں ہیں اس لئے یہ کہنا ممکن نہیں ہے کہ آیا یہ وہی افراد ہیں یا نہیں۔ لیکن چوں کہ تقریباً پورا گاؤں اس کا شکار ہونے کا دعویٰ کرتا

ہے، اس لیے یہ مان لینا چاہیے کہ کم از کم ان میں سے کچھ ایسے ہیں۔ اور یہ بہت عجیب ہوگا اگر وہ واقعے کے اگلے ہی دن ڈاکٹر کے سامنے پیش ہوں اور اس کی شکایت نہ کریں۔

اگرچہ شکایت کی صداقت انتہائی مشکوک ہے، لیکن پھر بھی اس بات کا تعین کرنے کی ضرورت ہے کہ اس طرح کی شکایت کیوں کی گئی تھی۔ گاؤں کے لوگ سادہ لوگ ہیں اور فوج کے اپنے اعتراف کے مطابق عام طور پر فوج کے افسروں کی حفاظت کے بارے میں مددگار اور محتاط رہے ہیں۔ یہ ممکن ہے کہ انہوں نے عسکریت پسندوں کے دباؤ میں کام کیا ہو اور رپورٹ تیار کرنے میں طویل تاخیر ان کے اس کا مقابلہ کرنے کے قابل نہ ہونے کا نتیجہ تھی۔ فوج کو سفاک، سویلین انتظامیہ کو غیر موثر اور حکومت ہند کو بے پرواہ کے طور پر بدنام کرنے کے خواہاں عناصر نے اس مسئلے پر مہم چلائی ہے۔ یہ عوام میں فوج کے لئے بڑھتی ہوئی خیر سگالی اور بہتر سول ملٹری رابطے کے تناظر میں سامنے آیا ہے۔ لیکن اس مرحلے پر اور جانچ کی موجودہ سطح پر اس امکان سے انکار ممکن نہیں ہے کہ الگ الگ واقعات پیش آئے ہیں جس نے گاؤں والوں کو پریشان کر دیا ہے۔

بریگیڈیئر شرما کے برعکس میں گاؤں کی بہت سی خواتین کو مالی اعانت فراہم کرتا ہوں جن سے میں نے کشمیری زبان میں بات کی تھی۔ مقدمہ درج کر لیا گیا ہے اور تحقیقات شروع کر دی گئی ہیں۔ طبی معائنے کے روشن ہونے کا امکان نہیں ہے کیوں کہ یہ واقعہ کے اتنے عرصے بعد ہوا ہے۔ یہ سفارش کی جاتی ہے کہ تحقیقات کی سطح کو گزیٹیڈ پولیس افسر کے برابر کیا جائے۔ ایس پی کپواڑہ نے اشارہ دیا ہے کہ دیگر معاملوں میں انہیں فوج سے جانچ کے لئے ضروری تعاون نہیں مل رہا تھا۔ کمانڈر 68 بی ڈی ای کا کہنا ہے کہ جب بھی کہا جائے گا تعاون دیا جائے گا۔ کور ہیڈ کوارٹر کے احکامات کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا جائے گا۔

مستقبل کے لئے حفاظتی اقدامات:

مستقبل میں اس طرح کے شکایت کنندگان پیدا ہونے سے روکنے کے لئے جو

عوام کے اعتماد کو جھنجھوڑتے ہیں اور ملک کا منصفانہ نام بدنام کرتے ہیں، مندرجہ ذیل اقدامات پر غور کیا جاسکتا ہے:

اس طرح کی کارروائیوں کے دوران مقامی پولیس اہلکاروں کو کہا جاتا ہے کہ جب آپریشن کیا جائے تو وہ گاؤں سے باہر رہیں۔ چونکہ پولیس اہلکاروں کو آپریشن میں مدد کرنے کے لئے ساتھ لے جایا جاتا ہے لہذا انہیں اصل تلاشی کے ساتھ منسلک کیا جانا چاہئے۔ یہ بہتر ہوگا اگر مجسٹریٹ کو رازداری پر سمجھوتہ کیے بغیر فوجی دستے کے ساتھ جانے کے لئے کہا جائے۔ وہ سویلین ضروریات کو پورا کرسکتا ہے اور موجود سینئر افسر کو رپورٹ کر سکتا ہے کسی بھی شکایت کی صورت میں، اگرچہ اس گاؤں اور ترہ گام میں 68 بی ڈی ای ہیڈکوارٹر کے طرزِ عمل کے لئے بہت تعریف سنی گئی تھی، لیکن 4 راج رائفلز کے معاملے میں ایسا نہیں تھا۔ یہ یونٹ عوام اور سول حکام دونوں کی نظروں میں اپنے امیج کی تزئین و آرائش کے لئے پرعزم کوشش کرسکتا ہے۔ چوں کہ یہ خاص آپریشن بازیابی کے لحاظ سے خاص طور پر نتیجہ خیز نہیں رہا ہے (براہ کرم پیرا 3 این بی دیکھیں)، لہذا پوری رات تلاش کرنے کے مشورے پر دوبارہ غور کیا جاسکتا ہے۔ وجاہت حبیب اللہ ڈویژنل کمشنر، کشمیر سری نگر

6۔ محمد سکندر ملک کی ڈائری

23 فروری، 1991ء ہفتہ: [.....] کنن پوشپورہ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ جگہ این سی (غیر سول) حکام کی طرف سے درمیانی رات میں سی/ ڈی (کریک ڈاؤن) کے زیر اثر تھی۔ برف باری، بارش، سورج بھی چمکتا ہے۔

24 فروری، 1991ء اتوار: کپواڑہ ۔ برف باری، بارش، دھوپ بھی۔

25 فروری 1991ء پیر: دفتر/ ڈی سی کا دفتر۔ کپواڑہ سے کرال پورہ اور واپسی۔

26 فروری 1991ء بروز منگل: دفتر/ ڈی سی آفس میں اجلاس کپواڑہ سے اوورہ اور واپسی۔

27 فروری، 1991ء بدھ: دفتری کام اور مارکیٹنگ سوسائٹی کا دورہ۔ کپواڑہ سے (...) کلن گم اور واپسی۔

28 فروری 1991ء جمعرات: اے ایل کی افواج کو ہندوستانی وقت کے مطابق 10:30 بجے روکا گیا۔ کپواڑہ سے ترہ گام اور واپسی۔

یکم مارچ 1991ء جمعہ: ریگی پورہ، بہی پورہ، گوشی میں آدھی رات سے صبح 11 بجے تک کریک ڈاؤن۔ نماز جمعہ کے بعد دفتر میں، ڈی سی آفس میں ڈی سی سے ملاقات (کپواڑہ کے مقامی) حبیب اللہ جموں کے لیے روانہ۔

2 مارچ، 1991ء ہفتہ: دفتر/ ڈی سی آفس، کپواڑہ سے خمیال تک اور واپسی۔

3 مارچ، 1991ء اتوار: کپواڑہ سے کرال پورہ اور واپسی۔ برف باری/ بارش

4 مارچ 1991ء پیر: دفتر/ ڈی سی آفس۔ برف باری، بارش۔ کپواڑہ سے ہل منت پورہ، ترہگام اور واپسی۔

5 مارچ، 1991ء منگل: دوپہر 2 بجے دفتر۔ این سی اتھارٹی کی جانب سے کریک ڈاؤن کی موقع پر تحقیقات کے لئے ڈی سی کے ہمراہ کنن روانگی۔ شام پانچ بجکر پینتالیس منٹ پر ہیڈ کوارٹر واپسی۔ 'ریپ وغیرہ کے حوالے سے بات چیت'، این ٹی کے ساتھ ہل منت پورہ تک۔

18 مارچ 1991ء بروز پیر: کنن میں ڈویژن حکام کا پہلا معائنہ دوپہر 12 بجے دوپہر ڈھائی بجے (ترہگام) واپسی، 68 بریگیڈ میں اور کپواڑہ سے روانگی (کپواڑہ سے ترہ گام تک)۔

جمعرات 21 مارچ 1991ء: خصوصی کمیشن نے کپواڑہ کا دورہ کیا۔ (کنن کا ذکر نہیں ہے)

24 مارچ 1991ء اتوار: ایچ کیوٹو بریگیڈ، قانون کے مطابق کچھ انکوائری کی ہے۔ ڈی سی کے احکامات پر کپواڑہ کے بعد حبین کی طرف روانگی۔

6 اپریل، 1991ء ہفتہ: ڈویژن کمانڈر سے موصول ہونے والے سگنل کے مطابق سرینگر چھوڑ دیا۔

9 اپریل 1991ء بروز منگل: سہ پہر ساڑھے تین بجے۔کمانڈر کے ساتھ ڈی سی کی ملاقات کا وقت اور تاریخ طے کرنے کے سلسلے میں بریگیڈ سے روانگی۔

4 جون 1991ء بروز منگل صبح 10 بجے وجاہت صاحب کے لئے الوداعی پارٹی کے سلسلے میں سرینگر سے روانگی۔رات سوپور میں۔

11 جون 1991ء بروز منگل صبح 8 بجے پی سی آئی کی جانب سے کنن کے دورے کے سلسلے میں ڈپٹی ایس پی کے ہمراہ ترہ گام سے روانگی۔شام ساڑھے پانچ بجے ڈی سی کے ساتھ ملاقات بھی ہوئی۔

☆......☆

بارہواں حصہ

کشمیر کی داستان الم

بھارت کے زیر قبضہ جموں و کشمیر عرصہ دراز سے کچھ اپنی کچھ پرائے لوگوں کی لگائی آگ میں جل رہا ہے۔کشمیری عورتیں اور مرد ناگفتہ بہ حالات میں بے بسی کی تصویر بنے ہوئے ہیں۔بے شمار گھر اور خاندان اجڑ گئے، ہنستے بستے لوگ بغیر کسی جرم کے موت کی نیند سلا دیئے گئے۔یہ معصوم اور بے گناہ لوگ مقبوضہ کشمیر میں ہوں یا پاکستان میں یا دنیا کے کسی بھی کونے میں، انہیں اپنے قصور کا کوئی علم نہیں، بس اتنا جانتے ہیں کہ انہیں مسلمان اور کشمیر کی جنت نظیر دھرتی کا باسی ہونے کی سزا دی جارہی ہے، وہ نہیں جانتے ان کے لئے آنے والا کل کیسا ہوگا، اور کیا وہ کبھی اپنی اصل شناخت اور کشمیری باشندے ہونے کا حق حاصل کر پائیں گے، انہیں یہ بھی نہیں معلوم کہ خود وہ یا ان کے متعلقین میں سے کس کو کب کہاں کس طرح کس جرم کی پاداش میں بے دردی سے مار دیا جائے گا اور عالمگیر اخوت وامن کا راگ الاپتی دنیا محض تماشائی بنی رہے گی۔

اگلے صفحات میں کشمیریوں کی ایسی ہی چند فکر انگیز اور کربناک داستانیں پیش کی جارہی ہیں جو ہمیں یہ بتاتی ہیں کہ مقبوضہ کشمیر اور دنیا کے دیگر حصوں میں کشمیری مرد وخواتین اس وقت کس ذہنی کرب میں مبتلا ہیں اور ان پر ٹوٹنے والے ظلم وستم کس ہولناک انداز میں روز بروز شدت اختیار کرتے جارہے ہیں۔

منیزہ کا گھر کیسے اجڑا؟

''مجھے یہاں کیوں لایا، گولی مار دیتے تو اچھا تھا۔ آپ روز لوگوں کو قتل کرتے ہو، میرے بابا کو بھی آپ لوگوں نے بھری جوانی میں بلاقصور مارا تھا، وہ آتنک وادی تھوڑا ہی تھا۔ لال چوک پر مزدوری کرتا تھا سبزی کی دوکان پر۔۔ایک روز آپ نے اسے بھی مار دیا، مجھے بھی مار دو، میں بھی آتنک وادی نہیں مزدور ہی ہوں، موبائل کی دکان پر۔۔۔مگر آپ سے کس نے پوچھنا ہے۔۔کہ کس کو، کیوں قتل کیا؟۔۔۔۔۔۔کشمیر میں تو آپ آئے ہی انسانوں کو قتل کرنے کے لیے ہو'۔ ٹارچر سیل کی کال کوٹھری میں بند شوپیاں کے قصبہ زین پورہ کا رہائشی اعجاز احمد نائیک ریاستی تشدد کے باعث زخموں سے چور، نڈھال، زندگی سے بے زار، سیل کے سنتری سے پوچھ رہا تھا کہ مجھے یہاں کیوں لایا گیا ہے، اس سے تو بہتر تھا قتل کر دیتے۔۔۔۔۔۔۔میرا قصور کیا ہے؟۔۔۔۔سنتری نے اسے ڈانٹ دیا اور خاموش رہنے کی سختی سے ہدایت کی کہ برابر والے کمرے میں صاحب لوگ آرام کر رہے ہیں۔۔ رات بھر کے جاگے اور تھکے ہوئے ہیں، اگر ان کی نیند میں خلل پڑا تو تمہارے لیے مصیبت آ جائے گی۔ خاموش بیٹھا رہ، کیوں مصیبت کو دعوت دیتا ہے۔ پھر اس رات کی تصویر آنکھوں کے سامنے گھوم گئی۔ وہ حسرت بھری نظروں سے اسے دیکھتا رہا کہ یہاں تو زبان بندی بھی ہے، لگتا ہے یہاں بولنے کی الگ سزا ہے۔

''ٹپک اے شمع، آنسو بن کے پروانے کی آنکھوں سے۔ سراپا درد ہوں، حسرت بھری ہے داستاں میری''

پھر وہ خاموش چپ چاپ سیل میں مٹی کے ننگے فرش پر بیٹھا یہ سوچتا رہا کہ شاید

کشمیری پیدا ہی اسی لیے ہوتا ہے یا کشمیریوں کی قسمت میں ہی یہ لکھ دیا گیا ہے۔۔۔۔۔کل رات شوپیاں تھانے کے عقب میں تازہ تازہ قائم کردہ ٹارچر سیل میں چار ہٹے کٹے مدراسی مسٹنڈے باری باری اعجاز احمد سے تفتیش کے بہانے اس پر تشدد کر کے پوچھتے رہے کہ آتنک وادیوں کے ٹھکانے بتاؤ۔۔۔۔۔حال ہی میں کمانڈر روات نے مدراس سے دو سو سے زائد خوں خوار فربہ جوان کشمیر بلائے تھے۔ ان کی قابلیت صرف یہی تھی کہ وہ انسانوں پر بے رحمانہ تشدد کرنے میں ماہر تھے۔۔ان کو وادی کے سارے تھانوں میں تعینات کر دیا گیا تھا۔ اس ہدایت کے ساتھ کہ جو کشمیری ان کے حوالے کیا جائے اس سے بھرپور تفتیش کی جائے، جو ملزم کی ہڈی پسلی توڑے گا اس کو انعام و اکرام سے نوازا جائے گا۔

ملزم تفتیش کے دوران ہلاک بھی ہوتا ہے تو تفتیشی ذمہ دار نہیں۔ 8 ہزار سے زائد نوجوان انہی ٹارچر سیلوں میں تفتیش کے دوران ہلاک ہوئے جنہیں اجتماعی قبروں میں دفن کر دیا گیا اور گھر والوں کو خبر تک نہ ہوئی کہ ان کے لاپتہ بچے کہاں گئے۔ انہی میں سے چھ ہزار کی بیویاں آج بھی جموں و کشمیر میں آدھی بیوہ بنی اپنے خاوندوں کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔۔۔۔شوپیاں تھانے میں تعیناتی کا ان چاروں مدراسیوں کا آج پہلا دن تھا اور اتفاق سے اعجاز احمد پہلا شکار۔ انعام و کرام کی خاطر یہ درندے ایک دوسرے پر بازی لے جاتے ہوئے اپنی ''بہادری'' کے جوہر دکھاتے رہے اور رات بھر اعجاز پر تشدد جاری رہا۔ خود اعجاز احمد کا یہ حال تھا کہ اسے کچھ خبر ہوتی تو بتاتا، وہ بھلا یہ تشدد کیسے سہتا، کبھی اس کو خیال آتا کہ جھوٹ موٹ میں ہی کچھ بول دوں، پھر سوچتا کہ ثبوت دینا پڑے گا، اگر آتنک وادیوں کے ٹھکانے نہ ملے تو پھر ہو سکتا ہے اس سے بھی زیادہ سخت مار پڑے، سچ تو یہ تھا کہ اس کے فرشتوں کو بھی معلوم نہ تھا کہ آتنک وادیوں کے ٹھکانے کہاں اور کدھر ہیں۔ پولیس والوں کو بھی خانہ پری کرنا ہوتی ہے اور پر بتانے کے لیے کہ آج کتنے آتنک وادی پکڑے۔۔۔راہ

چلتے روز کسی نہ کسی نوجوان کو پکڑ لاتے اور پھر رات بھر تھانے میں تشدد اور اس کے بعد کال کوٹھری اس کا مقدر بن جاتی۔ اعجاز احمد کی طرح کتنے نوجوان بے گناہ بھارتی جیلوں میں بند تھے جن کی خبر گیری کرنے کی اجازت بھی نہیں تھی۔۔خبر گیری تب ہوتی جب ان سے ملاقات کی اجازت ملتی۔۔۔۔۔ بھارتی سرکار نے طے کر لیا تھا کہ ہمیں کشمیری نہیں کشمیر چاہئے ،لوگوں کا کیا ہے،ایک ارب چالیس کروڑ اس کے پاس موجود ہیں۔

اعجاز احمد جوں جوں لاعلمی ظاہر کرتا تشدد کرنے والوں کو اور غصہ آتا اور مار پیٹ پہلے سے زیادہ شدت سے ہوتی۔ مدراسیوں کو بھی کیا معلوم حقیقت کیا ہے، جو کہا گیا وہ انہوں نے کیا۔۔مدراسیوں اور سنتری کو بتایا گیا تھا کہ یہ کشمیری آتنک وادی ہے، ملک دشمن ہے، بھارت ماتا کو توڑنا چاہتا ہے، اس سے دیگر آتنک وادیوں کے ٹھکانے معلوم کرو۔سو سنتری نے اعجاز کا قصور بتا دیا۔۔اس نے تھوڑی دیر توقف کے بعد اعجاز کو مخاطب کرتے ہوئے کہا۔۔" آتنک وادیوں کا یہی علاج ہوتا ہے جو تمہارا ہوا، ابھی مزید ہوگا، جب تک تم پوری معلومات نہیں بتاتے کہ آتنک وادیوں کے ٹھکانے کہاں کہاں ہیں اور وہ زین پورہ میں کس کس کے ساتھ رابطے میں ہیں"۔۔۔۔ان دنوں شوپیاں اور خاص طور پر زین پورہ مسلح حملہ آوروں کا مرکز بنا ہوا تھا۔زین پورہ سرحد کے قریب گھنے جنگلات میں گھرا ہوا کشمیر کا ایک خوب صورت گاؤں ہے، جہاں کے نوجوانوں کے بارے میں عام تاثر تھا کہ ان کا تعلق کسی نہ کسی حوالے سے حریت پسندوں سے ہے۔۔۔۔اس علاقے میں علی گیلانی اور یاسین ملک کے تو بڑے بڑے جلسے ہو چکے تھے جہاں ہزاروں نوجوانوں نے نعروں سے ماحول گرما دیا تھا۔" لکھن پور سے گلگت تک یہ کشمیر ہمارا ہے۔۔۔ سارے کا سارا ہے۔۔۔۔اس پر حکومت ہم کریں گے۔۔۔۔اس کی خاطر ہم مریں گے"۔۔۔۔اسی دوران سیکورٹی ایجنسیوں کو اعجاز احمد بھی ان جلسوں میں کسی کونے پر کھڑا ویڈیو میں نظر آ

گیا۔۔۔۔خاص طور پر برہان وانی شہید کی نماز جنازہ جس کی صف بندی اعجاز احمد کی دکان کے سامنے ہوئی۔اس دن شوپیاں بازار بند رہا تھا اور سارے دکان دار غائبانہ نماز جنازہ میں شامل ہوئے تھے۔اعجاز احمد بھی اپنی دکان کے باہر یہ منظر دیکھ رہا تھا۔اسے کیا معلوم ایجنسیوں کے کیمرے کی آنکھ اسے دیکھ رہی ہے۔اس رات تو سینکڑوں نوجوانوں کو اٹھایا گیا اور غائب کر دیا گیا۔اس رات کشمیر کی نوجوان آدھی بیواؤں میں درجنوں کا اضافہ ہوا۔

اعجاز احمد شادی شدہ تو نہیں لیکن اس کی ماں بیٹے کے لیے کسی سندر لڑکی کی تلاش میں تھی جو اعجاز احمد کا بھی خیال رکھے اور گھر داری بھی دیکھے۔۔۔لیکن قسمت تو اعجاز کو ٹارچر سیل پہنچا چکی تھی۔۔۔۔سنتری جس کا تازہ، تازہ ہریانہ سے سری نگر تبادلہ ہوا تھا، نے اعجاز کو ترکی بہ ترکی جواب دیا۔۔۔۔لیکن اعجاز احمد کے فرشتوں کو بھی خبر نہ تھی کہ یہ آتنک وادی کس بلا کا نام ہے۔۔۔وہ تو جیسے ہی جواں ہوا ماں کے سر کا بوجھ کم کرنے کے لئے تعلیم چھوڑ کر کام پر لگ گیا تھا۔۔۔۔سنتری کا جواب سن کر اسے سخت غصہ آیا۔لیکن کال کوٹھری میں قید اعجاز کیا کر سکتا تھا۔ان دنوں وادیٔ کشمیر میں ٹھٹھرتی سردی کا راج تھا۔یہاں شوپیاں میں 10 برسوں کے دوران سردرات کا ریکارڈ ٹوٹا تھا۔ہڈیوں کو پگھلانے والی ٹھنڈ نے اعجاز کی زخمی ہڈیوں میں اور زیادہ درد پیدا کر دیا۔

آج ہی رات جب سری نگر سمیت پوری وادی میں سردی کے باعث معمول کی زندگی بُری طرح متاثر تھی، ڈل جھیل سمیت آبی ذخائر منجمد تھے۔سری نگر میں کرفیو نافذ تھا، ڈل جھیل پر منچلے کرکٹ کھیلتے ہوئے کسی گاڑی کے آنے کی آواز سن کر بھاگ جاتے۔۔۔ اس روز لداخ کے قصبہ دراس میں درجہ حرارت کم سے کم منفی 29.0۔گلمرگ میں 9.2۔پہلگام میں 9.5 ڈگری۔گیٹ وے آف کشمیر میں 5.9، کپواڑہ میں منفی 6.0 ڈگری، سری نگر میں منفی 6.6 ڈگری اور یہاں شوپیاں میں منفی 6.7 ڈگری ریکارڈ کیا گیا۔

چلا کلاں کا موسم عروج پر تھا اور محکمہ موسمیات نے کئی روز تک مزید سردی اور برف باری کی پیشن گوئی کی تھی۔ اس سرد ترین رات میں ٹارچر سیل میں تین چار غیر ملکی ہٹے کٹے مسٹنڈے ایک کے بعد ایک کئی گھنٹے تک اعجاز پر تشدد کرتے رہے۔ جب وہ تھک گئے تو دوسرے کمرے میں چلے گئے جہاں آتش چنار گہی رنگ بکھیر رہی تھی اور کمرہ گرم تھا۔۔۔۔ جب وہ اہلکار کمرے کا دروازہ کھولتے تو اعجاز احمد کو گرم ہوا کا جھونکا لگتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے زندگی میں حرارت ابھی باقی ہے۔

اہلکاروں میں سے ایک نے دوسرے سے سوال کیا۔ یار یہ کشمیریوں کی طرح یہاں کی آگ میں بھی کئی رنگ ہیں۔ دوسرے نے تصدیق کرتے ہوئے کہا،'' ہاں ایک رنگ جیے ہند کہنے والوں کا، ایک پاکستان زندہ باد کہنے والوں کا، ایک آزادی والوں کا اور ایک اس چھوکرے والوں کا جن کو معلوم ہی نہیں کہ ہم کیوں مرتے ہیں''۔۔۔۔ تیسرے نے لقمہ دیا کہ ان کا اپنا بھی کوئی رنگ ہے۔ چوتھا بولا کہ ان کا اپنا رنگ تو بہت مضبوط ہے لیکن یہ اس رنگ کو چڑھاتے ہی نہیں۔ ایک مرتبہ چڑھ گیا تو کبھی نہیں اترے گا مگر بدقسمت ہیں ہمیں بھی پھنسایا ہوا ہے اور خود بھی پھنسے ہوئے ہیں۔ ایک نے کہا'' اس چھوکرے کو تو دیکھو، مک گیا؟ یا ابھی کوئی رمق باقی ہے؟ ایک نے اقبال ساجد کا شعر پڑھا،"سورج ہوں زندگی کی رمق چھوڑ جاؤں گا۔۔۔۔۔ میں ڈوب بھی گیا تو شفق چھوڑ جاؤں گا"، ''یہ کشمیری ہے سالا مر کر بھی زندہ رہے گا۔ مودی جی کو کون بتائے کہ ان کی میت بھی ان کو نہیں دینا چاہئے۔ برہان وانی کے جنازے میں 6 لاکھ لوگ جمع ہوئے۔ میتیں دے کر مجمع لگانے کی ضرورت ہی کیا ہے''۔

جب انہوں نے اعجاز احمد کی صورت حال کا جائزہ لینے کے لیے دروازہ کھولا تھا تو اعجاز کو گرمی کا ایک جھونکا لگا۔ ایک لمحے کے لیے سکون ہوا مگر دروازہ زور سے بند ہونے کے

بعد پھر سردی کی لپٹ میں آ گیا، اس کے پاس کوئی کپڑا ابھی نہ تھا کہ زخمی بدن پر ڈالے۔ اسی کیفیت میں صبح ہوئی اور اس کی پہلی نظر سنتری پر پڑی۔۔۔۔ ہاں، ہاں میرا ابا بھی آتنک وادی تھا، اسے بھی مار دیا تھا آپ لوگوں نے، مجھے بھی مار ڈالو۔۔۔ اسی لیے تو کہہ رہا ہوں کہ آتنک وادی کی سزا یہ نہیں، جو مجھے دی جا رہی ہے، بلکہ گولی ہے۔۔۔۔ گرفتاری نہیں۔۔۔۔ سنتری نے اپنے منہ پر انگلی رکھی جس کا مقصد خاموش رہنے کی ہدایت تھی اور پھر ماحول پر خاموشی چھا گئی۔۔۔۔ اعجاز سوچوں میں گم ہو گیا۔ اگر انہوں نے زندہ چھوڑ بھی دیا تو اگلے چوک پر مار دیں گے۔۔۔۔۔۔ میں نہیں چاہتا کہ ماں میری شادی کرائے۔۔۔۔۔ میں اگر رہا بھی ہوا تو، آتنک وادی کے الزام میں قتل کیا جاؤں گا۔ میرا بچہ یتیم رہے گا اور 20 سال بعد وہ بھی آتنک وادی ہونے کے الزام میں قتل کیا جائے گا۔ پھر اس کا بچہ بھی یتیم رہ جائے گا۔ آخر یہ کھیل کب تک چلتا رہے گا؟ نہ کوئی انسانی حقوق کے ادارے پوچھتے ہیں نہ اقوام متحدہ، نہ مسلمان ملک کشمیریوں کی اس حالت زار پر بولتے ہیں۔ نہ آزاد کشمیر والوں کے کانوں میں جوں رینگتی ہے۔۔۔۔۔ پاکستان کے حکمران ہیں کہ بھارت کے ساتھ دوستی اور تجارت کے فروغ کے لیے دن رات ایک کئے ہوئے ہیں۔۔۔۔ یہ بابا علی گیلانی کون ہیں اور کس لیے نعرے بازی کرتے ہیں اور ہمیں کیوں عذاب میں مبتلا کر رکھا ہے۔ نسل در نسل قتل ہونے سے بہتر یہی ہے کہ نسل ہی بڑھنے سے روک لی جائے۔ ایسی فصل تیار کرنے کا بھی کیا فائدہ جو وقت سے پہلے ہی کاٹ لی جائے۔

شائد بھارتی بھی یہی چاہتے ہیں۔ اعجاز جب سے گرفتار ہوا، انہی خیالوں میں گم رہتا کہ کشمیریوں کو زندہ رہنے کی بھی کیا ضرورت ہے۔۔۔۔ بھارت کو کشمیری نہیں کشمیر چاہئے۔۔۔ تو اس کو دے دینا ہی بہتر ہے، کوئی اس ظلم پر بول ہی نہیں رہا تو پھر ہم کیا کریں، ہم قتل ہوتے رہیں اور دنیا تماشا دیکھتی رہے یہ کب تک چلے گا؟۔۔۔۔ اعجاز کا کنبہ کل

تین افراد پر مشتمل ہے، جن میں بیوہ ماں کے علاوہ نفسیاتی مریض چھوٹا بھائی ثاقب عبداللہ نائیک شامل ہیں۔۔۔اس مختصر اور نامکمل کنبے پر آنے والی افتاد کے باوجود اعجاز احمد نائیک نے ابھی بھی یہ گمان باندھا ہوا ہے کہ اس کی ماں کو اچھا وکیل نہیں مل رہا جو اسے بلاقصور بند کال کوٹھری سے نکالنے کے لیے مدد کرے۔ ہاں ماں جی کے پاس وکیل کی فیس دینے کے پیسے بھی تو نہیں۔۔۔۔۔۔ورنہ ابھی تک وہ رہا ہو چکا ہوتا۔۔۔اسے اپنی ماں کی بہادری پر اس لیے بھی اعتماد اور ناز ہے کہ 2000ء میں جب اس کے والد محمد عبداللہ نائیک کا پولیس کی فائرنگ سے انتقال ہوا تو دونوں بھائی چھوٹے اور نابالغ تھے۔

اس روز شوپیاں کے قصبہ زین پورہ میں پولیس اور آزادی پسندوں کے درمیان فائرنگ کے تبادلے میں چار آزادی پسند اور تین بھارتی فوجی ہلاک جب کہ سات اہل کار شدید زخمی ہو گئے تھے۔ جنہیں ہیلی کاپٹر کے ذریعے سری نگر کے بڑے اسپتال منتقل کیا گیا۔۔۔۔آزادی پسندوں کی لاشیں قبضے میں لے کر انتظامیہ نے سخت کرفیو لگا رکھا تھا۔ محمد عبداللہ، چھوٹے بیٹے ثاقب عبداللہ نائیک کے پیچھے بھاگا جو اچانک دروازہ کھول کر سڑک پر چلا گیا تھا۔۔سامنے کھڑے فوجی نے بلاتاخیر فائر کھول دیا اور محمد عبداللہ کی لاش بھی قبضہ میں لے لی تھی۔ اس صورت حال میں منیزہ بانو دونوں بچوں کو ساتھ لیے خاوند کی لاش کے پاس پہنچی اور بالآخر کشمیر کے قابضین کے قبضہ سے لاش نکال لائی تھی۔

ثاقب جو بہت چھوٹا تھا، باپ کے ساتھ رونما ہونے والے واقعے کا اس کے ذہن پر شدید اثر ہوا اور وہ علاج کے باوجود ابھی تک ذہنی مریض ہے۔۔گو کہ اعجاز احمد نائیک اس وقت کم عمر تھا لیکن اتنا بھی ناسمجھ نہیں تھا کہ وہ واقعہ اسے یاد نہ ہو۔ اسے بھی ایک ایک قصہ یاد ہے لیکن اس کا کبھی اظہار نہیں کیا۔۔۔۔۔ماں نے انہیں احساس ہی نہیں ہونے دیا کہ وہ یتیم ہیں۔ اس نے اپنے دونوں بچوں کو ماں کی محبت اور پیار کے ساتھ باپ

کی شفقت بھی دی تھی ورنہ زمانہ بیواؤں اور یتیموں کو کہاں زندہ رہنے دیتا ہے۔۔۔۔اعجاز کو گمان تھا کہ ماں اس کی گرفتاری پر بھی اس کی ماں کوئی نہ کوئی دلیرانہ اقدام کرتے ہوئے رہائی کا راستہ نکال لے گی۔۔ابھی تو گرفتاری کو چند ماہ ہی ہوئے ہیں۔ جیلوں میں ایسے افراد بھی موجود ہیں جن کو 35 سال بیت گئے لیکن ضمانت تک نہیں ہوئی۔۔۔۔۔اعجاز احمد نائیک کو ماں سے بڑی انسیت بھی تھی اور مان بھی کہ ماں کی موجودگی میں وہ جیل کے ٹارچر سیل میں زیادہ دیر نہیں رہے گا لیکن رہائی کے حوالے سے اس کی سوچ اب تبدیل ہو چکی تھی۔ رہا ہو گیا تو ماں شادی کرائے گی۔۔۔۔۔گرفتاری سے چند دن پہلے ہی تو کہا تھا ماں نے کہ 25 سال کا ہو گیا ہے تو، اب شادی کر لے۔۔۔۔میرا اور کون ہے جو میں بار بار خوشیاں دیکھوں گی۔۔۔۔ثاقب تو بیمار ہی ہے۔۔۔بس تو ہی ہے۔۔۔۔سوچتی ہوں مرنے سے پہلے تمہاری خوشی دیکھ لوں۔۔۔۔کشمیر کے حالات کا بھی کوئی پتہ نہیں، کس کو کس وقت قتل کر دیا جائے۔ تمارے باپ کو بھی جوانی میں ہی بے گناہ مار دیا تھا ان بھارتی ظالموں نے۔۔۔وہ کہتا رہتا تھا اعجاز کو بڑا آدمی بناؤں گا۔

اعجاز نے اس وقت تو ماں کے کہنے پر ہامی بھر لی تھی لیکن اب اس کا ذہن تبدیل ہو چکا تھا۔۔۔۔شادی کر کے نسل بڑھانے کا کیا فائدہ جسے بالآخر بھارتی فوج کی گولی کا نشانہ بننا ہے، وہ اکثر یہ سوچتا کہ اگر کشمیری کو گولی نہیں تو ٹارچر سیل تو پکا ہے۔۔دونوں صورتوں میں بچہ یتیم ہی رہے گا۔۔۔۔۔جتن کر کے ماں اسے پال پوس کر بڑا کرے تو پھر اسے فوجی کی گولی سے مرنا یا ٹارچر سیل میں ہی رہنا ہے تو یہ سلسلہ ہی روک دینا چاہئے۔۔۔۔خیر، رہائی کے بعد ہی اس سلسلے میں ماں سے بات کروں گا، ممکن ہے مان جائے۔۔۔۔۔اعجاز احمد نائیک کو 6 مئی 2019ء کو بھارتی انٹیلی جنس ایجنسی نے گرفتار کیا تھا۔ شوپیاں کے زین پورہ بازار میں اس کی موبائل مرمت کی دکان ہے۔ اس پر الزام ہے

کہ وہ آتنک وادیوں کے رابطے میں تھا اور ان کے موبائل میں بیلنس بھرنے کے ساتھ ان کی سہولت کاری بھی کرتا تھا۔ گرفتاری کے بعد اسے ابتدائی تفتیش کے لیے کئی روز تک پولیس اسٹیشن شوپیاں یا اس سے ملحق ٹارچر سیل میں رکھا گیا تھا جہاں اس پر فرد جرم عائد کر دی گئی۔ وہاں سے اسے بدنام زمانہ ٹارچر سیل پلوامہ جیل جموں منتقل کیا گیا۔ پلوامہ سے اسے سری نگر منتقل کیا گیا تھا۔ کچھ عرصہ بعد اسے سری نگر سے کٹھوعہ منتقل کیا گیا۔ بعد میں، کٹھوعہ سے اسے دوبارہ سری نگر منتقل کر دیا گیا، جہاں وہ اس وقت قید ہے۔

اس سارے عرصے میں اس کی ماں منیزہ بانو نے اس کی رہائی کے لیے سخت جدوجہد کی۔ اس نے عدالتوں کے چکر لگائے۔ اپنے بیٹے کو جیل سے باہر دیکھنے کے لیے وکلاء سے ملاقاتیں کیں۔ گھر کا سارا سامان اور مال مویشی فروخت کر کے بڑے اور نامور وکیلوں کی خدمات حاصل کیں۔ اسے اس دوران معاشی طور پر مشکلات کا سامنا رہا، اعجاز خاندان کا واحد کمانے والا تھا۔ جو جیل میں سڑ رہا تھا۔ منیزہ بانو کے لیے جیل و عدالت کے چکر اور وکیلوں کی فیس کی ادائیگی اضافی بوجھ تھا۔۔۔ اعجاز کی گرفتاری کے بعد، منیزہ کے لیے اپنے چھوٹے بیٹے ثاقب کا خیال رکھنا اور دیکھ بھال مشکل ہو گیا جو ذہنی طور پر متاثر تھا۔ 5 اگست 2019ء کے بعد وادی میں سخت کرفیو نافذ کر دیا گیا جب کہ کووڈ لاک ڈاؤن کے بعد، حکام عالمی وبا کی وجہ سے کسی کو بھی قیدیوں سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔ اشرف صحرائی کے خاندان کو بھی ملنے کی اجازت نہیں دی تھی اسی دوران وہ جیل ہی میں انتقال کر گئے تو کشمیری معاشرے میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ بالآخر دو سال بعد منیزہ بانو اپنے بیٹے سے ملاقات کرنے میں کامیاب ہوئی۔۔۔ جب اعجاز کو عدالت سے ضمانت ملنے کے بعد آبائی گاؤں زین پورہ پولیس اسٹیشن لایا گیا۔ منیزہ بانو اعجاز کی حالت دیکھ کر بہت بلبلائی تھی لیکن اب خوش تھی کہ اس کا بیٹا گاؤں آ گیا۔ کل صبح رہا کر دیا جائے گا اور گھر آئے

گا۔۔۔ اسے کیا خبر کہ کشمیری قیدیوں کے لیے جیل کے دروازے رہا ہونے کے لیے نہیں قید ہونے کے لیے کھلتے ہیں۔ تھانے کا لاک اپ گھر بھیجنے کے لیے نہیں جیل بھیجنے کے لیے ہوتا ہے۔ رات کو تھانے میں اعجاز پر ایک اور مقدمہ درج کر کے نئی گرفتاری ڈالی گئی اور صبح سویرے مجسٹریٹ کی عدالت نے دوبارہ سری نگر جیل بھیج دیا۔۔ منیزہ بانو صبح تھانے پہنچی اور صورت حال کا علم ہوا۔ مگر اب وہ مایوس ہو چکی تھی۔۔۔ پھر وہ 27 نومبر 2021 کو سری نگر گئی تھی، لیکن اسے اپنے بیٹے سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ جیلوں کا قانون قیدیوں کی ان کے رشتہ داروں سے پندرہ دن میں ایک ملاقات کی اجازت دیتا ہے۔

لیکن کشمیریوں کے لیے یہ قانون خاموش ہے۔ منیزہ بانو کو کسی نے بتایا تھا کہ کچھ دن پہلے کوئی اعجاز سے ملا تھا اس کی حالت بہت خراب ہے وہ کمزور ہو چکا ہے۔ وہ کون تھا، منیزہ بانو کو تو کچھ یاد بھی نہیں رہا کہ جا کر اس سے دوبارہ ملے اور بیٹے کی خیریت معلوم کرے۔۔۔۔۔ یہ سوچتے سوچتے منیزہ بانو کی طبیعت بگڑتی گئی اور وہ اینٹی ڈپریشن ادویات استعمال کرنے لگی۔ وہ جو کچھ بولتی اور سوچتی، اس کا محور اس کا بیٹا اعجاز ہی تھا جسے اس نے باپ کی شہادت کے بعد پانچ سال کی عمر میں باپ بن کر پال کر جوان کیا تھا۔ اعجاز کی بات کرتے ہوئے اکثر اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے تھے۔ وہ اکثر سب کو بتاتی تھی کہ اسے اپنے بیٹے سے ملنے کی اجازت نہیں دی گئی۔

اسی اثنا منیزہ بانو کی طبیعت خراب ہوئی، اسے ہسپتال میں داخل کرایا گیا، جہاں پتہ چلا کہ اسے برین ہیمرج ہو گیا ہے، جیسے ہی اس کی بیماری کے بارے میں معلوم ہوا، اعجاز کے پیرول کے لیے درخواست دی گئی، تاکہ وہ اپنے بیٹے کو دیکھ سکے اور ماں بیٹے کی آخری ملاقات ہو سکے۔۔۔۔۔ مقامی پولیس کو اعتراض نہ ہونے کی تحریری اجازت کے باوجود پیرول کی درخواست کو مسترد کر دیا گیا۔ عدالت نے انسانی بنیادوں پر بھی اس درخواست پر

غور نہیں کیا۔ ہفتہ 11 دسمبر 2021 کو صبح 10 بجے عدالت نے اعجاز کو پے رول پر رہا کرنے سے ایک بار پھر انکار کر دیا۔ اسی روز دو پہر 2 بجے کے قریب منیزہ بانو نے آخری سانس لی، اپنے بیٹے کو آخری بار دیکھنے کی حسرت دل میں لیے دنیا سے رخصت ہوگئی۔ کشمیر کا ہنستا بستا یہ خاندان اجڑ گیا۔۔ کچھ عرصہ بعد عدالت نے مقدمہ ثابت نہ ہونے پر اعجاز کو باعزت بری کر دیا۔۔۔ لیکن اب اس دنیا میں اعجاز کے لیے کچھ بھی نہیں تھا۔ یہ کہانی صرف ایک خاندان کی نہیں، بھارتی مقبوضہ جموں وکشمیر کے ہر گھر کی ہے۔۔ افسوس ہے کہ اس دنیا میں کشمیریوں کو کوئی پرسہ دینے والا بھی نہیں ہے۔

دنیا بھی کیا کرے؟ آر پار کشمیریوں کا ایک طبقہ خوش حال زندگی، اعلیٰ عہدوں میں مگن اور عیاشیوں میں مصروف ہے، غالب اکثریت انہی کے نقش قدم پر چل رہی ہے جب کہ محدود تعداد جو آزادی کی بات کرتی ہے، قیادت سے محروم اور مصائب کا شکار ہے۔ قبرستان جوانوں سے اور گھر بیواؤں سے بھر گئے جو باقی بچے جیلوں میں ہیں۔۔۔۔۔ کبھی پلٹ کر دیکھتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ سری نگر میں ان کی مرکزی قیادت اور مظفر آباد کے بیس کیمپ کو بھی ان کی کوئی فکر یا پرواہ نہیں ہے۔

☆……☆

گڑیا کھیلتی آصفہ بانو سے درندگی

جموں کشمیر کے ضلع کٹھوعہ کے گاؤں رسانہ کی لڑکیوں کا اس موسم میں مٹی کے گھروندے بنانا اور اس میں گڈے گڈی کی شادی کرانا مقبول عام کھیل تھا۔ آصفہ بانو بھی روز اپنی سہیلیوں کے ساتھ اس کھیل میں شامل رہتی۔ ایک دن اس نے خواب دیکھا کہ وہ خود اپنے ہاں اسی کھیل میں سب سہیلیوں کو بلا رہی ہے، سو صبح اٹھتے ہی اس نے گھروندہ بنانا شروع کر دیا۔

مٹی کا گھروندہ بناتے آصفہ بانو کے چہرے پر ہلکی دھول جمی تو تھی لیکن یہ اس کی خوب صورتی اور معصومیت کا کچھ نہ بگاڑ سکی۔ سنہری مائل بھورے بالوں اور چمکیلی، بلوری آنکھوں والی آصفہ کے گال سیب جیسے سرخ اور جامنی پھولدار کپڑے ایسے اجلے تھے کہ ابھی نہا کر تبدیل کئے ہوں۔ مٹی گوندھتی، نرم و نازک، پتلی اور لمبی انگلیاں غارے سے بھری پڑی تھیں لیکن آصفہ کے مہندی لگے ہاتھ یوں چمک رہے تھے جیسے اس کی گڈی نہیں، وہ خود ہی دلہن بننے والی ہو۔

ابھی وہ یہ سوچ ہی رہی تھی کہ اس تقریب کا اہتمام کیسا ہو، کس کس سہیلی کو دعوت دے اور کون کون سے گیت گنگنائے کہ اس کی ماں کا نادر شاہی حکم جاری ہوا کہ جنگل سے گھوڑے لے آؤ۔ آصفہ نے پہلے تو ماں کے ساتھ طفلانہ ضد کی کہ میں نہیں جاتی، بھیا کو بھیجو۔ لیکن جموں وکشمیر کے سماج میں چھوٹی ذات لڑکی کی کے مصداق ماں کا سارا حکم آصفہ پر ہی چلتا تھا۔۔۔ لڑکے تو اکثر کسی بہانے گھر سے یوں غائب ہوتے ہیں جیسے گدھے کے سر سے سینگ۔۔۔ والد محمد یوسف تو کام پر گئے تھا۔ گھر میں آصفہ تھی یا اس کی امی اور دو

چھوٹے بہن بھائی۔ ماں کو پہلے خیال آیا کہ گھوڑے لینے خود ہی چلی جائے، چھوٹی آصفہ کو جنگل میں سانپ یا درندے نقصان نہ پہنچا دیں۔لیکن رات سر پر آن پہنچی تھی، گھر کا کام کاج اور رات کا سالن کھانا بھی تیار کرنا تھا۔ پھر اس نے آصفہ کو بڑے پیار سے راضی کیا کہ تمھارے گڈے گڈی کی شادی دھوم دھام سے کریں گے، بس جلدی سے گھوڑے لے آؤ اور پھر سہیلیوں کو بلانا، جب تک میں تمہارے مہمانوں کے لیے گڑ والے میٹھے چاول تیار کرتی ہوں۔ آصفہ ماں کی اس فراخدلانہ پیش کش پر بہت خوش ہوئی اور وہ سارا کھیل ادھورا چھوڑ کر گھوڑے لینے جنگل کی طرف بھاگی کہ جلدی جائے اور جلدی آئے۔ ابھی وہ گھر سے سو قدم دور ہی گئی ہوگی کہ اسے یاد آیا وہ گڈی کو یوں ہی چھوڑ آئی ہے۔ پلٹ کر ماں سے کہا تھا کہ میری گڑیا سنبھال کر رکھنا جب تک میں واپس نہیں آتی۔۔۔

گھوڑے چر پھر کر نازکی چال چلتے قدم بھرتے، کبھی آگے اور کبھی پیچھے دیکھتے، نماشاں ویلے کھونٹے پر پہنچے مگر ان کے ساتھ آصفہ نہیں تھی۔۔ ماں کے لیے یہ گمان مشکل تھا کہ آٹھ سالہ بچی کو جنگل میں درندے کھا گئے یا اژدھا نگل گیا، گھوڑوں کے ساتھ وہ کیوں نہیں، گھوڑے لینے ہی تو گئی تھی۔۔۔۔ گھوڑوں کو باندھ کر آصفہ کی ماں کافی دیر تک جنگل سے آتے راستے پر ٹک ٹکی باندھے دیکھتی رہی۔ کبھی گھر کے اندر آئے، چولہے پر رکھے گڑ والے میٹھے چاول کو دیکھے اور کبھی باہر جا کر آصفہ کا رستہ دیکھے۔ جب بے چینی بڑھی تو ماں کو آصفہ بانو پر سخت غصہ بھی آیا کہ یہ ضرور سہیلیوں کو بلانے ان کے گھر گئی ہوگی۔۔ ادھر ادھر سب جگہ سے نا ہوئی تو گھپ اندھیرے سے تھوڑا پہلے وہ جنگل کی طرف بھاگتی ہوئی گئی کہ کہیں گر کر زخمی تو نہیں ہوگئی یا کسی جانور نے کاٹ کر زخمی نہ کر دیا ہو۔۔ دور تک جانے کے بعد بھی جنگل میں نہ آصفہ ملی نہ اس کے قدموں کے نشان۔۔۔ اب تو رات ہوگئی تھی اور اندھیرا گہرا، اس قدر کہ پاؤں میں بھی کچھ نظر نہ آئے۔ پھر انہی قدموں سے وہ پلٹی کہ آصفہ کا والد گھر آ چکا ہو

گا، اس کو بھیجتی ہوں۔۔ والد پڑوسیوں کے ہمراہ ٹارچوں اور لالٹینوں کی روشنی میں رات بھر جنگل میں دور دور تک ڈھونڈتا رہا۔ لیکن، بچی کا سراغ نہیں ملا۔ نہ کوئی خون کا دھبہ نہ کپڑے۔۔ یہی حیرانگی تھی کہ آصفہ کو کسی درندے نے کھایا ہوتا تو کچھ نشان تو ملتے۔ پھر تلاش کل اُجالے تک ملتوی کر دی گئی۔ صبح سویرے پھر رسانہ گاؤں والے جنگل میں آصفہ کی تلاش کو نکلے تو پھر ناکام لوٹے۔۔۔ بالآخر 12 جنوری 2018ء کو آصفہ کے والد محمد یوسف نے ہیرانگر پولیس اسٹیشن کٹھوعہ میں شکایت درج کرائی کہ اس کی آٹھ سالہ بیٹی آصفہ بانو لاپتہ ہے جو 10 جنوری 2018ء کو قریبی جنگل میں گھوڑے لانے گئی تھی مگر لوٹ کر نہیں آئی۔۔ پہلے تو تھانے میں ایف آئی آر درج کرنے میں لیت و لعل سے کام لیا گیا مگر جب عوامی دباؤ میں اضافہ ہوا تو ایف آئی آر درج تو ہوئی لیکن تحقیقاتی افسر وہی مقرر ہوا جو آصفہ اغواء کیس کا ماسٹر مائنڈ تھا۔۔۔ ایک ہفتے تک پولیس آصفہ کو انہی راستوں اور انہی جگہوں پر تلاش کرتی رہی جہاں گاؤں والے تلاش کر چکے تھے۔ پھر پولیس نے ورثاء سے ہی انکوائری شروع کر دی کہ کس سے دوستی، کس سے دشمنی ہے۔ صبح تھانے بلاتے، شام تک بٹھائے رکھتے۔ 17 جنوری 2018ء کو گھر سے ایک کلومیٹر کے فاصلے پر جنگل سے بچی کی لاش ملی، کٹھوعہ کے ضلعی ہسپتال میں اسی روز طبی معائنہ ہوا۔

پوسٹ مارٹم رپورٹ کے مطابق بچی کو نشہ آور دوا دے کر جنسی زیادتی اور پھر قتل کیا گیا۔ فورنزک شواہد بھی سامنے آئے کہ بچی کو ایک ملزم کے زیرِ نگرانی مندر میں کئی روز رکھا گیا۔ مندر کے تہہ خانے سے ملنے والے بال آصفہ کے ہی ثابت ہوئے۔ جب کہ آصفہ بانو کو کئی مرتبہ کئی مختلف مردوں نے جنسی زیادتی کا نشانہ بھی بنایا اور پھر اس کا گلا گھونٹ کر اسے ہلاک کیا گیا۔ ظالموں کو اس پر بھی اطمینان نہیں ہوا تو سر کو بھاری پتھر سے کچل کر نعش پھینک دی۔ عوامی مطالبے پر 22 جنوری 2018ء کو یہ کیس کرائم برانچ کے حوالے کیا

گیا۔ انکوائری مکمل ہونے پر سات افراد کوملوث پایا گیا جن میں چار پولیس افسران بھی شامل تھے۔ یہ لوگ کشمیر کے خانہ بدوش بکروال قبیلے کواس علاقے سے نکالنا چاہتے تھے۔ ان کو اعتراض تھا کہ رسانہ کے نواح میں بکروال کیوں زمین خریدرہے ہیں جو برہمنوں کا گاؤں ہے۔۔۔آصفہ کا جنازہ جب بکروال قبیلے کے آبائی قبرستان پہنچا جو گاؤں کے قریب ہی تھا تو ہندوانتہاپسندوں نے گھیر لیااور تدفین سے روک دیا گیا۔ ورثاء جنازہ سات میل دورایک اورگاؤں میں دفن کرنے لے گئے۔

آصفہ قتل کیس پر پھر سیاست شروع ہوگئی۔ جموں اور کشمیر کی وزیرِاعلیٰ محبوبہ مفتی، بچوں اور خواتین کی بہبود کی انڈین وزیر مانیکا گاندھی، بھارتی وزیرِاعظم نریندر مودی اور سپریم کورٹ نے انصاف کی یقین دہانی اور اقوامِ متحدہ کے سیکریٹری جنرل انتونیو گوتریس نے ذمہ داران کو انجام تک پہنچانے کا مطالبہ کیا۔ بھارت کی سول سوسائٹی بہت سی مشہور شخصیات اورنمایاں سیاست دانوں نے بھی اس واقعے پرغم وغصے کا اظہار کیا۔ موم بتی مارچ میں راہول گاندھی، سونیا گاندھی، غلام نبی آزاداور پریانکا گاندھی نے بھی شرکت کی۔ پاکستان نواز قائدین نے اس پر ہندومسلم نفرت کو ہوا دینے کی کوشش کی حالاں کہ پینتھر پارٹی کے بھیم سنگھ اور کئی دیگر ہندوآصفہ کے خاندان کے ساتھ کھڑے تھے۔ یہ صرف بھارتیہ جنتا پارٹی کا کارنامہ تھا، جو پوری ہندوکمیونٹی کی نمائندہ نہیں۔۔ بھارتیہ جنتا پارٹی ملزمان کی گرفتار نہیں چاہتی تھی، اسی لیے گرفتاریوں کو سیاسی دباؤ کا نتیجہ قرار دیا اور کہا کہ یہ جرم پاکستان سے آئے ہوئے لوگوں نے کیا۔ بھاجپا نے ہندوا یکتا منچ (ہندومتحد تحریک) بنائی جوملزمان کے حق میں کھڑی ہوگئی کہ وہ بے گناہ ہیں۔۔ملزمان کی گرفتاری کے خلاف مظاہرے شروع ہوئے جن میں بھارتیہ جنتا پارٹی کے محکمہ جنگلات کے وزیر لال سنگھ چودھری اور وزیرِ صنعت چندر پرکاش نے بھی شرکت کی۔ کرائم برانچ نے کٹھوعہ جوڈیشل

مجسٹریٹ کے دفتر میں چارج شیٹ جمع کرانے کی کوشش کی تو ہندوا یکتا منچ کے وکلا نے احتجاج کرتے ہوئے اسے روک دیا۔۔

گو کہ آصفہ بانو کے خاندان کے ساتھ ساری دنیا کہ ہمدردیاں تھیں لیکن اس سے کیا حاصل۔ ماں اور باپ کو بچی کی المناک موت کا بہت بڑا صدمہ تھا۔ موت بھی اغوا، ٹارچر اور زیادتی کے ساتھ۔ ساری تعزیت اور ہمدردیاں اپنی جگہ لیکن ماں باپ اپنی زندگی کے ہر لمحے میں، بار باران تفصیلات کو اپنے ذہن میں دہرا کرتڑپتے ہیں۔

آصفہ کے والد محمد یوسف کہتے ہیں کہ جب ہماری بچی کے ساتھ اتنا ہوگیا تو ہمیں بھی ماردیں! اس میں کیا ہے!! ہماری بچی کو سات دن کس طرح رکھا۔ کس بے رحمی سے قتل کیا گیا۔ اب ہم کو کیا خطرہ ہے۔ اتنی خوبصورت تھی وہ، اس کی باتوں سے ایسا لگتا تھا کہ کچھ بنے گی۔۔ وہ بات کہنے میں کئی بار رکتے ہیں۔ اپنے آنسوؤں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ بھی بتاتے ہیں کہ ان کا ذہن بالکل سن ہوگیا ہے'' کوئی بات یاد نہیں رہتی۔ ڈاکٹر نے بہت سی دوائیں دی ہیں تو اب بولنے کے قابل ہوا ہوں''۔ ان کی پیاری بیٹی کی ایک تصویر ہرخبر کے ساتھ لگائی جاتی ہے جو جامنی پھولدار کپڑوں میں ہے۔ یہ کپڑے تو ایک دن پہلے ہی اس کے لیے لائے تھے۔

ماں تعزیت کرنے والوں سے صرف ایک ہی مشورہ کرتی ہے کہ میں آصفہ کی گڑیا کہاں سنبھال کے رکھوں۔۔ جاتے ہوئے کہہ گئی ہے کہ ماں جب تک میں واپس آتی میری گڑیا سنبھال کر رکھنا۔ اسے اس گڑیا میں آصفہ ہی نظر آتی ہے۔ یوں لگتا ہے کہ یہ پوچھنے والی ہے کہ میٹھے چاول کہاں رکھے ہیں۔ وہ اس گڑیا کو الماری میں رکھتی ہے تو اسے خوف آتا ہے کہ آصفہ کا دم گھٹ جائے گا پھر باہر نکال کر ٹیبل پر سجاتی ہے تو اسے ڈر لگتا ہے کہ بچوں نے گم کر دی تو آصفہ آ کر روئے گی۔ وہ اسے طاق میں رکھتی ہے تو خطرہ ہے کہ مٹی میں

خراب ہو جائے گی، آصفہ نے تو کبھی مٹی گوندھتے بھی کپڑوں پر داغ نہیں لگنے دیا۔ آصفہ کو تو اللہ نے سنبھال لیا، آصفہ کی گڑیا سنبھالنا ماں کے لیے مسئلہ ہے جو اس کو نہ چھپا سکتی ہے نہ عیاں کر سکتی ہے۔ چشمے پر پانی لینے جاتی ہے تو گڑیا ساتھ ہوتی ہے۔ چولہے پر کھانا پکاتی ہے تو آصفہ کی گڑیا کو سامنے رکھتی ہے، اسے تو اب بھی یقین ہے کہ میری آصفہ زندہ ہے بس آئے گی تو گڑیا مانگے گی۔۔

ملزمان پر مقدمہ تو ثابت ہو گیا کہ آصفہ بانو کے قتل میں یہ لوگ ملوث ہیں جس کی سزا موت تھی لیکن بھارتیہ جنتا پارٹی نہیں چاہتی تھی کہ ایک مسلمان خانہ بدوش بکروال قبیلے کی بچی کی خاطر چھ ہندوؤں کو سزا موت ہو۔ پارٹی نے ہندوستان بھر میں تحریک چلائی اور عوامی حمایت حاصل کی۔ عدالت نے فیصلہ کیا کہ گو کہ ملزمان پر جرم ثابت ہوا ہے جس کی سزا موت ہے تاہم اجتماعی ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے مجرموں کو 8 سال قید کی سزا دی جاتی ہے۔۔۔ اجتماعی ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے بھارتی عدالت کی یہ پہلی سزا نہیں، اس سے پہلے بھی ایک کشمیری افضل گرو پر مقدمہ ثابت نہ ہونے کے باوجود اجتماعی ضمیر کو مطمئن کرنے کے لیے اسے سزائے موت دی گئی تھی۔

☆......☆

زجاجہ شیخ کو شناخت کی تلاش

جموں و کشمیر کی ہونہار و ذہین بیٹی زجاجہ شیخ جاپان یونیورسٹی آف "رِتسومیکان ایشین پیسفک" اوئیتا، بپو، میں زیر تعلیم اور یونیورسٹی اسٹوڈنٹس یونین کی منتخب صدر ہیں، زجاجہ نے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیرس سے سوال کیا ہے کہ "میں کون ہوں؟ کیا میں بھارتی ہوں؟ پاکستانی ہوں؟ یا کشمیری؟" زجاجہ جاپان کی اس نامور یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہزاروں نوجوانوں کی منتخب لیڈر ہونے کے باوجود اپنی شناخت کی تلاش میں ہے۔ وہ شعور اور قیادت کی ان بلندیوں پر پہنچ کر بھی محسوس کرتی ہے کہ اس کی ہزاروں سال پرانی تاریخ مسخ اور شناخت گم ہو گئی۔ اس کھوئی ہوئی شناخت کی تلاش میں ہی اس نے جاپان سے نیویارک میں بڑے ایوان کے دروازے پر دستک دی ہے جہاں سے عالمی حکمرانوں نے 77 سال پہلے اس کی شناخت کے تحفظ کی ضمانت دی تھی۔ اب وہ ایک نئے اور ترقی یافتہ ملک میں آئی ہے، تعلیم یافتہ نوجوانوں کی قائد ہے، لیکن لوگ اسے نہیں جانتے کہ وہ کون ہے اور کہاں سے ہے۔ اسے اس بات کی بھی تشویش ہے کہ اس کی یونیورسٹی میں زیر تعلیم اس کے ہم وطنوں میں سے کوئی بھارتی ہے، کوئی پاکستانی اور کوئی کشمیری کہلاتا ہے۔

اس صورت حال میں ایک سمجھدار ذی شعور اور تعلیم یافتہ وحساس دل زجاجہ شیخ کے لیے یہ فیصلہ کرنا کہ وہ کون ہے دشوار ہی نہیں مشکل بھی ہے۔ زجاجہ شیخ ذہین بھی ہے قائدانہ صلاحیتوں سے مالا مال بھی، اس نے میٹرک پاس کرتے ہی جاپان ملٹی نیشنل پروگرام کے تحت اس خطے کی نمائندگی کی اور تقریباً 6 ماہ جاپان کے مختلف شہروں میں اپنی علاقائی ثقافت اور معاشرتی زندگی کو اجاگر کیا۔ وہ اسلام آباد میں رہائش پذیر آل پارٹیز حریت

کانفرنس جموں وکشمیر کے رکن شیخ ماجد کی صاحبزادی اور ماہر کشمیریات وسینئر صحافی راجہ فیاض کی بھانجی ہیں۔ زجاجہ کی نانی کا تعلق جموں وکشمیر کے شہر راولاکوٹ سے ہے، جب کہ اس کی ماں اعلیٰ تعلیم یافتہ اور اسلام آباد کی ایک یونیورسٹی میں پروفیسر ہیں۔ زجاجہ شیخ ایف ایس سی سال دوم کے نتیجے سے قبل ہی، جب وہ ابھی ٹین ایجر تھی 2022ء میں ایشین پیسفک یونیورسٹی اوئیٹا، جاپان میں اسکالرشپ پر داخلہ حاصل کر چکی تھی۔ اس وقت وہ یونیورسٹی میں بی ایس اکنامکس کے تیسرے سال کی طالبہ اور یونیورسٹی کی اسٹوڈنٹس یونین کی صدر ہیں۔ زجاجہ کئی مرتبہ ٹوکیو یونیورسٹی میں اپنی یونیورسٹی کی نمائندگی کر چکی ہیں۔ اسی سال جون میں زجاجہ نے ہیروشیما نا اور گاساکی کا دورہ کیا جہاں اس نے امن کا جھنڈا لہرایا۔ زجاجہ شیخ کو ان نوجوانوں کی فہرست میں شامل کیا جا چکا ہے جنہیں مستقبل میں دنیا کی قیادت کرنی ہے لیکن وہ اپنی اس نمایاں پوزیشن کو جانتے ہوئے بھی یہ سمجھتی ہے کہ اتنا کچھ کرنے کے باوجود اسے شناخت پھر بھی نہ مل سکی کہ وہ کس ملک میں اور کس قوم کی قیادت کرے گی؟ اس کا ملک تقسیم در تقسیم اور قوم غلام در غلام ہے؟

جموں وکشمیر کی اس نوجوان رہنما کی جانب سے اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیرس کو لکھے گئے خط نے شیخ عبداللہ، چوہدری غلام عباس اور علی گیلانی کے سیاسی نظریات کو بھی چیلنج کیا ہے جو 77 سال سے جموں وکشمیر کے دو کروڑ سے زائد کشمیریوں کی شناخت کو ختم کر کے نئی شناخت کے حصول کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔ جموں وکشمیر کے نوجوان خواہ وہ کسی بھی خطے سے ہوں اپنے بزرگوں کے کئے پر پشیماں ہیں جنھوں نے تھوڑے سے ذاتی فائدے کے لیے کشمیری شناخت کو ختم کر دیا۔ زجاجہ شیخ جموں وکشمیر کی نئی نسل کی نمائندہ رہنما ہے جو کم عمری میں ہی عالمی رہنماؤں سے تبادلہ خیال کرتی ہے اور تب اسے یہ احساس ہوتا ہے کہ وہ کون ہے؟ کہاں سے ہے؟ 8 نومبر 2024ء کو زجاجہ شیخ نے

اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوتیرس کو نوجوان قائد کے طور پر جو خط لکھ تحریر کیا اس کا ترجمہ قارئین کی نذر ہے۔

جناب انتونیو گوتریس،
سیکریٹری جنرل اقوام متحدہ،
اقوام متحدہ ہیڈکوارٹر، نیویارک، امریکہ
موضوع: میں کون ہوں؟

محترم جناب سیکریٹری جنرل، میں بحیثیت کشمیری، لاکھوں کشمیریوں کی اجتماعی آواز کے ساتھ جو دہائیوں سے انصاف اور امن کے منتظر ہیں آپ کو خط لکھ رہی ہوں، میرا وطن "جموں وکشمیر" جو ارضِ خداوندی پر جنت کے طور پر پہچانا جاتا تھا، بدقسمتی سے مسلسل تکلیف اور مایوسی کی آماجگاہ بن چکا ہے۔ ہم کشمیریوں کی شناخت مسلط شدہ اصطلاحات کے تحت دھندلا دی گئی ہے، کوئی "پاکستانی زیر انتظام کشمیر"، کوئی "بھارتی زیر انتظام کشمیر"، کوئی پاکستان کے زیر قبضہ کشمیر"، کوئی بھارت کے زیر قبضہ کشمیر"، کوئی آزاد کشمیر"، کوئی مقبوضہ کشمیر، کوئی اٹوٹ انگ" اور کوئی "شہ رگ" کی راگ الاپتا ہے۔ یہ الفاظ جغرافیائی، سیاسی حریفین کی عکاسی تو ضرور کرتے ہیں لیکن انسانیت اور کشمیریوں کی اصل حقیقت کو بیان کرنے سے قاصر ہیں۔ میرا وطن ارضِ کشمیر خون میں نہایا ہوا ہے اور میرے ہم وطن ظلم و جبر اور محرومی کے نہ ختم ہونے والے سلسلے میں جکڑے ہوئے ہیں۔

تقریباً 80 سال سے کشمیری بیگانگی اور مصائب کا شکار ہیں جب کہ دنیا خاموش تماشائی بنی ہوئی ہے۔۔۔۔اس دائمی المیے کا ذمہ دار کون ہے؟ کیا یہ تقسیم کے معمار ہیں جنہوں نے اس تنازعہ کے بیج بوئے؟ کیا یہ اقوام متحدہ ہے، جو کشمیریوں کو ان کے حق خود ارادیت کی ضمانت دینے والی قراردادوں کو نافذ کرنے میں ناکام رہی؟ یا یہ بھارت اور

پاکستان کے منصوبے ہیں جنہوں نے ہم کشمیریوں کو اپنی اسٹریٹجک رقابتوں کے مہرے بنادیا؟ اقوام متحدہ کا ادارہ انسانی حقوق کے تحفظ اور انصاف کی فراہمی کے لئے قائم کیا گیا تھا لیکن کشمیری عوام سے کئے گئے وعدے اب تک ادھورے ہیں اور اس کی قراردادیں فائلوں میں دفن ہوچکی ہیں۔اس بے عملی نے کشمیریوں کو بے یارومددگار چھوڑ دیا ہے ہماری شناخت کو مٹانے کی کوششیں ہورہی ہیں۔ہم نہ بھارتی ہیں نہ پاکستانی بلکہ دربدر اور بے وطنی کی حالت میں گرفتار، دھوکہ دیئے گئے کشمیری ہیں۔

جناب سیکریٹری جنرل، میں عاجزی کے ساتھ آپ سے سوال کرتی ہوں کہ میں کون ہوں؟ کیا میں بھارتی ہوں، پاکستانی ہوں، یا کشمیری؟ میرے ہم وطنوں کے دہائیوں پر محیط دکھوں کا ذمہ دار کون ہوگا؟ لاکھوں کشمیریوں کو موت کی سولی پر چڑھانے والے کون ہیں؟ ہمیں مسلسل نظر انداز کئے جانے اور ظلم وستم ڈھانے کا حساب کون دے گا؟ میرے وطن میں انصاف اور امن کون لائے گا؟۔ایک کشمیری کے طور پر، میں اقوام متحدہ سے درخواست کرتی ہوں کہ وہ اپنی اخلاقی اور قانونی ذمہ داریوں کو پورا کرے۔اقوام متحدہ کے لئے کشمیر پر اپنی قراردادوں پر فوری عملدرآمد نہ صرف ضروری ہے بلکہ ایک اخلاقی فرض بھی ہے۔میرے ہم وطنوں پر روزانہ ہونے والے تشدد اور ظلم کو ختم کریں۔تسلیم کریں کہ حق خودارادیت کوئی رعایت نہیں بلکہ ایک بنیادی انسانی حق ہے جو ہم کشمیریوں کو دنیا کے کسی بھی دوسرے انسان کی طرح حاصل ہونا چاہیے۔دنیا دیکھ رہی ہے اور تاریخ اقوام متحدہ کی کارکردگی کا فیصلہ اس کے عمل یا خاموشی سے کرے گی۔وقت آ گیا ہے کہ کشمیریوں سے کئے گئے وعدوں کو پورا کیا جائے اور ان اصولوں پر اعتماد بحال کریں جن پر یہ تنظیم "اقوامِ متحدہ" قائم کی گئی تھی۔

جناب، میں آپ سے دوبارہ سوال کرتی ہوں: "میں کون ہوں؟" مجھے کب تک

اپنی شناخت کی تلاش میں بھٹکنا پڑے گا؟ مجھے وہ واپس لوٹا دیں جو میرا حق ہے۔

امید اور عجلت کے ساتھ

زجاجہ شیخ

صدر یونین آف، رِتسومیکان ایشین پیسفک یونیورسٹی

اوئیتا، بیپو، جاپان۔

واضح رہے کہ آزاد جموں وکشمیر کے شہریوں اور پاکستان میں مقیم مہاجرین جموں و کشمیر کے پاسپورٹ اور شناختی کارڈ کے قومیت کے خانے میں سرخ سیاہی سے "باشندہ آزاد ریاست جموں وکشمیر" لکھا جاتا تھا جواب ختم کر دیا گیا ہے۔اس پر سیاسی فرنچائزنے کیا بات کرنی ہے قوم پرست بھی خاموش ہیں۔

☆......☆

کشمیریوں کی ناقص حکمت عملی

زیر مطالعہ کتاب میں مقبوضہ جموں وکشمیر کی جو صورت حال بیان کی گئی ہے اس میں زیادہ تر دو گاؤں کی کہانی ہے، وہ بھی اصل کا 20 فیصد بھی بیان نہیں ہو سکا، بھارتی حکومت نے مقبوضہ جموں وکشمیر میں لیفٹیننٹ گورنر سمیت تمام اعلیٰ اور درمیانی عہدوں تک غیر مقامی افراد کو تعینات کر رکھا ہے جن کو کشمیریوں سے کوئی ہمدردی نہیں بلکہ یہ کشمیریوں سے شدید نفرت کرتے ہیں۔ جموں وکشمیر میں تعینات بھارتی فوج کے کارناموں کی ایک جھلک تو اس کتاب میں موجود ہے جو دو گاؤں کی کہانی ہے لیکن اس سے ملتی جلتی ہر گاؤں میں کہانیاں موجود ہیں کہ بھارتی فوج کے ہاتھوں کشمیریوں کی عزت، جان و مال کس طرح پامال ہو رہا ہے، تاہم سول انتظامیہ بھی کسی طرح فوج سے پیچھے نہیں بلکہ ایک قدم آگے یا ہم قدم ہے، اگر کوئی افسر، ڈپٹی کمشنر کپواڑہ کی طرح غیر جانبدار یا سچ کا ساتھ دینے کی کوشش بھی کرتا ہے تو اس کو جان سے مار دیا جاتا ہے یا سخت ترین سزا اور اذیت سے گزرنا پڑتا ہے لہٰذا کوئی بھی فوج اور سول انتظامیہ کی مرضی کے بغیر کچھ نہیں کر سکتا۔

سول انتظامیہ جو 90 فیصد غیر مسلم اور غیر مقامی ہے وہ مودی کے ہندو دھرم کی بحالی یا مہا بھارت کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے اور اس کے راستے میں جو رکاوٹ ہے اس کو طاقت کے زور پر ہٹا دیا جاتا ہے۔ جموں وکشمیر کے عوام نے لگ بھگ 78 برس اور خاص طور پر 33 برس تک سخت محنت اور لازوال قربانیاں دے کر تحریک کو زندہ رکھا لیکن بین الاقوامی حمایت نہ ہونے کے باعث وہ 12 لاکھ سے زائد فوج اور ریاستی طاقت کے سامنے تن تنہا کھڑے نہ ہو سکے اور بالآخر مودی حکومت نے 5 اگست 2019 کو مقبوضہ کشمیر پر

قبضہ کر لیا۔

وہ کشمیری جو سری نگر کے لال چوک کے بلند مینار پر پاکستان کا جھنڈا لہراتے تھے، وہ کشمیری جو شہید ہونے کی صورت میں پاکستان کے جھنڈے میں دفن ہوتے تھے، وہ کشمیر جہاں یوم آزادی کے موقع پر سنگینوں کے سائے میں بھارت کا جھنڈا لہرایا جاتا تھا اور دوسری جانب کھلے عام پاکستانی جھنڈے کی پرچم کشائی ہوتی تھی، وہ کشمیری جو بازاروں اور چوراہوں میں نعرے لگاتے تھے ''ہم ہیں پاکستانی، پاکستان ہمارا ہے''، آج پاکستان کا نام سنتے ہیں نہ بولتے ہیں۔ نہ زبان کھولتے ہیں۔ نعیمہ احمد مجہور لکھتی ہیں کہ پاکستان کا نام لیا جائے تو کشمیری منہ دوسری جانب گھما لیتے ہیں لیکن آج بھی سری نگر ہو یا مظفر آباد جتنی بھی جعلی اور کاغذی تنظیمیں ہیں، روز پریس ریلیز جاری کرتی ہیں ''کشمیر بنے گا پاکستان''، کوئی بھی فرد یہ نہیں سوچتا کہ اس ساری مشق کا کیا حاصل؟ ہم بھی سچ کا ساتھ دے کہ اس کا اظہار کریں کہ ہماری کم عقلی، مفاد پرستی اور ناقص حکمت عملی کی وجہ سے ان ساری قربانیوں کے باوجود بھارت کشمیر پر زبردستی قابض ہو گیا اور اب تو اس نے ان پارٹیوں اور نظریات کو بھی کشمیر سے نکال دیا جو بھارت کے زیر انتظام داخلی اختیارات کی بات کرتے تھے۔

کیا کشمیر کی موجودہ صورت حال کو تسلیم کر کے ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کے نعرے تک محدود رہا جائے اور اس کے لیے عملی جدوجہد نہ کی جائے یا پھر بھارت کے اس غیر قانونی اقدام کا جواب دیا جائے؟ اگر جواب دیا جائے تو یہ جو جواب حریت کانفرنس اور آزاد کشمیر میں پاکستانی سیاسی فرنچائز کو لکھ کر دیا گیا ہے یہ کافی ہے، اس سے مسئلہ حل ہو جائے گا، اگر یہ بیانیہ درست ہوتا تو 77 برسوں میں دنیا نے پاکستان کے بیانیے کو تسلیم کیوں نہیں کیا؟ حتیٰ کہ اقوام متحدہ کے سیکرٹری جنرل انتونیو گوترس نے بھی اسے مسترد کر دیا اور واضح طور پر کہا کہ ''دونوں فریق تیار ہوتے ہیں تو ہم ثالثی کے لیے تیار ہیں''، گویا بات یہاں تک پہنچی کہ

اس مسئلے کے حل کے لیے ہندوستان کا تیار ہونا ضروری ہے۔ بصورت دیگر جوں کا توں ہی رہے گا۔ ہندوستان نے قبضہ کرلیا وہ کیوں راضی ہوگا اور اس صورت حال میں یعنی مسٹر گوترس کے اس بیان کے بعد کشمیریوں کو دیکھنا ہوگا کہ وہ کہاں کھڑے ہیں، جب وہ فریق بھی نہیں رہے تو پھر ان کی کیا پوزیشن ہے۔

جموں و کشمیر کے عوام خاص طور پر نوجوانوں کی توجہ اور سمجھنے کی ضرورت ہے کہ وہ پاکستان کے عوام میں جائیں، سیاست دانوں، سول سوسائٹی، وکلاء اور صحافیوں کے ساتھ بیٹھیں اور ان کو قائل کریں کہ بھارت کو جموں و کشمیر سے نکالنے اور مقبوضہ کشمیر کے عوام کی جانب سے دی جانے والی قربانیوں کا ثمر سمیٹنے کے لیے ایک نیا بیانیہ بنایا جائے جو مسئلہ کشمیر کو دوملکوں کے سرحدی تنازع سے نکال کر ایک قوم کی آزادی کے مسئلے تک لے آئے۔ جب کہ حقیقت میں مسئلہ بھی یہی ہے تاہم ہماری ناقص حکمت عملی، خودغرضی اور خودغرض سیاست دانوں کے بے وقت راگ الاپنے سے ایک قوم کی آزادی کا مسئلہ دوملکوں کے سرحدی تنازعے کی شکل اختیار کر گیا اور دنیا قومی آزادی کی تحریکوں کو کسی اور نظر سے اور دو پڑوسیوں کے تنازعات کو کسی اور نظر سے دیکھتی ہے۔

بدقسمتی سے کشمیری اس طرف توجہ ہی نہیں دے رہے کہ وہ اپنی تحریک کو کسی ملک کی سرحد کی توسیع کے بجائے آزادی کا نام دیں اور جب تک بین الاقوامی سطح پر اس کو تحریک آزادی نہیں تسلیم کرایا جائے گا مسئلہ کشمیر یوں ہی رہے گا اور اجتماعی آبروریزی، قتل و غارت کے ساتھ کشمیری محکوم و غلام ہی رہیں گے۔ اس کتاب میں دختران کشمیر کے مصائب، ان کی ہمت، استقامت اور ان مشکلات میں ان کی جانب سے کی جانے والی مزاحمت کو عیاں کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ لیکن یہ دعویٰ نہیں کہ اس نوعیت کے سارے مسائل و واقعات اس کتاب میں موجود ہیں، ایسا ممکن بھی نہیں ہوسکتا کہ مقبوضہ کشمیر جو دنیا کی سب سے بڑی

جیل قرار دی جاچکی ہے وہاں سے پوری معلومات حاصل کی جاسکے، تاہم 1989ء سے اب تک جاری تحریک کے ساتھ تعلق اور مطالعہ کے دوران جو بھی معلومات حاصل ہوئی اس کو اس میں شامل کرنے کی کوشش کی گئی، جو زیادہ تر انگریزی مواد سے اردو ترجمہ اور آسان زبان میں تحریر کیا گیا ہے تاکہ پاکستان اور آزاد کشمیر کے حکمرانوں عوام تک پہنچایا جاسکے جن میں اکثریت اس سے نابلد ہے قارئین اس پر کیا سوچتے ہیں اس کا معلوم نہیں لیکن قلبی اطمینان ہے کہ جو کسی دوسرے نے نہیں کیا بلکہ کوئی نہیں کر رہا وہ ہم نے کیا اس میں نیک نیتی شامل ہے اس لیے کسی غلطی کی اللہ تعالیٰ کے ہاں بھی معافی کی گنجائش ہے اور قارئین بھی معاف کریں گے اس کتاب کی پی ڈی ایف بک آن لائن قارئین کے لئے عام کی جائے گی جس بھی ساتھی تک کتاب نہ پہنچ پائے وہ پی ڈی ایف منگوا سکتا ہے یا ہماری ویب سائٹ bashirsaddozai.com پر ڈاؤن لوڈ کر کے پڑھ سکتا ہے۔

آپ کی توجہ کا شکریہ

بشیر سدوزئی

23/فروری 2025ء

کراچی

☆......☆

کنن پوش پورہ

(دختران کشمیر کے مصائب

ہمت، استقامت و مزاحمت)

بشیر سدوزئی

مصنف کی دیگر تصانیف

☆ کوہ قاف کی چوٹیاں

(سفرنامہ آذربائیجان)

☆ بلدیہ کراچی۔ سال بہ سال

(1844 تا 1979)

☆ برہان وانی شہید

☆ زلزلے سے پہلے اور بعد

☆ پونچھ۔ جہاں سروں کی فصل کٹی

☆ کشمیر کے مجاہد

☆ تقدیر کشمیر (مضامین)

فرید پبلیکیشنز، اردو بازار کراچی